ادب آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان

سہ ماہی

تناظر

دہلی

جلد ۵ - ۶
اکتوبر ۱۹۸۳ء تا مارچ ۱۹۸۴ء

قیمت : ۳۰ (تیس) روپے
سالانہ چار شمارے : ۵۰ (پچاس) روپے

مدیر ناشر اور طابع

بلراج ورما

نگراں حصہ نظم :- کرشن موہن

کتابت : لقاء الرحمٰن - محمد عمر خاں - محمد صلاح الدین قاسمی - شیخ منیر الدین

طباعت :- نودیپ آفسیٹ پرنٹرز - دہلی

تناظر پبلی کیشنز - ۱۴۲ ڈی میور وہار - پاکٹ ۳ - دہلی ۱۱۰۰۹۱

ہمارے اغراض و مقاصد

"میں نہیں چاہتا کہ میرا گھر ایسا فصیل بند قلعہ ہو جس کی کھڑکیاں ہر طرف سے مقفل کر دی گئی ہوں۔ میرا گھر ہر ملک و قوم کے تہذیبی دھاروں کے لیے نہایت آزادانہ طور پر کشادہ ہے۔ مگر میں یہ بھی کبھی نہیں چاہوں گا کہ کسی ایک دھارے کے تند و تیز بہاؤ سے میرے اپنے پاؤں ہی اکھڑ جائیں"

گاندھی جی کا یہ قول ہمارا رہبر ہے۔ ہم کسی بھی مخصوص طریقِ زندگی یا آئیڈیالوجی کے حق میں نہیں، مگر ہر اس آئیڈیا کے پرستار ضرور ہیں جو زندگی کو صحت، استقلال اور حسن کی تحریک دیتا ہے۔

ہندوستانی ثقافت و تہذیب کا تحفظ اور ارتقاء، قومی اور بین الاقوامی یک جہتی کی پاسداری، صالح علمی اقدار کی دریافت و بازیافت، جمہوریت، سیکولرزم اور انسان دوستی کا فروغ، ادب اور تنقید کی صحیح سمت اور رفتار کا تعین، نئی نسل کی ذہنی و حسی تہذیب و تشکیل اور فن کی بنیادی اقدار کی تلاش اور ان کی ترویج و اشاعت۔ یہی ہمارے اغراض و مقاصد ہیں۔

تناظر کوئی تجارتی ادارہ نہیں، ایک تحریک ہے۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تجربات کا دار العمل جس کا مقصد ایسے تعمیری ادب کی بنیادیں تیار کرنا ہے جو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی قدروں کا احاطہ کریں۔

اشاعتی پروگرام:- تناظر کا یہ شمارہ دو (یعنی پانچویں اور چھٹے) شماروں کو یکجا کر کے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان چھ شماروں کے علاوہ ہم نے اب تک تین کتابیں (شعاعِ جاوید، الیوژن اور کابوس) بھی شائع کی ہیں۔ تین خصوصی شمارے جو کالی داس گپتا رضا، امرتا پریتم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیات اور فکر و فن سے متعلق ہیں زیر ترتیب ہیں۔ ہم یک موضوع شماروں کا ایک باقاعدہ پانچ سالہ پلان تیار کر رہے ہیں اور جلد ہی ان شماروں کے عنوانات کا اعلان کریں گے۔

اس کے علاوہ ہم "بہترین افسانے" کے عنوان سے تناظر کا افسانہ نمبر بھی چھاپنا چاہتے ہیں مگر ظاہر ہے یہ تب ہی ممکن ہو سکے گا جب ہمارے افسانہ نویس بلا جھجک اپنی چہیتی اولاد کا نام لینے کو تیار ہوں گے جو خاصا مشکل کام ہے۔ بہت کم لوگ اپنی تخلیقات کا چناؤ کر سکتے ہیں اور پھر ایک افسانہ کا چننا تو اور بھی مشکل کام ہے۔

بلراج ورما

مُندرجات

کوششِ بیہم	(اداریہ)	بلراج ورما	۵
تخلیق و تنقید کا عصری منظرنامہ	(نوٹ)	بلراج ورما	۱۰
کوئے ملامت کا سیّاح	(مقالہ)	ڈاکٹر گیان چند	۱۴

افسانے

مہاجر	جوگندر پال	۳۵
صفر نیہ	مسعود منوّر	۴۶
تتلی	شرون کمار ورما	۷۰
مثلّث	بلراج ورما	۸۱
ہائی پو کونڈریاسس	بلراج ورما	۹۵
مہک	بلراج ورما	۱۰۷
بلا عنوان	بلراج ورما	۱۱۷
رام اور سیتا	بلراج ورما	۱۳۰

دیگر زبانوں کے افسانے

اپنے اپنے گھاؤ	(پنجابی)	امرتا پریتم	۱۴۷
یہ کہانی نہیں	(پنجابی)	امرتا پریتم	۱۵۳
دشمن کا نشان	(انگریزی)	خوشونت سنگھ	۱۶۳
بات کچھ اور بڑھے گی آگے	(ہندی)	چترا مدگل	۱۷۰

فنونِ لطیفہ

موسیقی میں گھرانے داری اور خیال | عمیق حنفی | ۱۸۶

جائزے، خاکے، انشائیے

نئی غزل اور حسن نعیم | بانی مرحوم | ۱۹۲
فائزا (فائزہ) | عوض سعید | ۱۹۷
کوڈان | نریندر لوتھر | ۲۰۲

شاعری

از ۲۱۲ تا ۲۴۵

فراق ۔ مجاز ۔ کالی داس گپتا رضا۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۔ کرشن موہن راز ۔ بانی (مرحوم)۔ ساجدہ زیدی۔ مخمور سعیدی۔ ایم قمرالدین۔ مصحف اقبال توصیفی۔ مسعود منور ۔ عرش صہبائی۔ مصور سبزواری۔ علیم صبا نویدی۔ کنور سین ۔ رام پرکاش راہی۔ اقبال عمر۔ سلطان اختر۔ سلیم شیرازی اور مکتی

شہرِ سدوم ۔(طویل نظم) سلیم شہزاد ۲۴۶

سرحد پار سے

نامہ بر (کہانی) | خالدہ حسین (اصغر) | ۲۷۰

شاعری

از ۲۷۵ تا ۲۷۸

فیض احمد فیض ۔ ن م راشد ۔ ابن انشا۔ معین احسن جذبی۔ احسان دانش۔ سیف الدین سیف عدم۔ ظہیر کاشمیری۔

آخری ڈاک

۱۔ محسن زیدی۔ (دو غزلیں) ۲۔ فاروق شفق (دو غزلیں) ۲۷۹

بلراج ورما

کوششِ پیہم

تناظر کو اردو کے دوسرے جریدوں کے مقابلے میں برتر یا سرفہرست لانا لیجانا نہ ہماری تمنا ہے نہ شوق - ہمارے خوابوں کی منزل اور ہماری تمام تر تجاویز، منصوبوں اور کوششوں کا مقصد اس جریدے کو اردو زبان وادب اور اردو تہذیب کا ایک ایسا آئینہ بنانا ہے جس میں ہمارے عصری ادب کی شبیہ کو ادب کی ہر بار کھا آنکھ دیکھ سکے - ہم جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں، مگر ہمیں یقین ہے (اور یقین بڑی چیز ہوتی ہے) کہ ہماری یہ سعیِ مسلسل ہماری رہنمائی کرے گی اور ہمارا ہر نیا قدم ہمارے لیے وہ مواقع فراہم کرنے کا موجب ہوگا جو ہماری راہوں کو ہموار اور ہمارے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے -

ہم اپنے کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے - ہم نے خدمتِ اردو کے لیے ابھی تک صرف چار ہی قدم اٹھائے ہیں - یہ شمارہ ہمارا پانچواں قدم ہے - ہمارے یہ ابتدائی قدم غلط راہوں میں نہیں بھٹکے اس کا ہمیں علم ہے مگر یہ راہگذر طویل ہے، اور ابھی ہمیں بہت سے مراحل طے کرنے ہیں - ہم نے اپنے ہر شمارے کا معیار و ملبوس بھدی شکنوں سے مبرا، صاف ستھرا اور خوشنما رکھا ہے اور وعدہ کرتے ہیں کہ یہ جمالیاتی تازگی آئندہ بھی اسی طرح بنی رہے گی، تاکہ ایک نظر دیکھ کر ہی ہمارا قاری اسے اپنے ذاتی کتبخانہ کی زینت بنانے میں ذرا بھی نہ ہچکچائے بلکہ اپنے اہل ذوق احباب میں اس کا ذکر پورے فخر سے کر سکے -

رضا نمبر - ہم نے اپنے پچھلے یعنی چوتھے شمارے میں اعلان کیا تھا کہ ہمارے اگلے دو شمارے اردو کے ممتاز ادیب جناب کالی داس گپتا رضا کی شخصیت اور ان کے فکروفن کے لیے وقف ہوں گے - ہماری انتہائی

کوششوں کے باوجود یہ ممکن نہ ہو سکا۔ جس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ دراصل جس قسم کا ادبی تعاون ہمیں اپنے کرم فرماؤں سے ملا ہے اور جس قسم کے وعدے ہمیں موصول ہوئے ہیں، ان کے پیش نظر ہمیں مجبوراً یہ طے کرنا پڑا ہے کہ رضا نمبر کو دو شماروں میں شائع کیا جائے بصورت دیگر یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس خصوصی نمبر کی اشاعت میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کے لیے ہم اپنے کرم فرماؤں اور رضا بھائی کے شیدائیوں سے معافی کے خواستگار ہیں۔ ہم کوشاں ہیں کہ یہ نمبر جو ہر لحاظ سے اپنے موضوع پر ایک مستند دستاویز ہوگا۔ جلد سے جلد تیار ہو جائے۔ ہر قسم کی ٹیکنیکل مجبوری کے باوجود ہم جلد ہی اس نمبر کو مرتب کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس نمبر میں شرکت کے لیے ہم نے جن حضرات کو دعوت دی تھی انھوں نے مقالے بھجوا دئیے ہیں یا جلد بھجوانے کے وعدے کئے ہیں۔ ہمارے پاس اب تک جو اور جتنا مواد آیا ہے وہ ہر لحاظ اور ہر زاویۂ نگاہ سے مدلل، معیاری اور قابل قدر ہے، مگر ابھی کافی کچھ آنا باقی ہے۔ اس خصوصی نمبر کی افادیت کے پیش نظر ہر معقول اضافہ ہمارے لیے معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا ان مضامین کا انتظار جن کا وعدہ ہمیں اپنے کرم فرماؤں سے مل چکا ہے ہم پر لازم ہے۔

ایسے کاموں میں تاخیر کا عنصر لازمی ہوتا ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ ہمارے قاری اس صبر آزما انتظار میں ہمارے برابر کے شریک رہیں گے۔ ہم پر آشکار ہے کہ اردو زبان و ادب کے لیے رضا کی بے لوث اور قلندرانہ خدمات کا بھگتان کسی ایک نمبر سے خواہ وہ کتنا ہی ضخیم کیوں نہ ہو ممکن نہیں۔ کچھ نہ کچھ کمی تو ظاہر ہے کہ ہر صورت رہے گی ہی اسے حتی الوسع کم کرنے کی سعی البتہ ہم پر فرض ہے۔

یہ شمارہ ۔ اپنے ہر قاری کو ہم اپنا مربی اور سرپرست سمجھتے ہیں۔ تناظر دراصل انھیں کا پرچہ ہے۔ ہماری طویل غیر حاضری کی وجہ سے ہمارے بہت سے کرم فرماؤں سے ہمارے رابطوں میں جو دراڑیں آگئی ہیں ہم پورے خلوص سے انھیں بھرنے میں مصروف ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے ہم سفر جلد ہی ہمارے کارواں میں آملیں گے۔

تناظر کے پہلے دو شماروں میں سو سو سے زیادہ فنکار شامل تھے۔ تناظر کے تیسرے اور چوتھے شمارے میں بھی جو بہ اعتبار ضخامت نسبتاً مختصر تھے۔ ہمارے معاونین کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ اس شمارے میں شریک فنکاروں کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر مواد کے اعتبار سے یہ شمارہ ضرور لائق توجہ قرار پائیگا۔

فکر تونسوی نمبر ۔ وعدہ جو ایفا نہ ہوا۔

تناظر ۳ میں شامل برصغیر کے فنکاروں کے نام میرے کھلے خط کا حوالہ دیتے ہوئے تناظر کے کچھ ایک قارئین نے شکایت کی ہے کہ میں نے فکر تونسوی نمبر نکالنے کا جو پرشور اعلان کیا تھا اس

کی تکمیل ابھی تک نہیں ہوئی۔ ان کی شکایت جائز ہے۔ میں قصوروار تو ہوا، مگر پورے طور پر نہیں۔
بمبئی سے "فن اور شخصیت" نام کا ایک خاص معروف جریدہ صابردت صاحب کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اس جریدے کی مقبولیت کے پیشِ نظر ... صاحب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کا یہ خصوصی نمبر اگر دت صاحب نکالیں تو بہتر ہوگا۔ انھیں کی خواہش کے پیشِ نظر میں نے تمام کتابت شدہ مضامین صابردت صاحب کے حوالے کر دیئے تھے۔ اب یہ نمبر صابردت صاحب شائع کریں گے

صادقین ۔ تناظر کے چوتھے شمارے میں ہم نے مشہور عالم مصور صادقین کی ایک پرانی تخلیق "مائل بہ تنزل انسانِ فرسودہ" کا فلمی عکس چھاپا تھا۔ جس کے بارے میں تناظر کے چند قارئین نے شکوک ظاہر کیے ہیں۔ ان کا اعتراض ہے کہ اس تصویر میں صادقین کا جانا مانا رنگ نہیں جھلکتا ہمیں خود اعتراف ہے کہ ہم نے ادھر صادقین کی جس قسم کی تصاویر اور میورل دیکھے ہیں وہ اس تصویر سے قطعی مختلف ہیں۔ اس صدی کے چوتھے دہے کی یہ تخلیق ظاہر ہے کہ خاصی پرانی ہے ۔ ان دنوں صادقین کو نہ آج جیسی قدرت حاصل تھی نہ آج جیسی شہرت ۔ تیس چالیس کا وقفہ ایک یگ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ صادقین جیسے فنکار جس نے اپنے آرٹ کے موجودہ کمال تک پہنچنے کے لیے فن کے کتنے ہی پر پیچ مراحل طے کیے ہیں، اپنی تخلیقی زندگی میں ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح بھاگا ہے، اور اس دور میں سستانے کے لیے بھی کبھی کسی ایک منزل پر نہیں رکا۔ اس تصویر کی شناخت صادقین نے خود اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح کی ہے :-

"انسان فرسودہ مشینوں کا غلام ہے ۔ روایات دیرینہ اور تصوراتِ کہن پر عمل پیرا ہے ۔ اس کی بوسیدہ قبائے حیات چاک چاک ہے ۔ اس کے افکار مدقوق ہیں اور اس کے احساسات بیمار ۔ میں نے اسی شئے کو "مائل بہ تنزل انسان فرسودہ" میں دکھانے کی کوشش کی ہے ۔

پہیہ جو اس کے سر پر لاد اگیا ہے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ مشینوں کا محکوم ہے ۔ بغل میں وہ کتابیں جو سنبھل نہیں رہی ہیں اس کے روایاتِ دیرینہ پر عمل پیرا ہونے کی دلیلیں ہیں ۔ عصا تنزل اور نقاہت کی پہچان ہے ۔ اس کی پوشاک جگہ جگہ چاک اور پیوندوں سے بھری ہوئی ہے، جو اس کی زندگی کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ پھر اس مائل بہ تنزل انسان کے تحت ایک مائل بہ ترقی انسان ظاہر کیا گیا ہے، جو ابھی

نونہال ہے، اور طفلی سے ہی پرچمِ عمل جس سے قوت اور حیات وابستہ ہیں بلند کیے ہوئے ہے۔ یہ زمین کی تسخیر کر چکا ہے۔ اس کے قدموں کے نیچے پہیہ ہے جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مشینیں اس کی غلام ہیں۔ اس کی بانہوں میں اٹکا ہوا کپڑا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا لباس ابھی تک تراشا نہیں گیا، بلکہ تراشا جائے گا۔"

ہمارا کلچر۔ آدمی کا رہن سہن۔ پوشاک۔ کھانا پینا۔ سوچنے سمجھنے اور کہنے کے آداب یعنی طرزِ زندگی اور طرزِ گفتگو ہر دور میں بدلے ہیں مگر انسان اس ادل بدل سے کبھی نہیں گھبرایا کیوں کہ وہ کوئی جامد مخلوق نہیں کائنات کی سب سے تیز گام، باشعور اور ترقی پسند مخلوق ہے۔ اپنے آبا، اور ماضی کا پرخلوص احترام کرتے ہوئے بھی وہ فطرتاً تغیر کے حق میں رہا ہے۔

ماضی پرستی اس کی نظر میں حالات حیات سے ایک طرح کا سمجھوتہ اور اعتراف شکست ہے جو اس نے کبھی کسی یگ میں قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے ماحول میں اپنے طور پر جینے کا عادی ہے۔

ہر عہد میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماضی کی روایات کو ہی شرافت اور تہذیب کا معیار سمجھتے ہیں اور ہر نئی نسل کے رنگ ڈھنگ کو غلط اور غیر معیاری قرار دینے سے ذرا بھی نہیں کتراتے۔ یہ لوگ نئی نسل کے والدین ہوتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے اپنے آپ کو اسے اپنے طور پر چلانے کا حقدار سمجھتے ہیں حیرت کی بات ہے کہ نئی نسل کے خلاف ان کا سب کڑا اور بڑا ہتھیار جو اکثر کامیاب بھی ہوتا ہے (گرچہ وقتی طور پر ہی) ان کا نئی نسل سے باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے اسی رشتہ کی بنا پر ان کی بزرگانہ ضد اور سنگین مزاجی کو نئی نسل برداشت کرتی ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اس ارتقا دشمن فلسفۂ حیات کو اپنی جوانیوں میں یہ بزرگ خود بھی للکار کر اور لڑ کر پسپت کر چکے ہوتے ہیں۔

معاشرتی اور اخلاقی قدریں ہر دور میں اپنا لبادہ بدلتی ہیں اور انسان جو مسلسل ارتقا پذیر ہے تغیر کو تنزل نہیں ترقی سمجھتا ہے۔ حال اور مستقبل کی طرح ہر دور کا اپنا ماضی بھی ہوتا ہے۔ نئے اور پرانے کی یہ تکرار ہر پیود برداشت کرتی رہی ہے۔

ماضی حال و مستقبل کی جڑ ہے۔ جڑ کے بغیر جینا اس درخت کی مانند ہے جسے جڑوں سے اکھاڑ کر اور کاٹ کر عمدہ کارآمد اور خوب صورت فرنیچر تو تیار کیا جا سکتا ہے، مگر بطور شجر جس کا وجود جڑ کے بغیر نفی ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ جانتے مانتے ہوئے بھی کہ ارتقاء اور تغیر ہمجولی کیفیتیں ہیں جن کا خیر مقدم ہم پر لازم ہے۔ ہم ماضی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ماضی کی وہ ازلی ابدی قدریں اور افکار جو ہمارے تمدن اور کلچر کی جڑیں

ہیں اور جنہیں ہر نئے یگ کے آدمی نے اپنایا ہے (کبھی ہی کسی قدر بدل کر اور اپنے عہد کی جمالیات کا رنگ روپ دے کر) ہماری ازلی شناخت ہیں۔

ہر پرانی پود نے نئی پود کی ادبی تخلیقات کو اپنی پہلی نظر میں بے ہنگم بے ساختہ، بے مقصد و بے معنی، بودی اور بھدی قرار دیا ہے اور انھیں تب تک سویکار نہیں کیا جب تک کہ اکثریت نے تسلیم نہیں کر لیا ہے کہ یہ تخلیقات اسی مالا کے موتی ہیں جو ویدوں اور اُپنشدوں سے شروع ہوئی تھی اور جسے ہر دور کے فنکاروں نے آگے بڑھایا ہے۔

ہم ماضی پرست نہیں مگر غالب کے پرستار ضرور ہیں اور چاہتے ہیں کہ اردو میں غالب کی روایت ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے۔ نئے رنگوں اور زاویوں کی کھوج میں کوئی برائی نہیں مگر اپنی شناخت سے انحراف یقیناً غلط ہے۔

آدمی نے کتنی قیامتوں کا سامنا کیا ہے۔ کتنی مقامی اور عالمگیر جنگلوں کا مقابلہ کیا ہے۔ کتنے قحطوں، زلزلوں اور طوفانوں کو سہا ہے مگر یہ وقتی عناصر اس کے تمدن اس کے اخلاق اور فلسفیانہ رجحانات کو کبھی ذبح نہیں کر سکے۔ ہر کڑی آزمائش نے اقوام کے علما ادبا اور شعرا کو نئی ترغیب اور نئی تحریک دی ہے اور ہر چھوٹی بڑی قیامت کے بعد جب جب تعمیر کی روح جھنجھلا کر ابھری ہے تہذیب کا ہر نشان پہلے سے زیادہ سج سنور اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔ جرمنی اور جاپان کی مثالیں ہماری گواہ ہیں کہ انسان کا ذہن اور اس کی روح حسن و صداقت کی دولت کو کبھی لٹنے یا مسمار ہونے نہ دے گی۔

کب لوٹ کھسوٹ سے ہستی کی دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں یاں ساگر ساگر موتی ہیں

تناظر ادب، آرٹ اور کلچر میں نئی قدروں کا ترجمان ہوتے ہوئے بھی ان ازلی اور ابدی قدروں کا پرستار ہے جس کا عکس ہمارے تمدن کے تانے بانے میں ہمیشہ سے جھلکتا آیا ہے اور جو ہمارے کلاسیکی ادب ہمارے رقص اور ہماری موسیقی، مصوری و سنگتراشی کی پہچان ہے۔

بلراج ورما

تخلیق و تنقید کا عصری منظر نامہ

فن انسان کی تخلیقی قوتوں کا سب سے بڑا اور اہم اظہار ہے۔ شیطان کی اولاد نے کتنی بار ہماری کتابوں کو جلایا ہے۔ تصویریں چاک کی ہیں، مجسمے، مندر اور کلیسا توڑے اور مسمار کیے ہیں اور سچائی کے مجاہدوں کو زہر پینے پر مجبور کیا ہے مگر آدمی کی فنی حس کبھی مایوس نہیں ہوئی۔

سائنسی اور مادی ترقی نے آدمی کی روحانی قوتوں پر کچھ ایسی تندی اور تیزی سے حملہ کیا ہے کہ چاند پر کمندیں ڈالنے والا آدمی آج اپنا تخلیقی اعتماد و اطمینان کھوتا ہوا سا نظر آتا ہے۔ اس کیفیت کا سامنا کسی نہ کسی صورت میں آدمی نے ہر یگ میں کیا ہے اور دیکھا ہے کہ مایوسیوں کے یہ کالے بادل روشنیوں کو کبھی بھی زیادہ دیر تک دبا کر نہیں رکھ سکتے۔

ہر رات کے بعد دن اور ہر دن کے بعد رات آتی ہے، روشنی اور اندھیرے کا یہ کھیل ازلی ہے۔ آدمی نے اس آنکھ مچولی کا پورا فائدہ اٹھایا ہے اس نے سستانے کے لیے رات اور کام کے لیے دن چنا ہے، راتوں میں سوچنا اور نئے نئے خواب بننا اور دن میں ان خوابوں کی تعبیریں کھوجنا اور ان پر تاج محل تعمیر کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

ہمیں اپنے معاصرین کے ادب و فن کے معیار میں کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آتی لہذا ہم معیاروں کے زوال کے ماتمی جلوس میں شمولیت کے لئے قطعی تیار نہیں۔ آج جو غیر معمولی تجربات ہماری شاعری اور ہماری کہانی میں ہو رہے ہیں وہ ایک حوصلہ مند صورتِ حال ہے جس سے گھبرانا نہیں آگے بڑھنے کی تحریک لینا ہے۔

اگر تجربہ ناقص اور کمزور ہے، کسی سر پھرے موجد کے عجز کا بھرم ہے اور ادب میں ایک دم نوٹس میں لیے جانے کی محض سعی ہے تو بھی کوئی ایسی فکر کی صورت نہیں، فن جو اصلی

معنوں میں فن کہلانے کا مستحق ہے۔ کبھی اتنا کھوکھلا نہیں ہوتا کہ ہر بے معنی تجربہ کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ جس نئے تجربے میں جان ہوتی ہے، جوہر ہوتا ہے وہ کڑے سے کڑے قاری اور ناقد سے بھی اپنی اہمیت تسلیم کرا لیتا ہے۔ جب فن کے پارکھ فن کے نئے اور نکھرے رنگ روپ کو پہچان کر اس پر تصدیق کی مہر ثبت کر دیتے ہیں تو ہماری فنی قدروں میں ایک نیا اضافہ ہو جاتا ہے ایک نئی چمک ایک نئی اور پائیدار قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

تجربے غالب اقبال فراق اور راشد نے بھی کیے تھے۔ شروع شروع میں ہمارے مدبرین نے ان تجربات کو انحراف اور بغاوت کا نام دے کر مایوسی کا اظہار کیا تھا مگر آج یہی تجربے ہمارے ادب کا ایک قیمتی اور اہم سرمایہ ہیں۔

ہم ہر اس نئے تجربے کے حامی ہیں، جس میں حسن ہو، جوہر ہو، معنویت اور مقصدیت ہو، ہم چاہتے ہیں کہ ان تجربوں کا فراخ دلانہ تجزیہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہے تاکہ ان کے امکانات کی حد بندیاں انھیں اپنے اولین مراحل میں ہی کچل کر نہ رکھ دیں۔ پیدا ہونے سے پہلے، پیدا ہوتے ہی یا پیدا ہونے کے جلد ہی بعد کسی بچے کے اچانک یا کسی آسمانی حادثہ سے مرجانے سے ہم جس شدید کرب و اذیت سے ہمکنار ہوتے ہیں اسی کرب اور اذیت سے ہر وہ فن کار بھی گزرتا ہے جس نے اپنی دانست میں پورے خلوص سے اور اپنی عقل و فہم کی ساری طاقتوں کو بروئے کار لا کر وہ تجربہ کیا ہوتا ہے جسے اس کے ناشناس ناقدین بغیر سمجھے پرکھے اٹھا کر کوڑے کرکٹ کا ایک حصہ بنا دیتے ہیں۔

پرانی اور نئی قدروں اور ادب و فن کے معیاروں میں نت نئی ترمیمات کے تناظر میں بھی اکثر نقاد عصری ادب و فن پر کھل کر بحث کرنے سے کتراتے ہیں تاکہ ادبی رشتوں کی وسیع و عریض برادری میں انھیں بلا وجہ مخالفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ جب کبھی کسی فن کار کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کا انداز خطیبانہ بلکہ سرپرستانہ ہوتا ہے اور ہر تخلیق میں ایسے ایسے پیارے اور رنگین موتی جن نکالتے ہیں جن کی چمک سے قاری تو ایک طرف خود خالق بھی چندھیا جائے۔ دوسری قسم کے ناقد اپنے چند لانے گنے احباب یا اپنے دائرۂ رسوخ یعنی اپنے پناہ گزیں فن کاروں کے علاوہ جب کسی باہر کے ادیب پر لکھتے ہیں تو کچھ ایسی جرأت بیباکی اور بے رحمی سے کہ اچھا بھلا اور قد آور ادیب بھی بونا نظر آنے لگتا ہے اور اپنی بے چارگی اور لاچاری کو محسوس کرتے ہوئے یا تو کہیں گم ہو جاتا ہے یا لکھنا ہی چھوڑ دیتا ہے جہاں کوئی فن کار ایسے نقاد کو للکارنے یا اس کی رائے پر اعتراض کی گستاخی کرنے کی جرأت کرتا ہے تو ایک با قاعدہ اور باضابطہ منصوبے کے تحت اس کے خلاف ایک پوری مہم تیار کر کے اسے ادبی طور پر ایک دم کچل کر

نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔اس قسم کے سازشی نقاد ہر دور میں ہوتے آئے ہیں۔اپنے دور میں ان کی تعداد دوستی پسند نقادوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ان کا دائرۂ رسوخ بھی نسبتاً وسیع ہے۔

یہ حضرات اپنے علمی تکبر میں یہ بھول جاتے ہیں کہ تخلیقی فن کاروں کی بے جا اور بے وقعت موت ان کی اپنی شہرت پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔

ہمارا مقصد نقاد کی ضرورت اور تنقید کی افادیت سے منکر ہونا نہیں۔ہم علم کی قدر کرتے ہیں اور نقاد کے اونچے بارسوخ اور اہم منصب سے بھی بے خبر نہیں۔ہم ایسے نقادوں کو بھی جانتے ہیں جن کی معتبر رائے سے ادبا اور شعرا نے فیض اٹھا کر اپنی تخلیقات کے رنگ روپ کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ہمارے نزدیک ایسے نقاد اسی رتبہ کے حق دار ہیں جو ہمارے ادب میں گورو،مرشد اور رہبر کو حاصل ہے

ہم مخالف ہیں تو صرف ان عہدداروں کے جو اپنے گروہوں کی سالاری اور ان کے ادبی تحفظ کے لیے تو جان لڑا دیتے ہیں مگر گروہ کے باہر والوں کے لیے عناصر کا قہر ثابت ہوتے ہیں۔یہ ہمارے دور کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے علم و ادب کے عصری منظر نامے میں آج کل انھیں کی اکثریت ہے۔انھوں نے دور ماضی کے عظیم فن کاروں کے فن و فکر کو اپنی تنقید و تحقیق کے موضوع بنا کر جو علم اور جو شہرت پائی ہوتی ہے اسی کے بل بوتے پر انھیں عصری فن کاروں کی تخلیقات کے ناپ تول کا حق حاصل ہوتا ہے اور جیسے ہی ان کا یہ حق تسلیم کر لیا جاتا ہے وہ فلک کا قہر بن کر ان فن کاروں پر برس پڑتے ہیں جنھوں نے انھیں اپنا خضر نہیں مانا

تنقید و تحقیق کے یہ گمراہ مدبر بن آج کے ہمارے ادب کے سب سے خطرناک دشمن ہیں۔تخلیق جو تنقید سے ہمیشہ برتر رہی ہے۔آج ایسے ہی حضرات کے دباؤ میں آکر دوسرے درجے کا ادب بن گئی ہے اور ہمارے تخلیق کار ان کے ہاتھ کی ایسی کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں جنھیں وہ اپنی مرضی سے جس محفل میں،جب،جس طرح اور جیسے چاہیں نچائیں۔ادب میں اس نئی طاقت کا جو اندھی ہے اور بہری بھی کوئی مقام نہیں اور اگر ہے تو اسے چھین کر ادبا اور شعرا کو لوٹانا ہے۔کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ چھوٹے قد کی بیمار اور مرتی ہوئی نسل ہیں۔آپ ادب کے ان ستاروں سے میر،غالب اور اقبال چھین لیں تو یہ زیرو کے بلب ہو کر رہ جائیں گے۔جن کی مدھم ضیا میں انھیں خود بھی کچھ سجھائی نہ دے گا۔

ادب کا بچا پارکھ دقت ہے یا پھر ادب کا قاری جو انھیں لوگوں کی بدولت آج کمیاب ہوتا جا رہا ہے۔

ادب ان لوگوں کا پیشہ اور بیوپار ہے جسے وہ ایک بوڑھی دلاّلہ کی طرح چلاتے ہیں سنئے نو عمر

فن کاران کے قحبہ خانوں کی جوان رنڈیاں ہیں جنہیں وہ بخی ضرورت کے مطابق کبھی اونچے کبھی کم اور کبھی بے دام ہی بیچ دیتے ہیں۔ فن ان کی نظر میں ایک جنس ہے۔

تناظر جو تخلیقی فن کاروں کی نمائندگی کرتا ہے اور ہر ادب دوست، ناقد اور محقق کو اپنا رہنما اپنا ساتھی اور ہم سفر سمجھتا ہے، ان ادب دشمن عناصر کی مذمت اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ہمارے تخلیق کار نوٹ فرمالیں۔

نوٹ:۔ "کوشش پیہم" یا "تخلیق و تنقید کا عصری منظر نامہ" **تناظر** کے اس شمارے کا مقدمہ ہیں نہ تعارف نہ ہی اس میں مندرج **مضامین** پر ہمارے تاثرات کا اظہار ہیں۔

تناظر کے مدیر کو گاہے گاہے جو اور جس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہے ہیں یہ دونوں نوٹ (میں انھیں مضامین نہیں کہوں گا) ان کا ایک حد تک ہی سہی، جواب ہیں۔



ڈاکٹر گیان چند

کوئے ملامت کا سیاح

دل کامنا کی جھیل ہے جس کے کنارے پر | بیٹھی ہے اک حسینہ بھگوئے ہوئے بدن
جب کامنا میں کامنی بنتی ہے دامنی | چاہت کے تیج کا مزہ آتا ہے سیج پر
رخسار، ہونٹ، سینہ و بازو، سُرین و ساق | ہر انگ اپنا رنگ دکھاتا ہے سیج پر
ہوس نے مٹا کر ہی چھوڑا ہمیں | حقیقت میں ہے کام کامِ نہنگ
بہت دنوں سے ترا انتظار ہے آجا | مچل رہی ہے بہت آج واسنا میری

کام، کامنا اور واسنا کا یہ شاعر، جس کا نام کرشن موہن ہے۔ ایک ایسا مارکو پولو اور کولمبس ہے جو عورت کے بدن کی پوٹیوں اور گھاٹیوں، غار اور سرنگ سبزہ و مخمل کی کھوج کرتا رہتا ہے یہی اس کی شاعری کا موضوع ہے اور اسے اس شغل سے دلچسپی ہے

تمھاری شاعری تو کرشن موہن | فقط افسانۂ رخسار و لب ہے

وہ ڈنکے کی چوٹ پر دھڑلے سے گوشت کی خریداری کرتا ہے۔ اس کے لئے دنیا اجسام کا آئینہ خانہ ہے۔ کچھ دعملی ملاحظہ ہو۔



جگمگ جگ مگ ننگے جسم
کیف، طلسم
ناز نزاکت، نخوت شان
دنیادار انسان تو کیا
ڈگ مگ ڈگ مگ سادھو سنتوں کا ایمان

(ڈگ مگ ڈگ مگ۔ کوے ملامت ص ۴۸)

غالب نے ایک غزل میں وصلِ سابق کی یاد جگائی تھی۔ کرشن موہن کی ملن کی یاد کہیں زیادہ گرما گرم اور برہنہ ہے۔ وہ ہوس کی شوخ بوسہ گاہ یعنی گردن، آئینہ سا سینہ، گرم و مرمریں رانوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کہ ننگے جسم کی لذّت مری راتوں کی دولت ہے۔

(یاد ملن کی، کام لہر کی نظم) کوے ملامت ۵۴)

وہ اپنے نظریہ کا غزل میں زیادہ شعریت اور لطافت سے اعلان کرتے ہیں۔

ہم کو بدن عزیز ہیں، ہم ہیں بدن پرست ہنستے ہوئے بدن ہوں کہ روتے ہوئے بدن

دوڑتا رہتا ہے دشتِ آرزو میں ماہ وسال جستجوے حسن میں ہے دل بھی اک رعنا غزال

یہ کامنا ہے کہ جوگن کوئی مچلتی ہے جو اپنے روپ سے چھلتی ہے من کے سادھو کو

ایسی کامنی کہ نشیلی گھڑی ہے شام سرمستیوں کی سیج پہ ننگی پڑی ہے شام

بڑھتی ہوئی ہوس کا وہ رس جس تھا ہر نفس ماہِ عسل میں سمجھے تھے دنیا کو ہاؤس بوٹ

دیویندر ستیارتھی ہر پردیش کے لوک گیت جمع کرتے تھے۔ خواجہ عبدالغفور نے لطیفوں کی قاموس مدوّن کی ہے۔ کرشن موہن ایسا کھوجی ہے جس نے یگ یگ، دیس دیس سے ایسی اساطیری روایتیں، سیاحوں کی حکایتیں، اہلِ دل کے اقوال وافعال جمع کیے ہیں جن کا موضوع کام اور کامنی ہے۔ چند مثالیں:۔

۱: قدیم یونانی معبدوں میں شباب اور حسن کی پرستش تھی کیف گستر عوام کے سامنے پجاری کنواریوں سے مباشرت کرتے تھے،

عبادت کا یہ طریقہ بھی کیا عجیب تھا۔

یہ رسم تہواروں میں ادا کرتے تھے پجاری۔

(پوجا اور واسنا۔ گیان مارگ کی نظمیں ۱۳۰)

پجاری سے مراد مندر کا ملازم پجاری نہیں بلکہ کوئی بھی پرستار۔ جو بھگت سب سے زیادہ چڑھاوا چڑھاتا اسی کو خوب صورت ترین دوشیزہ سے اکتساب فیض ہوتا تھا۔ حسین پجاری لطفِ ہم جنسیت بھی لیتے تھے کہ اہلِ یونان اس اس جنون سے بھی گُل بداماں تھے۔

۲: نظم 'غضب اور عجب' میں تین روایتیں سموئی ہیں:۔ ا۔ روم میں زنِ

بدکار کو تماشائیوں کے سامنے سزا دی جاتی تھی۔ (ریچھ اپنے دائیں پنجے سے طمانچہ مار کر اس کے پیرہن کو پھاڑ دیتا، عریاں کر دیتا اور پھر بھوکے شیر اس کو نوچ لیتے تھے۔ مشاہدین اس منظر سے محظوظ ہوتے تھے۔ (۲) جاوا کے جزیرے میں فصل آنے پر کسان اور اس کی بیوی ننگے ہو کر اپنے کھیت کے کئی چکر لگاتے ہیں۔ (۳) عہد قدیم میں یورپ میں بھی بہتر فصل پیدا کرنے کے لئے

جواں جنسی ملن سے رنگ بھرتے تھے
عجب رسم زراعت تھی
عجب طرزِ محبت تھی

(غضب اور عجب۔ کوے ملامت ۳۸)

۳:۔ نُسخۂ درازیِ عمر میں بتایا گیا ہے کہ بزرگوں کی، جوان عورتوں کے ساتھ ہم بستری کرنے سے عمر بڑھتی ہے۔

بدن کی عبادت
حسیں لڑکیوں اور بزرگوں کی ہم بستری۔ زیست افزا
روم میں ایک قبر پر کتبہ تھا۔ ع
یہ ہرمپ ہے جو ایک سو بیس برس اور چھ دن جیا
خوبصورت جواں عورتوں کے تنفس کی خوشبو کے
باعث، حکیموں کی حیرت، گذار دیونہی زیست اپنی

(نسخۂ درازیِ عمر۔ کوے ملامت ۷۹)

۴:۔ فرانسیسی حسینائیں کسی زمانے میں پیتل کے محرم پہنتی تھیں۔ سونے سے پہلے انھیں اتار کر ان میں جلتے ہوئے کوئلے بھر کر ٹانگ دیتی تھیں۔ محرم نہ ہوئی کشمیریوں کی کانگڑی ہو گئی۔

اسی باعث کہا کرتے تھے لوگ انگیاؤں کو ہیٹر
اسی باعث کہا کرتے تھے پیتانوں کو انگارے

(استعارے۔ کوے ملامت۔ ۴۵)

۵:۔ نئے دور کا سندباد جہازی بتاتا ہے کہ روے زمین پر کچھ ایسے قبیلے بھی ہیں

جن میں شادی سے پہلے لڑکیوں کے لئے بچے جننا ضروری ہے۔

اگر جنسی ملن کے بعد محبوبہ نہیں پھلتی
تو اہلِ عشق میں شادی کی بات آگے نہیں چلتی

(شرطِ شادی۔ کوے ملامت ۵۳)

۶:۔ ایک دور افتادہ ٹاپو میں پستانوں پر زرّیں خول چڑھانے والی دوشیزائیں پردیسیوں سے کاروبارِ عشق کرتی تھیں گو دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن



وہ غیروں کی بات نہ سمجھیں
غیر بھی ان کی گھات نہ سمجھیں
لیکن ان کے جسم زباں ہیں
پیار کی بولی کام کی بولی

(ایک دور افتادہ ٹاپو میں۔ کوے ملامت ۵۰)

۷:۔ اور کسی ہوائی جیسے جزیرے کا یہ مرکب مرقع دیکھیے۔

وہ ہاتھی دانت، بالو اور بھالو، لہرایا سارے سمندر کے
وہ گورا اور کالا دھن جزیرے کا
فضا ڈیباچ اور اسکاچ، شوننگ پھول مرمر جسم، ترشا حسن ہیرے کا
مکمل تیراکنیں، پتھر بیوپاری
حسینائیں
بلائیں اجنبی تو شوق سے آئیں
بدن بیچیں، ملن کی گرم لذت دیں

(کال گرلز۔ گیان مارگ کی نظمیں ۱۱۳)

پیکروں اور علامتوں کے تواتر نے فضا کو کس کامیابی کے ساتھ گرفت کرلیا ہے۔

۸:۔ پیرس سے سومیل جنوب میں ننگا نگر ہے جہاں کے مرد و زن ننگے رہتے ہیں اور ننگے کاروبار چلاتے ہیں۔

مرد و زن کا ننگا پن فطرت کی پھبن ہے۔

ایک شرافت اس ننگی بستی کا چلن ہے
ـــــ وہاں سے اخلاقی بے راہ روی کی کوئی خبر نہیں آتی

(ننگا نگر۔ کوے ملامت ۶۱)

۹: "چکر پوجا" میں کسی تانترک رسم کا ذکر ہے کہ اجنبی مرد و زن برابر کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور عورتیں اپنی چولیاں ایک ٹوکری میں رکھ دیتی ہیں اور مرد اُن میں سے ایک چولی اور چولی والی کو حاصل کرلیتا ہے۔



۱۰: تانترک نظم میں صاف کہتے ہیں:۔
ہم سب پرانی، یونی پوجا کے ارمانی
یونی اور لنگم کا ملن سنسار ہمارا
سب سے میٹھا رس ہے ملن کا
نانگ کا نروان ملن ہے۔
اور یہ بھی سن لیجئے
ننگے سادھو کے لنگم کو / کوئی بانجھ اگر چھولے تو / اس کی کوکھ سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(تانترک نظم۔ کفرستان ۱۸)

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ کرشن موہن تانترک ہیں یا ان کی جنس پرستی کسی مذہبی عقیدے، کسی شکتی پوجا، کسی ہندو روایت کے باعث ہے۔ یہ محض واسنا کا کرشمہ نظر آتا ہے، جس کی تانترک رسوم سے توجیہہ اور پردہ داری کی ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ تانترک رسوم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ کالے جادو کی طرح سے چھپ کر ادا کی جاتی ہیں[1]۔ کرشن موہن کے یہاں ہر مرض کا ایک ہی علاج ہے عورت کے ساتھ جسمانی ملن۔ ان کی عبادت، ان کی تفریح، ان کا سب سے اہم فریضہ بس یہی ایک شغل ہے۔ ردسو کی طرح وہ کچھ چھپانے کے قائل نہیں

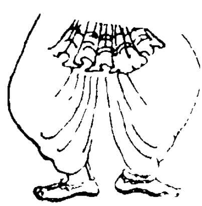
---

[1] تانترک نظم کے آخری بند میں تانترک رسوم کو بیکار عقیدے اور اوہام باطل کہا گیا ہے۔ افسوس کہ اس بات کی طرف اور نقادوں کی طرح ڈاکٹر صاحب کا دھیان بھی نہیں گیا۔ مدیر

اپنے تجربات کھلے خزانے بیان کرتے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو نے کہا تھا۔

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں دو چار کو ہم تاک رکھتے ہیں

کرشن موہن بھی جہاں جاتا ہے حسیناؤں ہی کو کھوجتا، تاکتا، گھورتا، چھوتا، چھیڑتا، چومتا، چوستا ہے، گر وصل نہ ہو تو دور کا نظارہ ہی سہی۔ قدیم اردو شاعری پر اعتراض تھا کہ اس میں ہندوستانی عورت موجود نہیں۔ فراق نے روپ کی رباعیوں میں ہندوستانی عورت کو پیش کیا لیکن وہ بھی ایک رومانی مورت تھی، ایسی نہیں جو گھروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ جاں نثار اختر نے گھر آنگن میں گھر والی کو محبوبہ بنا کر پیش کیا۔ کرشن موہن کی حقیقت نگاری ان دونوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ نئے معاشرے کے انسان کی معراج نظر نئے فیشن سے چور شوخ و شنگ حسینہ ہے۔ معلمِ اخلاق، اگلے وقتوں کے لوگ مغربی وضع کی ہندوستانی حسیناؤں کے بدیسی انداز، بے حیائی اور عریانی پر کتنے ہی جز بز کیوں نہ ہوں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کی نظروں کے سامنے سے کوئی ایکٹریس نما خاتون گزر جاتی ہے تو دل ہی دل میں تڑپ کر رہ جاتے ہیں، اپنی کھٹک اور کسک کو ظاہر بھی نہیں کر سکتے۔ چور کی ماں کوٹھی میں منہ دے اور روئے۔ نئے فیشن کی مقبولیت کے بارے میں وہ فرماتے ہیں۔



سڈول بغلوں کا بانکپن سب کو بھا گیا ہے
سڈول رانوں میں کتنی جانیں اٹک گئی ہیں
تمام عالم/کٹے ہوئے ابروؤں کے چکر میں آگیا ہے۔

(جسم کا موسم۔ شیرازۂ مژگاں ۱۵۴)

اب ان کے البم سے چند مرقعے اور ڈائری سے کچھ تجربے ملاحظہ ہوں۔

۱: ہمارے سامنے بیٹھی تھی وہ کتنی لطافت سے، پیئے جاتی تھی سگریٹ اور باتیں کرتی جاتی تھی



وہ اندازِ تبسم، اک کرن سی پھوٹ جاتی تھی اندھیرے میں
جو ریستوراں کے اس گوشے کو لے لیتی تھی گھیرے میں

(مرغولے۔ شیرازۂ مژگاں ۴۴)

۱:۔ ان کے مقسوم میں سگریٹ پینے والی نازنینیں ہی ہیں۔ شملہ سے کالکا کو ٹیکسی میں گئے تو ایک حسینہ اور اس کا ساجن بھی ساتھ تھے۔ شاعر صاحب وقت گذاری کے لئے حسینہ کی ٹانگیں پرکھتے رہے:۔

سڈول باہیں وہ اپنے پیتم کی باہوں پر رکھے پیار سے مسکرا رہی، گنگنا رہی تھی۔



اور اس کی ٹانگوں کی جاذبیت
مری شرافت پہ چھا رہی تھی
لطیف کش لے رہی تھی سگریٹ کے، ایسے گویا
مذاق سنگیں روایتوں کا اڑا رہی تھی

(ہم سفر۔ کوے ملامت ۲۲)

۲:۔ کرشن موہن کسی تقریر کو سننے گئے۔ مقرر نے لکھی ہوئی تقریر پڑھی۔ بعد میں لوگوں نے سوالات کئے۔ آخر میں کافی آئی لیکن شاعر کو کہاں ہوش تھا کیوں کہ وہ تو پورے وقت کسی کے بادامِ چشم کو نوش کیا کیا



مچھلیاں لہرائیں
وہ مرے سامنے بیٹھی تھی مجھے چاٹ گئی
اجنبیت کی جو کھائی تھی اسے پاٹ گئی
اس کے بادام مجھے کاٹ گئے
شوخ بادام، نکیلے بادام
چلبلی اور چھبیلی بادام

(بادام۔ کوے ملامت ۱۵)

۴:۔ بیٹھی ہے دھوپ میں وہ سویٹر اتار کر — باہوں کا بولتا ہوا جادو ہے جلوہ گر
گنجینۂ طلسم ہیں، شہہ بیتِ جسم ہیں — باندھے ہوئے کبوترِ سینہ کے بال و پر

(کوے ملامت ۱۳۰)

۵:۔ ہے اس شہر میں ایک ایسی بھی عورت
کہ جی چاہتا ہے / اسے کر کے اغوا / کہیں بھاگ جائیں

(ایک معزز شہری کی خواہش۔ بیراگی بھونرا ۱۴۰)

ظاہر ہے کہ یہ معزز شہری خود اسسٹنٹ کمشنر صاحب تھے۔

۶۔ گھاس میں سانپ پلتے ہی رہے
ننگے اجسام کا کھیل
ننگے اجسام کا میل (ہیتی میلہ۔ کوے ملامت ۳۰)

سانپ جنس کی علامت ہوتا ہے۔

۷۔ شکر ہے کہ جنسی آگ نے شاعر کی ذکی الحسی کو مجروح نہیں کیا۔ بھولے سے وہ اس کے تاریک پہلو کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ نظم استحصال میں علامتوں کے پردے میں کتنی خوبصورتی سے کہتا ہے۔



دودھ کا رسیا ہے سانپ
اپنے حلقے میں جکڑ کر بے خبر عورت کا جسم
چوس لیتا ہے سراسر اس کے پستانوں سے دودھ
جب بھی پا لیتا ہے وہ تنہا اسے (استحصال۔ کوئے ملامت ۴۸)

۸۔ پھر اس نے کپڑے اتار پھینکے
وہ اپنے پستاں مسل رہی تھی
تو پھر ہوا یوں کہ ایک رنگیں لکیر سی تیرگی میں چمکی
ہوئے تھے سب لوگ مست و بے خود



(کیبرے۔ کوے ملامت ۲۲)

یہ رنگیں لکیر ستر افشائی پر چمکی ہو گی لیکن یہ شوخ بہرحال اس کھلاڑن سے زیادہ سنجیدہ ہے
اور اس نے اپنے پستاں ایک گنجی چاند سے رگڑے
نئے یگ کے چھبیلے شوخ دریودھن
تماشا دیکھتے تھے اور بہلتے تھے، مچلتے تھے
اور اس کو کرشن کی رکشا نہ تھی درکار ایسے میں

(دروپدی نئے یگ کی۔ اداسی کے پانچ روپ ۱۴)

کرشن موہن کے کئی روپ ہیں جو اس کے مختلف مجموعوں کے سرورقوں پر ثبت ہیں۔ مجھے بدگمانی کے لئے معاف کیا جائے۔ اس مجموعے میں کرشن موہن کی جو تصویر

چھپی ہے اس میں ان کا فارغ البال وسطِ سر نمایاں ہے۔ پہلے مصرع کی لذیذ سعادت سے کہیں یہی تو بہرہ اندوز نہیں ہوئے تھے۔

۱:۔ یہ سب مرقعے تھے۔ ان کے چند تجربے بھی ملاحظہ ہوں۔ ان کا آئڈیل یا گرد ایسا جوان ہے جس کی نس نس میں خوبصورت جوان لڑکیوں کی خوشبو رچ بس گئی ہے

وہ یہی چاہتا ہے کہ نِس دن
نت نئی نازنیں سے ملن ہو

قابلِ رشک ہے اس کی شاہد پرستی کہ ہے اس کی مستی سے البیلے انداز سے
ساری بستی معطّر (خوشبو کی طرح آوارہ۔ شیرازۂ مژگاں ۲۹)

۲:۔ یہ کرشن موہن نہیں کوئی اور ہے کیوں کہ کرشن موہن اس کو سمجھاتے ہیں۔ بہرحال مسابقت میں یہ بھی پیچھے نہیں رہتے۔ انکشاف کرتے ہیں۔



مری سرخوش جوانی بھی صنم خانوں میں گذری ہے۔
کہ میں نے بھی تعشق سے تعلق اس طرح جوڑا
تعیش کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا
برہنہ بازوؤں پر مے گرا کر لذتِ کام و دہن لی ہے
گلابی اس طرح پی ہے، محبت اس طرح کی ہے

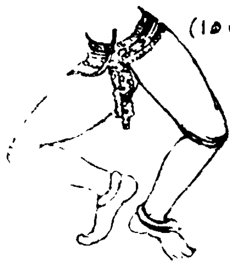
(افسانۂ آں شبے۔ شیرازۂ مژگاں ۹۷)

۳:۔ میں نے ایک روایت سنی ہے جس پر یقین نہیں آتا کہ ریچھ کو جنگل میں کوئی تنہا عورت مل جائے تو وہ اس سے مختلط ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہو کہ نہ ہو، ریچھ کی قوتِ باہ کے قصیدے تو سُنے ہیں۔ کرشن موہن نے بھی کوئی ایسی خرافات روایت سنی ہوگی اعتراف کی اس رو میں بہہ کر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔



لوگ کہتے ہیں کہ میں اِک ریچھ تھا پچھلے جنم میں
جانور ، زندہ ہے ابتک
میری جنسی بھوک تابندہ ہے اب تک
چاہتا ہے من، ملن ہو نت نئی رَس کامنی سے
شوخ، چنچل دامنی سے

ریچھ کے مانند مارا واسنا کا



(ریچھ ۔ کوے ملامت ۱۵)

۴۔ سچ کا ایک واقعہ یوں ہے ۔
اس کے تیور چاہ کے زیور بنے
اور پھر خنجر بنے
رات میری داشتہ نے مجھ کو گھائل کر دیا

(خوشبو کا خنجر۔ شیرازۂ مژگاں ۱۵۰)

۵۔ ایک پچاس سال کی عورت ہے اور پچپن سال کا مرد
دانت ٹوٹے ہیں مگر
پھر بھی وہ عمرِ گریزاں سے لڑا کرتا ہے
ہاتھ ہر روز کھڑا کرتا ہے

یہاں ہاتھ کی جگہ کوئی اور لفظ ہونا چاہیئے تھا۔ اس جوڑے کے دو بیٹے امریکہ میں ہیں اور ایک شادی شدہ بیٹی ہے۔ چونکہ دونوں اب تنہا رہتے ہیں اس لئے اب ان کا دوسرا ہنی مون چل رہا ہے۔



لذتِ جسم اٹھاتے ہیں پچاس اور پچپن
مرمریں رانوں کی محراب ہے ہر رات ان کی
آج بھی شدت سے
ان کے جسموں کی اگن بھڑکی ہے
ایک لڑکا ہے تو اک لڑکی ہے

(پچاس اور پچپن۔ کوے ملامت ۵۹)

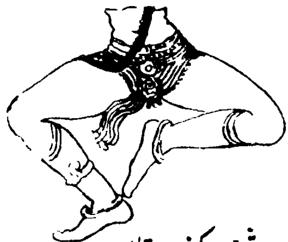
مجھے کرشن موہن کی شخصی زندگی سے واقفیت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں ان کے کتنی اولادیں ہیں لیکن پچاس کے لفظ سے شبہہ ہوتا ہے کیوں کہ ایک اور نظم میں کہتے ہیں:

پچاس ہوں میں
وِلاس کا پھر بھی داس ہوں میں

(وِلاس اور سنیاس۔ اداسی کے پانچ روپ ۴۲)

وہ اس جوڑے کے تخلیے کے مشاغل کو دانائے راز کی طرح جانتے ہیں کہیں اپنا ذکر تو نہیں کر رہے۔

۴۔ دوسری دنیا کی دوشیزہ کے موئے زیرِ ناف خوں کی طرح سرخ تھے
اور اس سے اختلاط
جان لیوا باوجودِ احتیاط
آج تک
میرا سارا جسم ہے صیدِ طلسم



(دوسری دنیا کی دوشیزہ۔ کفرستان ۳۹)

کبھی تو یہ ہونا ہی تھا۔ سرآمدِ شاہد بازاں کو زرہ بکتر کے باوجود گرمی کا مرض لگنا ہی تھا۔ لیکن یہ سرخ پشم میم دوشیزہ نہیں، گرگِ باراں دیدہ رہی ہوگی۔

اردو کے شعرا میں مومن، نواب مرزا شوق یا داغ کی شاہد پرستی کے ڈنکے بجتے ہیں لیکن کرشن موہن ان سب کو شاگرد بنا کر چھوڑے گا۔ وہ اپنے نام کی رعایت سے قلم رو شوق کا واجد علی شاہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی فلسفی فلسفہ طرازی کرتا ہے تو اس کا مختصر جواب ہے۔

تو سمجھاتا ہے فلسفے کے راز اور میں ایک لمس کا بھوکا

(بھوکا۔ شیرازۂ مژگاں ۱۳۲)

اس اعتراف کے باوجود انھوں نے جنسیات کو فلسفیانے کی کوشش کی ہے ان سے پہلے فراق نے اپنے مخصوص جمری انداز میں لکھا تھا۔

"مباشرت و انزال کی لذتوں کا نازک اور پرخلوص اظہار اخلاقیات و جمالیات کے خلاف ہرگز نہیں۔ ان جذبات و کیفیات میں والہانہ بلکہ پرستارانہ عناصر ہوتے ہیں۔ شہوانیت کا خلوص شہوانیت کی معصومی و پاکیزگی کا تنہا ضامن ہے"
(نگار ستمبر ۴۶)

۱؎ "بچاس اور بچپن" کرشن موہن کے ایک دوست کی آپ بیتی ہے۔
۲؎ یہ نظم جس کا ہیرو یا نان ہیرو وہ نہیں، خواب اور تخیل کی طلسم کاری پر مبنی ہے۔ کیٹس کی مشہور نظم کی طرح۔

فراق نے اخلاق کے ساتھ جمالیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جمال کا بہترین مظہر صنفِ لطیف انسانی ہے۔ کیا اس کے جمال کی قدر دانی کا اظہار مباشرت ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اور کیا یہ جائز ہے۔ انسان کی غیر مہذب جبلّی، اضطراری ہوس (I. D.) ہر حسین چیز کو دیکھ کر اسے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ شاعری میں اس خواہش کا کھلا ڈلا اظہار جائز ہے لیکن یہ اگر خواہش سے عمل میں آجائے تو سوسائٹی کا نظم و ضبط درہم برہم ہو جائے گا۔ کون سی شہوانیت خالص اور معصوم ہے۔ 'فریب عشق' اور 'بہارِ عشق' کے ہیرو جو اپنی محبوباؤں کے حسن کے دل دادہ تھے میں ان کی شہوانیت کو بھی معصوم قرار نہیں دے سکتا۔ شہوانیت ازدواج کی حدود ہی میں خالص اور معصوم ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ فراق کی وکالت کی محتاج نہیں۔ یہ بالعموم شاعری کا موضوع بھی نہیں ہوتی۔ مجنوں کے افسانوں کے ہیروؤں کی طرح اگر کوئی شخص دوسرے کی منکوحہ سے عشق کرے گا تو وہ شاعری یا فسانے کا محرک تو ہو سکتا ہے لیکن جنسی نراج کی طرف ایک قدم ہوگا۔

کرشن موہن نے بھی فراق کی طرح جنس کی پاکیزگی پر زور دیا ہے۔ انھوں نے اسے فنونِ لطیفہ کے اظہار کا میڈیم کہا ہے۔



جنس اظہار ہے، حسنِ ترسیل ہے، لطفِ ابلاغ ہے
جنم داتا فنونِ لطیفہ کا یہ جذبۂ آتشیں
شاہکارِ زمیں
خوب سیرت ہے یہ، خوب صورت ہے یہ

(میڈیم۔ کوے ملامت ۸۴)

انھوں نے جنس کے سماجی پہلو پر غور نہیں کیا اور ایسا کرتے تو ان کی تگ و تاز ہی ختم ہو جاتی۔ بہر حال جنس، حسن اور ملن کے بارے میں انھوں نے بڑے پُرکیف و لطیف شعر کہے ہیں۔

جیون کا رس بھی ان میں ہے جوبن کا جس بھی ہے
یہ ہونٹ انگبیں کی دلآویز پیالیاں
لب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آ بڑھ کے چوم لے آنکھوں کا یہ اشارہ کہ جرأت کبھی نہ ہو

تیرگی چھٹ گئی، ہر طرف روشنی بٹ گئی
رات اس نے جو کپڑے اتارے تو پو پھٹ گئی

ہے لطفِ سرمدی کا پیامی ترا وصال — کیفِ ابد ہے، حسنِ ازل ہے بدن ترا
شدّتِ احساس میں شامِ وصال — کر گیا تھا کتنی صدیاں طے بدن

اور پھر وہ اپنے فلسفۂ وصال کو تصوف کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظم "اختلاط" میں کہتے ہیں۔



ہے ملن وہ مقامِ صوفی کا
جو کہ رنگِ دوئی نہیں رکھتا
جب انا درمیاں نہیں رہتا
عجزِ ذہن، ذاتِ خواہشِ وصل
نفیِ[1] ذات جس کی منزل ہے — (اختلاط۔ کوئے ملامت ۳۹)

لیکن کرشن موہن کی شاعری میں صوفی کے ملن کا کہاں ذکر ہے۔ وہ تو جسموں کے ملن میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ امرد پرستی کے لئے وہ لکھتے ہیں کہ دانش ور ہوں یا فقیر یا سنیاسی، سرمد ہو کہ سقراط امرد پرستی میں احساسِ عزلت ہوتا ہے۔

یہ امرد پرستی، ادا سی کی داسی
محبت کی پیاسی — (امرد پرستی۔ گیان مارگ کی نظمیں ۵۲)

امرد پرستی کے بارے میں انھوں نے اس پہلو پر دھیان نہیں دیا کہ اس فعل میں لذت اندوزی بلکہ عشق صرف فاعل تک محدود رہتا ہے دونوں کا مشترک تجربہ نہیں ہوتا۔ کرشن موہن کی نظموں میں جس ملن کا ذکر ملتا ہے وہ شعرا کی عام روِش کے طور پر بیرونِ ازدواجی وصل ہے۔ چنانچہ کئی بار کرشن موہن اپنی عارضی محبوبہ کے لئے داشتہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ امرد پرستی کے ظرف کی طرح داشتہ بھی ذہنی استلذاذ سے محروم رہتی ہے۔ شاعر بڑے عمقِ نظر سے اس کے دل میں در آتا ہے اور اس کے احساسِ تنہائی کو محسوس کرتا ہے۔ داشتہ کہتی ہے۔

---

[1] کرشن موہن نے نفی کی ف کو متحرک باندھا ہے۔ دراصل یہ ساکن ہے۔



میرے اور تیرے یارانے میں کوئی بھی شک نہیں
عارضی رنجشیں تک نہیں
لیکن اس پیار کو میں ترستی ہوں جو
عارضی رنجشوں ہی کا پروردہ ہو
جس میں تجھے بھی ہنگامہ زا ہوں کبھی

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

دونوں کھل کر ملیں رشتہ داروں سے، احباب سے

ڈاکٹر محمد حسن نے بھی طوائفوں سے عشق کے اس بانجھ پن کی طرف توجہ دلائی کہ یہ "عشق کو محض دورِ شباب کے ایک ہیجان تک محدود کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کا سلسلہ انسانی زندگی اور معاشرے سے نہیں ملاتا جس میں نوجوان مرد اور عورت کا صحت مند جذبۂ عشق ایک خاندان کا بنیادی پتھر بنتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور آنگن میں کھیلتے ہوئے بچوں کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"[۱]

اگر صحت مند جذبۂ عشق کا انجام خاندان اور بچوں پر ہونا چاہیے تو کرشن موہن کی شاعری کا پورا عشق یا تعشق غیر صحت مند ہے۔ سچ یہی ہے کہ صرف مندرجہ بالا عشق (یا زوجین کے بیچ کا عشق) صالح ہے لیکن اس سماجی اور اخلاقی تعریف کو قبول کریں تو ادبیات کے عشقیہ بیانات اور آہ و فغاں کا بڑا حصہ اس مقدس حصار سے خارج ہو جائے گا۔

وہ کبھی کوی راج ہرنام داس بن کر یونانیوں کے اس عقیدے کا ذکر کرتے ہیں کہ جسم کے بعض جوہروں کا اخراج تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن ایسا جوہر بھی ہے۔

جو الگ ہو جسم سے تو لطف دیتا ہے بہت
جس کا نقلِ ظرف ہے عشرت کا حرف
لیکن اس کا خرج مانگے اعتدال
ورنہ بیش از وقت ہوتا ہے محبت کا زوال (اعتدالِ زریں۔کفرستان ۱۶۴)

---

۱ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر (ص ۱۱۰)

لیکن کرشن موہن اس اعتدال کے کہاں قائل ہیں۔ جنس پرستی کے بارے میں ان کی ہدایت یہ ہے۔

یا کرد اس سے پرہیز کامل
یا دل و جان سے اس میں مشغول ہوکر، بدن کو سموکر
تمنا میں کھوکر تلذذ کی محفل میں ہو جاؤ شامل

(ہدایت۔ کفرستان ۷۷)

انتہاپسندی کے دونوں متبادلات میں، کرشن موہن کس کا انتخاب کریں گے وہ ہر شخص سوچ سکتا ہے۔ انھوں نے کسی چار واک کا نظریہ نظم کیا ہے اور یہی ان کا مسلک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مطابق تمام مذہبی کتابیں بکواس ہیں اور ان کے پیرو اسیر فریب ہیں۔

برت اور بھگتی
دعا و ریاضت میں رکھا ہی کیا ہے
کہاں یہ، کہاں خوب صورت جواں عورتوں سے بغل گیر ہونے کی لذّت
وہ مخمور آنکھیں، وہ مغرور سینے

(چار واک ـــ مادہ پرستی کا پیغمبر۔ کوے ملامت ۶۴)

جیسی روح ویسے فرشتے۔ کرشن موہن نے اپنے ڈھب کا ایک ہادی ڈھونڈ ہی نکالا۔ یہ تو داد دینی پڑے گی کہ کرشن موہن زندگی کو بھرپور طریقے سے گذارنے کے قائل ہیں۔ ان کا فلسفۂ حیات اپی کیورین ہے۔ جنسی فعل کو اخلاق اور مذہب، گناہ قرار دیتا ہے لیکن شریعتِ ادب زیادہ سیر چشم ہے۔ ہمیں حیوان ہونے سے تین سوغاتیں ملی ہیں۔ بھوک، نیند اور جنسی خواہش۔ تینوں کی تسلی بخش سیرابی نہ ہو تو آدمی مضمحل رہتا ہے کرشن موہن نے ہیولاک ایلس کی طرح جنسی ناآسودگی اور جنسی کم آسودگی کی نفسیات کو ایک ماہر کی طرح پیش کیا ہے۔

جنسی فعل میں ایک نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اس سے زوال کی طرف کا سفر ناخوش گوار ہوگا۔ عمر بڑھنے اور صلاحیت گھٹنے کے ساتھ ناآسودگی کے دورے پڑنے شروع ہوتے ہیں۔ کرشن موہن کے متعدد اشعار میں اس نازک پہلو کی طرف اشارہ

کیا گیا ہے۔ جنسی سفر میں کبھی مرد کو اپنی کمی کا جاں کاہ احساس ہوتا ہے کبھی اس کی ہم سفر راہ میں پیاسی چھوٹ جاتی ہے۔ یہ بڑے نازک مقامات ہیں لیکن کرشن موہن کا کمال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے واتسائن کی طرح انھیں ماہرِ فن کی طرح بیان کر گئے ہیں۔ ایک عمر رسیدہ قاری بار بار چونک کر گھبراتا ہے کہ کہیں شاعر اسی کے پترے تو نہیں کھول رہا ہے۔ پہلے سرد عورت کو لیجئے۔ وہم ہوتا ہے کہ ان اشعار میں کہیں ان کی رفیقۂ حیات کی طرف اشارے تو نہیں۔

مچل کے سیج پہ آ اے مری رفیقِ حیات — ہوس کا تیج دکھا مثلِ داشتہ مجھ کو
بیوی کی سخت دسرد طبیعت کو جاکر — جی چاہتا ہے، اپنی کوئی داشتہ بھی ہو
کیوں نہیں گرما سکی ہے آج تک — میری گرمی، تیرے جسم سرد کو
سرد عورت سے ملن کا سادھن — اپنا ایمان ہے کرشنا موہن

ذیل کی نظم میں آخری علامت یا استعارے کی معنویت اور بلاغت پر غور کیجئے۔



سرد عورت، بے حس دبے آرزو
اور اس کے روبرو
تند مردانہ ہوس
گرم خوں اور کام رس
چھیڑتی ہے سرد سناٹے کو لو

(سرد سناٹا اور لو۔ کوے ملامت ۵۷)

لیکن یہ گرمی تابکے۔ آخر میں جاڑے کی ٹھٹھرن آئے گی اور کنپٹیوں پر برف اُگے گی۔ ہزار خواہش پرستی کے باوجود کس بل لوٹ کر نہیں آئے گا۔

رنگیں کلجگ میں، چھیلے جوبن سے
پھر ملنے کی آس ہے لابنی برف زدہ کنپٹیوں میں
عمر کی ہے سہ پہر مگر البیلی خواہش مچلی ہے

(پُنر ملن کی آس۔ شیرازۂ مژگاں ۱۴۶)

لیکن ابھی اور زوال باقی ہے جس کا مشیب ماتم کرتا ہے۔

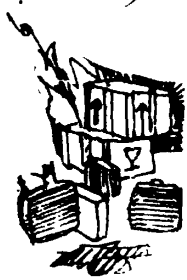
ا:۔ تو پھر آنکھوں میں رہ جاتی ہے بس فاحش ہوس، جب وقت کا دھارا
.........شوخ وگرم رانوں کو
بنا دیتا ہے سرد آخر
فقط مٹی کا ڈھیلا بن کے رہ جاتا ہے مرد آخر
(ہوس پے بس۔ کفرستان ۹۱)

ب:۔ کھردرا نوکیلا پتھر دب گیا ہے برف میں

....
سرنگوں پنچ مرا
میری پہلی موت واقع ہو چکی (پہلی موت۔ کفرستان ۹۵)

ج:۔ کثرتِ اختلاط نے مارا کتنے زار و نحیف ہو بیٹھے
جب نہ کچھ بن پڑا تو بعد ستیز اہلِ ارماں خفیف ہو بیٹھے
(کفرستان ۱۶۰)

اب عورت کی ناآسودگی کی باری ہے۔ اسے کسی ایسے مرد سے سابقہ پڑ گیا ہو تو وہ ریت پر مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ جاتی ہے۔



میں مگر تشنہ رہی
میرا ترسا پیار نفرت بن گیا
میں نے اس کو مار ڈالا دفعتاً
ورنہ خود کو مار دیتی' رات کو
وہ مری اُمید پر پورا نہ اترا، مجھ کو پاگل کر گیا

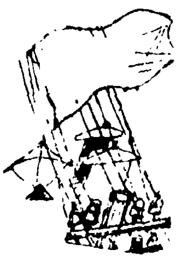
کتنی بڑی حقیقتیں ہیں۔ جنسی نفسیات کے یہ بیانات کرشن موہن کی اوّلیات میں سے ہیں۔ کسی دوسرے شاعر نے، میری ناقص معلومات کی حد تک، اس ممنوعہ موضوع کو اس بھرپور طریقے سے بیان نہیں کیا۔ کمال یہ ہے کہ کہیں عریانی کا شائبہ نہیں۔ کرشن موہن کی جنسی شاعری کا سب سے بڑا حسن اس کا خلوص اور سو فی صدی حقیقت نگاری ہے۔ یہاں روایت بستگی کا پتہ نہیں۔ ہر نظم اور غزل کا ہر شعر ایسا سچ ہے جو ان کی سرگذشت معلوم ہوتا ہے۔ ان کا یہ اعتراف دیکھئے کہ جب دوسری

عورتوں کو آسودہ کرنے کے قابل نہ رہے تو گھر والی پر وفاداری کا احسان تھوپ دیا۔



یہ ہوا کتنی ہی بار
جب کسی دوسری عورت کے پاس
شوق سے جاتا تھا میں
کام، ناکام ہی رہ جاتا تھا
ہار کر آخر کار
یاترا پہلی ڈگر پر ہولی　　(وفادار کوُے ملامت ۴۰)

ان کی حقیقت نگاری کی چھوٹ ہے کہ وہ بارہا اپنی شریکِ حیات کو نظموں کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ ذیل کی نظم میں جنسی غیر ہم آہنگی کی یہ کہانی بھی ان کے گھر کے نذر معلوم دیتی ہے۔



ایک ہی بستر پہ ہم دونوں اداس
دور ہیں، گو پاس پاس
اک پرانے اپنے پن کی کھائی کو
پاٹ سکتے ہی نہیں
اپنے ذہنی فاصلوں کو کاٹ سکتے ہی نہیں۔

(کھائی۔ کفرستان ۹۶)

افسوس کہ 'پرانا اپنا پن' ان کے لئے کھائی بن گیا۔ حالانکہ دونوں کو چپکانے والا گوند یا سریش یہی ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امتدادِ ایام نے بیوی کو بھی سال خوردہ کر دیا ہے۔



اب کہ جب آگئی ہے شامِ شباب
ابروؤں کی تراش سے حاصل
پیری ہونے لگی ہے اب وارد
ہوگئیں آپ دفعتاً بارد
کتنے ہی دن ملن نہیں ہوتا

(اب کہ جب۔ اداسی کے پانچ روپ ۱۰۹)

اپنے بیڈ روم کے راز سرِ مشاعرہ افشا کئے جا رہے ہیں۔ جنسی سونے پن کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ٹھہرے بچّے ہرجائی اور بیوی غیر مشترک وفاداری طلب کرتی ہے۔



کسی حسینہ سے بات کرلوں تو میری بیوی
مجھے حقارت سے دیکھتی ہے۔
ستائش حسن کی ضرورت نہیں سمجھتی
کسی بھی عورت کو خوب صورت نہیں سمجھی

(حقارت۔ کفرستان ۸۴)

ن۔م۔ راشد نے بیرونی حکمرانوں سے ایک اچھے طریقے پر انتقام لیا تھا۔ کرشن موہن جو انتقام لیتے ہیں اسے سوچ کر دل لرز جاتا ہے۔ خدا کرے یہ حقیقت نہ ہو*۔ جستہ جستہ مصرعے ملاحظہ ہوں۔



تو مرے جذبات کی محرم نہیں
موٹی موٹی فائلوں پر ناچتا رہتا ہے ذہن
وہ مرے مصروف دن، دفتر کے دورے روز روز
تیری عشرت کے شبیں بنتے گئے
ہو چلا ہے آج تو مجھ کو یقیں / تیرے بستر کا رفیق
اور بھی کوئی مریضِ عشق ہے..... میرا رقیب
جو تجھے رکھتا ہے پیہم بے قرارِ انتظار
....
ڈھونڈھ لوں گا آج میں بھی کوئی معشوقِ شفیق
چند لمحوں کی رفیقہ، زر خریدہ ساحرہ

(انتقام۔ اداسی کے پانچ روپ ۵۵)

---

* یہ حقیقت نہیں بلکہ ایک متصوّرہ واقعہ Imagined Situation ہے۔ یا یہ سمجھ لیجئے ایک دوست کی کہانی ہے۔ یہ نظم کرشن موہن نے شادی سے کئی سال پہلے کہی تھی۔ مدیر

انھیں یہ واسوخت نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔ وہ اپنی تمام جنسی فتوحات کے باوجود خود کو تنہا پاتے ہیں۔

مگر انجمن میں

حسیں پیرہن عورتوں اور مردوں کے مابین اکیلا رہا ہوں۔

(اکیلاپن۔ کوے ملامت ۸۷)

جنسی بے راہ روی اور جنسی خواہش کو دبانا دونوں انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں۔

مرا ذہن بنتا چلا جا رہا ہے خیالاتِ فاسد کی دلدل

مری زندگی میں رہے گی ہمیشہ ہوس کارفرما

ادھیڑ عمر بلکہ شامِ عمر میں شجرِ ہوس کی کہاں تک آبیاری ہو۔ کبھی کبھی انسان جوگ لینے کی سوچنے لگتا ہے۔ ان کی ایک کتاب کا نام "بیراگی بھونرا" ہے اور یہ لقب خود انھیں پر صادق آتا ہے۔ اپنے مجموعے "اداسی کے پانچ روپ" میں گرد پوش پر شعر ہے آنکھیں چنچل ہیں مگر من ہے مرا بیراگی کرشن موہن یہ ملن موہ کی مایا ہے مجھے

نظم ولاس اور سنیاس میں یہ اجتماعِ ضدین ابھر کر سامنے آتا ہے۔

بجا سہی ہوں میں

ولاس کا پھر بھی داس ہوں میں

کبھی یہ جی چاہتا ہے، یہ بھوگ تج کے چپ چاپ جوگ لے لوں۔

(ولاس اور سنیاس۔ اداسی کے پانچ روپ ۹۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کرشن موہن کو جنس اور جنسی فعل سے خبط کی حد تک دلچسپی ہے۔ وہ جنس زدہ Over sexed ہیں۔ لیکن ایک بات تو سنیے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں بعض کر جاتے ہیں۔ وہ معلمانِ اخلاق سے کہتے ہیں۔

ترا باہر، سراسر گیان ابھیمان ترا اندر، سراسر کام ساگر

ذہنی تعیش اور ذہنی زنا، عملی تعیش اور عملی زنا سے کچھ بہتر افعال نہیں۔ پاک صاف لوگوں کے تحت الشعور بلکہ شعور کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو کئی کوسے ملامت ایک دوسرے کے متوازی پڑے دکھائی دیں گے۔ اپنے اندر درندہ رکھنے

والے ان پارساؤں کو کرشن موہن پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ایک ردسو تو سامنے آیا جس نے اپنے نہاں خانے کو۔ تمام پردے ہٹا کر عریاں کر دیا، جس کے ہر اعتراف میں قاری کو اپنا خیال، اپنا تجربہ، اپنی پیاس، اپنی پشیمانی دکھائی دے گی۔ میں اردو کے سب سے بے باک جنسی حقیقت نگار شاعر کو سلام کرتا ہوں۔

رس کی لہر ایک ایک شعر اس کا
ہاں غزل چھیڑ کرشن موہن کی



مہاجر

جوگندر پال

میں فقیر حقیر تمہیں اپنے بول کا مطلب کیسے سمجھاؤں؛ میں تو اپنے سننے والوں کو صرف اِس لئے سننے کی تلقین کرتا رہتا ہوں کہ وہی مجھے میرے بولوں کا مطلب سمجھا دیا کریں ـــــ نہیں، ایسا تو نہیں۔ میں نے ساری عمر الفاظ جمع کرنے کے سوا اور کیا ہی کیا ہے؟ میرے پاس لفظوں کا بے حساب ذخیرہ ہے لیکن کیا فائدہ؟ ـــــ کیا تم نے اس کروڑپتی کی کہانی سن رکھی ہے جو لقمہ بھر بھوک کے لئے ترستا رہتا تھا؟ ...... نہیں؟ ـــــ بے چارہ جو کچھ بھی کھاتا، اُگل دیتا۔ کیا مجال، کھائے پیئے کی ایک بھی بوند لہو بن جائے ـــــ پوری کہانی سناؤں؟ ـــــ پوری کہانی کیا ہوتی ہے؟ کہانی جتنی ہو بس اتنی ہی ہوتی ہے، پر جتنی ہو اتنی بیان تو ہو سکے۔ میرا لفظوں کا بے حساب ذخیرہ کس کام کا، جو مجھ سے اپنی کوئی چھوٹی سی بات بھی نہیں ہو پاتی؟ ... نا معلوم میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوتا ہوں ـــــ آؤ، مجھے غور سے سنو اور اللہ کے واسطے بتاؤ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

سن رہے ہو؟ ـــــ ارے بھائی، مجھے سنانا نہیں آتا اگر تمہیں سُننا تو آتا ہے۔ خفا کیوں ہوتے ہو؟ یا ہونا ہی ہے تو لو، مجھ فقیر حقیر کے سر پر مٹی ڈالنا شروع کردو، ڈالتے چلے جاؤ حتیٰ کہ میرا سارا وجود مٹی میں دفن ہو جائے۔ اللہ رحیم ہے۔ اُس کی رحمتوں کی بارش ہو گی تو میں آپ ہی آپ مٹی میں رچ بس کر اُگ آؤں گا۔ بس بیج میں جان ہونی چاہئے، پھر وہ مٹی سے کھیل کھیل کر از سرِ نو اپنے سالم وجود میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں بھی کھڑا ہو جاؤں گا تو بھری دوپہر میں تم اپنا سفر روک کر میری ہی

چھاؤں میں آبیٹھو گے اور پھر میں کچھ بولے بغیر اپنے سارے اسرار افشا کرتا جاؤں گا اور میرے ان ہیرے جواہروں کو سمیٹ کر تم اپنی آنکھوں کے کواڑ بند کر لوگے کہ رہزن تمہیں دن دہاڑے ہی تو لوٹتے ہیں۔ رات کو تو چھوٹی موٹی چوریاں ہوتی ہیں۔ اُن کا کیا ہے؟ ہوں، نہ ہوں۔ کوئی بلی دبے پاؤں آئی اور بچا کھچا دودھ پی کر چلتی بنی، یا کوئی چوہا روٹی کے ٹکڑے کی تاک میں اچانک دیوار کے کسی سوراخ سے برآمد ہو گیا۔ ان چوروں بے چاروں سے کیا ڈرنا؟ سارا ادھم تو ڈاکوؤں نے مچا رکھا ہے۔ بچنا ہے تو ان ستم گروں سے بچو۔ کھلم کھلا کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں ــــ قاعدہ قانون؟ ــــ قاعدہ قانون بھی تو جابروں کی سواری ہوتا ہے۔ جدھر چاہتے ہیں ادھر ہی اس کی لگام موڑ کر ٹوٹ پڑتے ہیں اور لوگ باگ لٹ پٹ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

سن رہے ہو؟ ــــ نہیں شاید سو گئے ہو۔ ٹھیک ہے، جب تک روشنی آنکھیں کھانے کو دوڑ رہی ہے، چین سے سوئے پڑے رہو ــــ یا اللہ، کتنے حبس کا عالم ہے! ــــ ہاں صبح دم ہوا سولہ سنگار کر کے نکلی تو تھی مگر حکمران اسے حسبِ معمول اپنے محلوں میں اڑا لے گئے۔ سارا دن وہ اس کی آبرو ریزی کرتے رہیں گے ــــ اور شام ہوتے ہی اسے تاریکیوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیں گے ــــ ہاں، میرے مولا نے دن کے بعد اسی لئے رات کے اسباب بنا رکھے ہیں کہ لٹے پٹے مہاجروں کی شرمندگی ڈھنپی رہے۔ شرمندگی کی پردگی سے ہجرت کا تقدس سابنا رہتا ہے۔ گھور اندھیروں کی یہ وسیع اور فطری خلوت نہ ہو تو ہجرت بھی آبرو ریزی سے محفوظ نہ رہے۔

سن رہے ہو؟ ــــ نہیں، سو گئے ہو ــــ ٹھیک ہے، شام تک ــــ سوئے پڑے رہو۔ میں تو جب تک گہری نیند میں ڈوب نہ جاؤں، مجھے کھل کر جاگنے کا احساس نہیں ہوتا ــــ جاگتے میں؟ ــــ جاگتے میں مجھے یہی لگتا ہے کہ سویا پڑا ہوں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اوروں کی مرضی سے ہو رہا ہے اور مجھے صرف یہی فکر لاحق ہے کہ ہر اچھے یا برے سے اپنی دعاؤں کی قیمت وصول کرتا رہوں کوئی میرا مذاق اڑائے، مجھ پر ترس کھائے یا مجھ سے نفرت کرے، بس میرا بھیک

کا کاسہ خالی نہ رہے۔ میرا پیٹ بھرنے کا سامان ہو جائے تو مجھے کسی سے کیا لینا دینا ہے، مجھ فقیر حقیر کو اپنا پیٹ بھرنے کے سوا اور کیا کرنا ہے؟ باقی جو ہے سو ٹھیک ہے، اور اگر ٹھیک نہیں تو میں کیا کروں؟ ــــــ میں اپنا پیٹ بھر کے سو جاتا ہوں اور قسم ہے مجھے اپنے مولا پاک کی، اپنی خوابوں کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے ہی میں خود مختار ہو جاتا ہوں اور حکمرانوں کے پہریدار میرے جاہ و جلال کی تاب نہ لاکر مبہوت ہو جاتے ہیں اور میں محلوں کے بند دروازے چوپٹ کھول کھول کر بے دھڑک اندر گھستا چلا جاتا ہوں اور مقید ہوا حکمرانوں کو خوف زدہ پاکر برہنگی کی حالت میں ہی کھلے دروازوں کی جانب بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور ــــــ یا اللہ، میں فقیر حقیر کیا شئے ہوں؟ سب تمہاری برکتوں کا کمال ہے کہ اِک ذرا آنکھ لگتے ہی مجھ میں معجزوں کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کل سوتے ہوئے نہ جانے میں کہاں پہنچا ہوا تھا ــــــ سن رہے ہو؟ ــــــ نہیں، تم تو گہری نیند سو رہے ہو۔ نیند جتنی گہری ہو ہم اُتنے ہی اپنے اندر اپنے آپ سے دور کہیں پہنچے ہوتے ہیں۔ اپنے خوابوں کے بارے میں سوچ سوچ کر مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ جسے ہم باہری کائنات سمجھتے ہیں، اصل میں وہ ساری کی ساری آدمی کے بطون میں ہی پھیلی ہوتی ہے ــــــ تو پھر جب ہم اپنے باہر میدانوں پہاڑوں یا سمندروں پر نظر دوڑا رہے ہوتے ہیں تو کیا ہم اپنے اندر ہی اندر کہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ ــــــ یا جب اپنے اندر دیکھ رہے ہوتے ہیں تو کیا اصل میں باہر نگاہ جمائے ہوتے ہیں؟ ــــــ یہ کھیل مجھ فقیر حقیر کی سمجھ میں تو نہیں آتا۔ تم ہی سمجھاؤ تو شاید سمجھ میں آجائے۔ خارج کے گلی کوچے مجھے داخلی معلوم ہوتے ہیں اور داخل کے، خارجی، اور اُن میں گھومتے ہوئے میں نہ جانے یہاں ہوتا ہوں یا یہاں، یا کیا پتہ، ایک میں ہی نہیں ہوتا، باقی سب کچھ جیسے اور جہاں بھی ہوتا ہے بس ویسے اور وہیں ہوتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک نہایت خوب صورت جگہ پر بیٹھا تھا ــــــ نہیں، محض خوش وقتی کے لئے وہاں نہ بیٹھا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہیں بسا ہوا ہوں۔ کچھ اس طرح بسا ہوا ہوں کہ الگ سے میرا کوئی وجود نہیں۔

وہاں کے پھل، پھول اور سبزے کے مانند میں بھی وہی جگہ ہو گیا ہوں۔ اپنے چھوٹے سے منہ سے مجھے کوئی بڑی بات کرنے کا خیال آتا ہے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنے نہ ہونے کے اس جذبے سے سرشار ہو ہو کر مجھے اپنا آپ ہی کائنات معلوم ہونے لگتا ہے۔

سن رہے ہو؟ ——— بے خبری کے بغیر ہم باخبر نہیں ہو پاتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آنکھ لگتے ہی مجھ فقیر حقیر میں معجزے رونما کرنے کا کمال پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے بائیں ٹخنے کے قریب ایک گرد آلود بستی واقع ہے۔ اس بستی کے ہر گھر میں مَیں ہی مَیں آباد ہوں۔ میرے سوا یہاں اور کوئی بھی نہیں۔ اس حویلی میں مَیں ہی بچانوے سالہ رحیم یار خاں ہوں جو اپنی کوٹھری سے برآمد ہوتا ہے تو لگتا ہے، عدم کا رخ کئے ہوئے ہے۔ میں ہی اس کا بیٹا سلامت اللہ خاں ہوں اور سلامت اللہ خاں کا پڑوسی مرزا قطب الدین بھی میں ہی ہوں سلامت اللہ خاں کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد بھی میں ہی ہوں۔ اس محلے میں اور دوسرے سبھی محلوں میں کیا بوڑھے اور کیا بچے، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو میں نہ ہوں۔ ان ہونی سی بات ہے مگر ہے۔

سن رہے ہو؟ ——— نہیں، سو رہے ہو اور سو کر یہیں لیٹے لیٹے وہاں پہنچے ہوئے ہو جہاں ابھی تمہیں جانا ہے۔ ہماری ساری مسافتیں ہمارے اندر ہی واقع ہیں تو ہم باہر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور آگے بھی پھرتے رہتے ہیں ——— میں کیا کہہ رہا تھا؟ ——— ہاں، میرے بائیں ٹخنے پر ایک بہت بڑی بستی واقع ہے، اتنی بڑی، کہ ہزاروں میل کی بالائی مسافت میں میرے گھٹنے کے آس پاس تک پھیلی ہوئی ہے اور اس بستی میں رہنے والا ہر شخص، ہر چھوٹا، ہر بڑا میں ہی ہوں بڑے تعجب کی بات ہے مگر اس سے بھی بڑھ کے مجھے ایک دگر امر پر تعجب ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں بسا ہوا ہر شخص میں ہی ہوں، پھر بھی ان میں سے ان گنت لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں اور میں ان سے قطعاً ناواقف ہوں۔ یعنی میرے لئے وہ ہیں ہی نہیں، یعنی اپنے لئے میں ہوں ہی نہیں ——— اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ مولا پاک کی یہی مرضی ہے کہ ہم

صرف اُس حد تک ہو پاتے ہیں جس حد تک اپنے آپ کو پہچان پائیں۔

مجھے اپنے ٹخنے پر واقع نمایاں مقامات سے ہی واقفیت ہے۔ کوئی اس قدر تیزی اور تجربے سے اتنی گرد اڑا یا اڑا کر چلے تو اسے سارے مقامات کیوں کر نظر آئیں؛ شاید میں چوری چھپے اپنی منکسر المزاجی پر اتنا اتراتا رہتا ہوں جو غافل ہوں۔ ورنہ اس عمر میں سوجھ بوجھ کا دامن سجھائی کیوں نہ دے؟ —— نہیں، میری بوڑھی عمر ہی بھوک اور ہوس سے بے حال ہو کر میری سوجھ بوجھ چٹ کئے جا رہی ہے —— رحیم یار خاں کو اس پیر سالی میں سوکھ سوکھ کر اتنا بھی ہوش نہیں کہ جھڑتے ہوئے اسے اپنے جھڑنے کی خبر ہو جائے۔ لیکن جہاں بھی وہ ابھی بوند بھر چکناہٹ سے اپنی ذات سے جڑا رہ گیا ہے وہیں وہ سجدے میں سر جھکائے خدا سے یہی دعا مانگتا رہتا ہے، مرنے سے پہلے اپنے پڑوسی مرزا قطب الدین کا کٹا ہوا سر دیکھ لوں۔ سالہا سال پہلے اس نے مرزا قطب الدین کو اپنی غلامی میں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مرزا اور اس کی بیٹی مہرانسار نے فرار ہو کر نکاح پڑھوا لیا۔ پہلے تو وہ اتنا بھڑک اٹھا گویا ساری دنیا کو خاکستر بنا دے گا مگر پھر راکھ کے اندر ہی اندر سلگتے ہوئے اس کی عمر بیت گئی۔ اسی کے حکم سے اس کی حویلی کے آنگن میں ان کی خاندانی توپ نصب ہے جس کا منہ مرزا کی دیوار کی جانب مستقلاً کھلا رہتا ہے۔

مہرانسار اپنا ساتواں لڑکا جن کر جان بحق ہوئی تو رحیم یار خاں نے صرف یہی کہا، جو لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے فرار ہو گئی اُس میں اتنی شرافت کہاں سے آئی کہ اپنے شوہر کے یہاں بھی چین سے پڑی رہتی؛ —— رحیم یار خاں بڑا با ایمان اور شریف آدمی ہے، اِسی لئے وہ اپنے عقیدوں کی پائمالی کی تاب نہ لایا پایا اور نہایت ایمان داری سے اپنی نفرتوں پر اڑا رہا —— ہاں، ٹخنے پر بسے ہوئے شریف لوگوں سے اس سے زیادہ توقع ہی کیوں کی جائے؛ وہ جی جان سے ایماندار تو ہیں، یہ تو نہیں کرتے کہ زہر پر شہد چڑھا کر اصرار کریں، کھاؤ، کھا کر تو دیکھو! —— مولا پاک ان پر اپنا خاص رحم کرے، اپنی سیدھی سادی نفرت کی بدولت ہی یہ لوگ بجھنے میں نہیں آتے اور اتنی لمبی عمریں پاتے ہیں ——

نہیں ، ان کنبوں کی داستان یہیں کہاں ختم ہو جاتی ہے ؛ ـــــ آگے سنو ـــــ رحیم یار خاں کے بیٹے سلامت اللہ خاں کے بھی ایک بیٹی تھی ـــــ تھی اس لئے، کہ وہ اپنی امید بر آنے سے پہلے اپنے عاشق کے ہمراہ میرے ٹخنے سے دل تک ہجرت کر چکی ہے۔ دل کی بستی میں بود و باش اختیار کرنے سے پہلے جان تو گنوانا ہی پڑتی ہے ـــــ ہوا یوں کہ ایک دن اچانک سلامت اللہ خاں نے مرزا قطب الدین کے ساتویں بیٹے نعیم الدین اور اپنی اکلوتی بیٹی گلاب بانو کو خاندانی نفرتوں کے مورچوں کی آڑ میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور انھیں اسی حالت میں اپنی بندوق کی گولیوں سے بھون کر رکھدیا۔ ہے نا ـــــ

ارے سن رہے ہو ؟ ـــــ نہیں ، سو رہے ہو ! ـــــ بے گناہوں کی موت واقع ہو گئی ہے۔ اٹھو ، دو آنسو بہا لو ـــــ نہیں ، سوئے رہو۔ جہاں پہنچے ہو خدا کرکے وہاں پہنچے ہو۔ ہماری بے خبری میں نا معلوم کتنے معصوم مر جاتے ہیں اور یہ اچھا ہی ہے ، نہیں تو زندگی کا ایک ایک پل رونے میں ہی گذرے ـــــ نہیں ، میں ہی تو سلامت اللہ خاں ہوں۔ اس نے اپنی بیٹی اور قطب الدین کے بیٹے کی جانیں کہاں لیں ؛ انھیں مارنے والا تو میں ہوں۔ اپنی بیٹی اور بھانجے کو قتل کرنے کے بعد میرا رونا رو کے نہ رکتا تھا ـــــ نہیں ، میرا مولا پاک ـــــ سبھوں کو بخش دیتا ہے ، قاتلوں کو بھی ـــــ میرا ایمان ہے اس نے مجھے بھی بخش دیا ـــــ ہاں ، جنھیں میں نے مارا ، وہ بے چارے بھی میرے سوا کون تھے ؟ میں نے اپنی ہی معصومیت میں اپنے آپ کو مارا ، مگر سنو ، ہم اسی لئے مرنے سے بچے رہتے ہیں کہ ہمارا معصوم آپ ہمیشہ زندہ رہتا ہے ، میرا مطلب ہے یہاں کوئی مرتا ہے تو وہاں کوئی پیدا ہو جاتا ہے ـــــ سنو ، خوش ہو جاؤ گے : مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بستی میں بے حساب گلاب بانوئیں اور نعیم الدین بغلگیر ہیں اور خنداں اور خوب صورت ننھے منے بچوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار عدم آباد سے سیدھے ان کی جانب کھنچی چلی آ رہی ہے۔ میرے ساتھ کئی بار ایسے ہوتا ہے کہ عالم خواب میں کسی کورے برتن کی

طرح میں نو بہ نو ہو جاتا ہوں اور پھر کوئی کنواری کچے دودھ کی طرح مجھ میں اُنڈل آتی ہے اور میں اس سے لبالب بھر جاتا ہوں ـــــ پھر؟ ـــــ پھر کیا؟ ـــــ دنیا کی ایک ہی ٹھوکر سے میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دودھ مٹی میں مل جاتا ہے، مگر جونہی ادھر میری توڑ پھوڑ ہوتی ہے اسی پل میں اپنے آپ کو جوں کا توں اپنے دل کی بستی میں اسی کچے اور میٹھے دودھ سے لبالب بھرا ہوا پاتا ہوں۔ ہر لحظ دودھ پیئے جانے کے باوجود میں ویسے ہی کناروں تک بھرا رہتا ہوں ـــــ کیا؟ ـــــ جاگتے میں؟ ـــــ وہ مت پوچھو ـــــ جاگتے میں تو جو کی سوکھی روٹی بھی نصیب ہو جائے تو غنیمت ہے ـــــ نہیں، جو کی سوکھی باسی روٹی سے میرا خون کیا بنے گا؟ وہ ہی میرے خون میں بھیگ کر پھولتی رہتی ہے اور میرے لئے دشواریاں پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے ـــــ مگر پھر میں خواب و خیال میں ویسے ہی سالم اور شیر و شکر سے لبریز کہاں سے اور کیوں کر پھوٹ آتا ہوں، ـــــ مجھے یقین ہے میں نے کبھی نہ کبھی ضرور کسی مہ جبیں سے محبت کی ہوگی ـــــ اس جنم میں؟ ـــــ نہیں، اِس جنم میں تو میں فقیر حقیر سدا سے ایسے ہی ہوں جیسے ہوں۔ محبت کرنے کی بجائے خوش کرتا ہوں، دعائیں دیتا ہوں تاکہ لوگ میرے کاسے میں کچھ نہ کچھ ڈالتے رہیں۔ ایسے آدمی سے محبت کون کرے گا، نفرت بھی کون کرے گا؟ میں کچھ ہوتا تو مجھ سے کوئی محبت یا نفرت کرتا ـــــ ہاں، میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں، میں ہوں ہی نہیں ـــــ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟ ـــــ میری سمجھ میں بھی کیا آرہا ہے؟ ـــــ دراصل ہماری سمجھ میں وہی کچھ آتا ہے جس کے سمجھنے، نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہ پڑے ـــــ بہر حال تم بھی میری طرح مجھے سنتے چلے جاؤ۔ سماعت سے بھی دروبند پر دباؤ پڑتا ہے ـــــ نہیں میں کیا ہوں جو تمہیں کچھ سمجھانے کا دعویٰ کروں؟ میں چاہتا ہوں میری چھوٹی باتوں سے تمہیں اپنی بڑی باتیں یاد آجائیں ـــــ ہم بول رہے ہوں یا سن رہے ہوں، سمجھنا تو ہمیں وہی کچھ ہوتا ہے جو کچھ ہمارے ساتھ بیتا ہو۔ میرے ساتھ تو اس جنم میں اپنے نہ ہونے کی واردات بیتی ہے ـــــ

ایک بار میں بادشاہ کے محلوں کے سائے میں ندی کے کنارے بیٹھا گا رہا تھا۔ اس عورت کی خوب صورتی بیان کر رہا تھا جس کا دودھیا بدن مجھے خوابوں میں اپنے وجود میں چھلکتا ہوا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ میرا گیت سنتے ہوئے شاہ زادی اور اس کی سہیلیاں محلوں سے باہر آکے مجھے ڈھونڈنے لگیں۔ میں نے اپنا گیت روک کر جب انھیں مخاطب کر کے کہا کہ میں یہاں ہوں، تو وہ بھوت، بھوت چلاتے ہوئے واپس محلوں کی طرف دوڑ گئیں۔ جو نظر نہ آئے وہ اپنا بھوت ہی تو ہوتا ہے۔ اس میں ان بے چاریوں کا کیا دوش؟ ـــــــ مگر مجھے یقین ہے کہ اپنی کسی پچھلی زندگی میں میں ہی مرزا قطب الدین کا ساتواں بیٹا نعیم الدین رہا ہوں گا اور اپنے ٹھٹے کی بستی میں آبا و اجداد کی نفرتوں کے مورچوں کی آڑ میں رحیم یار خاں کی پوتی گلاب بانو سے والہانہ محبت کرتا ہوں گا۔ پھر ہمیں گولیوں سے بھون دیا گیا اور ہم دونوں ہو بہو زندہ دل کی بستیوں میں اتر آئے۔ اس جنم میں بھی جو ہم دونوں ویسے ہی میرے دل میں بود و باش کئے ہوئے ہیں تو میں نے کسی نہ کسی زندگی میں ضرور محبت کی ہوگی ـــــــ یہ زندگی؟ ـــــــ زمانۂ حال میں تو ہمیں صرف اپنی حاجتیں پوری کرنی ہوتی ہیں۔ ہم جب بھی جئیں صرف اپنا ماضی ہی جی رہے ہوتے ہیں۔ تصور کرو کہ ہم کسی کھلے میدان میں بیٹھے ہیں اور ارد گرد دیکھتے ہوئے ہمیں دور دراز کا کوئی کوہستانی سلسلہ اپنے پاس ہی معلوم ہو رہا ہے ـــــــ یہ لو ـــــــ اتنا پاس، کہ ذرا سا ہاتھ بڑھا کے اس ٹہنی سے وہ سُرخ سیب توڑ لیا، یا اس پرندے کے ساتھ چہچہانا شروع کر دیا ـــــــ سن رہے ہو؟ ـــــــ ماضی کے مناظر آپ ہی آپ ہمارے قریب سرکتے چلے آتے ہیں اور ہمارے چپے اور خالی خولی حال پر آباد ہو جاتے ہیں۔ میرا ماضی بھی مجھے حال ہی بن کر پیش آتا ہے۔ میں ہوں نہیں، تھا!

لو، تمھیں کئی ہزار سال پہلے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس وقت میں ایک نہایت، خونخوار جنگلی جانور تھا ـــــــ نہیں، میں کوئی من گھڑت قصہ نہیں سنا رہا، آپ بیتی بیان کر رہا ہوں۔ مجھے جو بھی شئے یا جاندار نظر آتا میں اُسے کھانے کی شئے سمجھ کر منھ میں ڈال لیتا، لیکن جب میری مادہ میرے پاس آتی

اُس وقت میں بے اختیار اپنے آپ کو اُس کے سامنے ڈال دیتا کہ وہ مجھے کھائے اور جی ہی جی میں اس کے دانتوں میں کٹ کٹ کر مجھے بڑا مزہ محسوس ہوتا ــــــ جانتے ہو، میں اُس خونخوار درندے سے انسان کیوں کر بنا؟ ــــــ میں اور میری مادہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کے اگلیوں کو بازو بنا لیتے تاکہ ایک دوسرے کو محبت بھری لپیٹ میں لے آئیں، سو اِس کے بعد جب ہم پیدا ہوئے تو ہمارے دو ٹانگیں اور دو بازو تھے۔

سن رہے ہو؟ ــــــ نہیں، سو رہے ہو ــــــ محبت کر کر کے خونخوار جانور بھی انسان بن جاتے ہیں ــــــ ہاں، اس زندگی میں مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ میں تو سب سے کرنا چاہتا ہوں مگر کس سے کروں؟ کوئی نہیں ملتا تو یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتا ہوں کہ پھر کہیں جانور نہ بن جاؤں، مگر مولا پاک کا شکر ہے کہ نیند آتے ہی میری محبت کی چاہ پوری ہو جاتی ہے اور اپنی گلاب بانو کو اگلی دو ٹانگوں میں اندھا دھند لپیٹے ہوئے اس کے کانٹوں سے لہو لہان ہو کے میری وحشت کو قرار آجاتا ہے ــــــ نہیں، جاگو نہیں، ابھی سوئے رہو۔ شاید تمہیں بھی اپنا ماضی پیش آرہا ہے اور تم بھی اپنی گلاب بانو سے محبت کر رہے ہو۔ ذرا سا اور سو لو گے تو ذرا سے اور بہتر انسان بن جاؤ گے۔

خوابوں میں یادداشت جگمگا اٹھتی ہے اور ہم ہزاروں صدیوں میں پھیلا ہوا ماضی چند پلوں میں جی لیتے ہیں ــــــ مستقبل؟ ــــــ مستقبل کی فکر کیوں کرتے ہو؟ جو کچھ ابھی ہونا ہوتا ہے وہ دراصل ہو چکا ہوتا ہے ــــــ سمجھ میں نہیں آرہا؟ ــــــ ارے بھئی، میری سمجھ میں بھی کہاں آرہا ہے؟ ــــــ غور کرو مستقبل ہمیں خیالوں میں پیش آرہا ہوتا ہے ــــــ سچ مچ؟ ــــــ سچ مچ کیا ہوتا ہے؟ ــــــ جو ہمارے خیال میں سچ مچ ہو ــــــ پھر تم ہی بتاؤ، ماضی اور مستقبل میں کیا فرق ہوا؟ جو ہو گیا وہ بھی ہو گیا اور جسے ابھی ہونا ہے وہ بھی۔ بس یہ ہوا کہ بندے کو اپنے کیے پر کرنے سے پہلے ہی پچھتا دے کا موقع میسر آگیا۔

سنو، ایک دفعہ مجھ فقیر حقیر کا بھوک سے دم نکل رہا تھا۔ مولا پاک کا حکم ہے کہ خواہ مخواہ کی موت کو نہ روکنا بھی گناہ کبیرہ ہے، سو میں نے خیال

ہی خیال میں ایک نانبائی کی دکان سے روٹی اڑا کر اپنی بھوک مٹالی، یعنی جو کچھ مجھے ابھی کرنا تھا وہ اسی دم ہو گیا۔ بھوک تو میری مٹ گئی مگر مجھے بڑا پچھتاوہ ہوا کہ مجھ سے ناحق چوری کا گناہ سرزد ہو گیا۔ پچھتاوہ اور اقرار اللہ کی گرانبہا نعمتوں میں سے ہیں، اس لئے میں سیدھا اور اس نانبائی کے پاس گیا اور بے تامل اپنی چوری کا اعتراف کر لیا۔ اس نے مجھ سے روٹی کے پیسے مانگے۔ پیسے میرے پاس ہوتے تو اس سے روٹی خرید نہ لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی سے مجھے پانچ کوڑوں کی سزا ملی۔ کوڑے کھا کے مجھے اذیت تو ہوئی لیکن اس سے بھی بڑھ کے اس وقت راحت ہوئی جب نیند میں میری گلاب بانو نیم گرم پانی کی پیٹوں سے تادیر میرے زخم ٹکورتی رہی۔

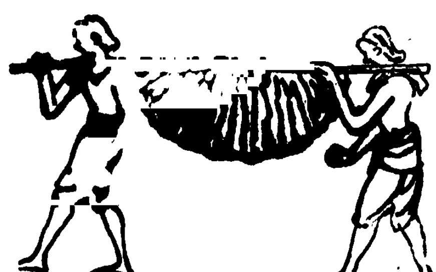
بار بار پہلو کیوں بدل رہے ہو؟ جاگ گئے ہو؟ اٹھو، نیند تو آ کے چلی گئی۔ یہیں پہلو بدل بدل کر وہ ڈھونڈنے میں تھوڑا آئے گی۔ اٹھو، تھوڑی دیر میں شام گہری ہونے لگی اور پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ گھبراؤ نہیں، تاریکی میں ہماری ہجرت کی دید کون کرے گا؟ اپنی شرمندگی آپ ہی محسوس کرتے ہوئے ہم اپنی راہ پر چلتے رہیں گے اور کسی نئے ٹھکانے پر جا پہنچیں گے۔ شرمندگی کے ساجھے دار نہ ہوں تو راستے آپ ہی آپ ہمیں کسی برتر مقام پر لے آتے ہیں۔

نہیں، اللہ بچائے، مجھے اپنے دل سے نیچے کی جانب نہیں جانا ہے۔ دل کی بستی کے نیچے پیٹ سے گھٹنوں کے اوپر تک کے رقبے میں جہنم ہی جہنم واقع ہے —— ہاں، ذرگستان کا یہ نقشہ دھیان سے دیکھ لو تا کہ کبھی بھولے سے بھی اِدھر کا رخ نہ کرو۔ ایک دفعہ اِدھر کی مہکی مہکی فضا کے طلسم کا شکار ہو کے میں اپنے تخنے کی گرد آلود بستی سے اسی طرف ہو لیا —— نہیں، شرمندہ انسان تو جہنم تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ آتا ہے۔ میں تو بڑے طمطراق سے چلا جا رہا تھا۔ گھٹنے کی سرحد پار کر کے میں پیٹ کے نیچے دونوں ٹانگوں کے درمیان بالائی حصوں میں آ پہنچا اور یہیں ڈیرا ڈال لیا۔ میرا مولا بخشے: شیطان سے میری ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ سب سے خوبرو

مہذب اور باکمال معلوم ہو رہا تھا۔ میں اندھا کیسے پہچان پاتا کہ یہ تو وہی ہے جس سے میرے مولانے مجھے بچنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ بس پھر جو ہونا تھا وہ ہو کے رہا، میں رنگ اور بو اور صدا کے طلسمی جال میں مکڑتا ہی چلا گیا اور ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو پیٹ کی بالائی سرحد پر گندے خون کی ایک خلیج میں بہتے ہوئے پایا۔ رضائے حق کا کرشمہ تھا کہ میں بچ گیا، ورنہ میں اس متعفن خلیج سے شفاف خون کے سمندر تک کیسے پہنچتا اور پھر یہاں سے دل کے جزیرے پر کیسے آ لگتا۔ یہاں میرے دل کی بستی کے کناروں سے گلاب بانو مجھے اپنے نہاں خانوں میں لے گئی۔ جہاں اس نے دن رات میرے جسم اور روح کی تیمارداری کی اور خدا خدا کر کے میری جان میں جان آئی

سن رہے ہو؟ ـــــ نہیں، پھر سو گئے ہو ـــــ ٹھیک ہے، تھوڑا اور سو لو۔ شام گہری ہو جائے گی تو ہم بے خطر اپنی ہجرت پر نکل پڑیں گے۔ خوب آرام کر لو، کیوں کہ ہمیں بہت دور ـــــ ایک افضل ترین مقام پر پہنچنا ہے ـــــ ہاں، تم جانتے ہو ہمیں کہاں پہنچنا ہے ـــــ ہاں آنکھوں کے اوپر، اپنے ماتھے پر، جہاں ہم دیکھے بغیر دیکھ لیتے ہیں، ملے بغیر مل لیتے ہیں، ہوئے بغیر ہو لیتے ہیں ـــــ ہاں خوب آرام کر لو، ہمیں بہت دور اپنے مقدر پر پہنچنا ہے۔

ـــــ جوگندر پال



مسعود منور

صفرِ سفینہ



"ایک تھا پنجابی، پنجابی کون خود خدا، خداوند عالم بھی تو پنجابی ہیں۔"

حضرت میر یاز شاہ اپنے حلقۂ ارادت میں آنے والوں سے محو کلام تھے اور اہل مجلس زانوئے عقیدت تہہ کئے بڑے خضوع و خشوع سے افکارِ عالیہ سے استفادہ کر رہے تھے۔

حضرت میر یاز شاہ کائنات کا علم رکھتے تھے، ستر لکھائیوں میں لکھتے اور ستر زبانوں میں گفتگو فرماتے، اپنے عہد کے صاحب قلم والکلام تھے، لغت اور گرامر آپ کے نزدیک اندھے کی لاٹھی تھی۔

میرا آپ کا رابطہ اتفاقاً ہو گیا تھا، بلکہ اسے میں حسنِ اتفاق کہوں گا۔ گرمیوں کے دن تھے، دوپہر کا وقت، میں حافظ آباد سے بس کے ذریعہ چینوٹ آیا تھا۔ مجھے اپنے ننہالی قرابت داروں سے ملنا تھا بس اڈہ سے محلہ عیدگاہ تک سفر کوئی دو میل کا رہا ہوگا۔ مجھے پیدل چلنے کا بہت شوق ہے اور نہانے کا بھی۔ مجھے صوفیوں نے بتایا تھا کہ سیر اور غسل دونوں انسان کے غیر مرئی وجود کے وظیفے ہیں اور روح کو بالیدگی بخشتے ہیں۔

میں دو میل کے اس سفر کو اپنے وظیفے کا ایک حصہ بنانا چاہتا تھا، اور چینوٹ کی خشک اور بے برگ و گیاہ پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹتا ہوا اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ چناب کے کنارے ایستادہ یہ قصبہ اپنے خوبصورت مکانوں، متموّل اور خوش حال لوگوں اور لکڑی پر کھدائی کے کام کے لئے بہت مشہور ہے۔ یہاں کھیتی باڑی روایتی طریقے سے ہوتی ہے اور آب رسانی کے لیے رہٹ سے پانی کھینچا جاتا ہے، رہٹوں کو بیل کھینچتے ہیں اور بیلوں کو جا بک بردار کسان چلاتا ہے، کبھی منہ سے ہٹ ہٹ کی آوازیں نکال کر اور کبھی اپنا سانٹا ہوا میں لہرا کر شرا سے کی آواز پیدا کرتے ہوئے، رہٹ کے چوبی دھرے روں روں کی نہایت مؤثر اور حیات انگیز موسیقی وضع کرتے ہیں، یہ موسیقی

اتنی بے رحمی سے دل میں اترتی ہے کہ آپ اس سے اپنی روح کے تاروں کو بچا کر نہیں رکھ سکتے۔

اس راستے پر پہاڑی ٹیلے کے پہلو میں برگد کے دو انتہائی بزرگ پیڑ ہیں جن کی ڈاڑھیاں دیو ویاس کی جٹاؤں کی طرح قدیم اور ژولیدہ ہیں۔ ان پیڑوں کے نیچے فقیروں اور ملنگوں کا ڈیرا ہے، اور یہاں یہ باکرامت ملامتی دن بھر سبزی گھوٹتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔

"تیلی ساوی، رنگ لادی"

اس پہاڑی ڈھلوان پر ایک مسطح چٹان ہے جس پر ایک کشادہ سا پختہ کمرہ ہے جس کے دروازے پر بانس کی چلمن پڑی رہتی ہے اور کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ اس کے روشن دانوں سے دھوئیں کی ایک لکیر سی اٹھتی ہے اور ہوا میں ایک گوارا سی مہک بکھری رہتی ہے میں دھوپ میں چلتے چلتے اوب سا گیا تھا۔ پسینہ میری کانوں کی لووں سے پھوٹ کر ریڑھ کی ہڈی پر رینگتا ایک تار سی ندی میں بہنے لگا تھا اور میری بنیائن کمر سے چپک رہی تھی۔ بڑھ کی گھنی چھاؤں دیکھ کر میرا سلگتا ہوا بدن للچایا اور میں سستانے کے لیے ان پیڑوں کے سائے میں رک گیا۔ بڑھ کی چھاؤں میں دودھ کی ٹھنڈک ہوتی ہے، اس لیے کہ بڑھ دودھ دینے والی مخلوق ہے۔ میں رومال سے اپنی پیشانی اور کنپٹیاں پونچھ رہا تھا کہ اس پختہ کمرے کی چلمن ہٹی اور دروازے میں سے کسی نے جھانک کر دیکھا۔ وہ دور سے کوئی مجہول سا شخص نظر آیا جس کی کمر میں ایک میلا سا تہبند تھا اور گلے میں کہربا کی مالا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہرے پتھر کے کڑے تھے اور اس کی گول کھچڑی ڈاڑھی بے حد میلی تھی۔ اس کی آنکھ میں سرخ رنگ کا خوف سرمے کی طرح رچا ہوا تھا۔ اس کے سینے، کمر اور بازوؤں پر اس قدر بال تھے کہ کسی جنگل کی مخلوق کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے چلمن سے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ہونٹوں کے آگے رکھ کر تین بار پھیپھڑوں کی پوری قوت سے الف الف الف کہا اور پھر اتنی پاٹ دار آواز میں الا اللہ کا نعرہ لگایا کہ بڑھ کے پیڑوں پر کپکپی طاری ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مجہولوں کی طرح ہنس کر بولا

"اے ادھر آ، معصوم شیطان"

میں کسی نامعلوم سی مقناطیسیت کے زیر اثر اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا، دائیں ہاتھ کی جو بیچ کی انگلی اٹھائی اور میری طرف اشارہ کر کے دیوانوں کی طرح ہنسا اور بولا، "شربت دینار پر پلنے والے کاغذی پٹاخے، تیرا جگر ضعیف ہے، تیری جیب میں ۲۳ روپے ۸ پیسے ہیں۔ تو جلدی سے ۲ روپے ۸ پیسے میری خدمت میں پیش کر دے اور سلام کر۔ جلدی کر جلدی

کر۔" وہ مجہول میری جیب میں رکھی رقم کی صحیح گنتی بتا کر مجھے حیران کیے دے رہا تھا کہ کمرے کے اندر سے آواز آئی۔

"دیکھوں بچے کو پریشان کرتا ہے، احمق اللیل والنہار، جانے دے، تنہا جانے والے بچوں اور نہتے مسافروں پر حملہ کرنا کمینے دشمن کا کام ہے، مار بکر ڈبکڑ کے حرامزادوں کو، نہ جینا آتا ہے نہ جلانا آتا ہے جب دیکھو بھیک کا کاسہ آگے ہی آگے۔"

اس پر وہ مجہول شخص اچھل اچھل کر دیوانوں کی طرح ہنسا، مجھے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا اشارہ کیا اور کمرے میں گھس کر چلمن کے پیچھے دروازہ بلند کر لیا۔

حیرت نے سحرزدہ کر دیا تھا لیکن پیاس اور گرمی نے مجھے وہاں سے چل دینے کی تلقین کی اور میں سر پر جیبی رومال پھیلا کر پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

چلنے کو تو میں چل رہا تھا لیکن میری شخصیت مجھ سے بچھڑ کر اسی کمرے کے دروازے پر رگر پڑی تھی جہاں اُس فقیر نے میری جیب میں موجود رقم کی صحیح گنتی بتا دی تھی۔

ان برگدوں کے طلسم خانۂ ملامت سے نکلا تو مجھے وہ غار نظر آیا جو میاں ضیاء الدین سے موسوم ہے۔ اس غار کے نیچے پہاڑی کے پتھریلے دامن میں کریروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان کریروں کے درمیان کہیں کہیں مدار کے دودھ دینے والے پودے اُگے ہیں جن پر آنے والا پھل صورت میں طوطے جیسا ہوتا ہے اور جس کے بیج کے گرد سفید تاروں کا ایک گول سا قرعہ کھنچا ہوتا ہے جو اس بیج کو ہوا میں پرندے کی طرح اڑاتا ہے۔ کریروں کے اس جنگل میں کچھ دور آگے چل کر قبروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جھاڑیوں کے درمیان اِکّادکّا قبریں کہیں کہیں کوئی پختہ قبر جس پر تعویذ نصب ہے اور تعویذ پر مرنے والے کے کوائف، یہ کریرزار آگے چل کر میاں شیخ حسین کے مزار کے سائے میں ایک گھنے اور مصروف قبرستان میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس قبرستان سے ایک پگڈنڈی آبادی کی طرف پھوٹتی ہے جس پر چلتے چلتے میں محلہ عیدنٔ ناہ کو جانے والی سڑک پر آگیا مجھے اس محلے کی آخری گلی تک جانا ہے۔ اس گلی کے بعد کھیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کھیتوں کے درمیان بنجر ہے، یہ بنجر جناب کے پانیوں نے زرخیز زمینوں کو تہ و بالا کر کے تخلیق کیا ہے، اب یہ ریت کا ایک ویران سا نشیب ہے جو ہر سال برسات کے موسم میں چناب کے منہ زور پانیوں کو آبادیوں کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس آخری گلی کا دسواں مکان میرے ماموں کا ہے میں گلی میں داخل ہوا تو مجھے دسویں مکان کے دروازے پر وہ مجہول پھر نظر آیا جس نے مجھ سے

تین روپے ۸، ۷ پیسے مانگے تھے۔ وہ اپنی زبان دانتوں میں دبائے ہاتھ بھیک کے لیے بڑھائے میرا انتظار کر رہا تھا، بولا

"اے معصوم شیطان! حضرت میر باز شاہ ہیں اپنے حجرے میں یہاں مجھے روکنے والا کوئی نہیں، نکال میرا اندرانہ،،

میں نے جیب سے تین روپے ۸، ۷ پیسے نکال کر اس مجھول کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے، اس نے مٹھی بند کی اور آسمان کی طرف منھ کر کے دو تین بار ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور پھر چھلانگیں مارتا اور ہنستا ہوا بھاگ کر گلی سے باہر نکلا اور اوجھل ہو گیا۔

میں اس مجذوب کامل سے مٹھ بھیڑ کے بعد اس قدر متحیر تھا کہ دائیں ہاتھ کی جو سر کی انگلی دانتوں میں دبائے سورج کے سامنے آدھ بزاں ہو گیا، میں اتنی دیر کھڑا رہا کہ پسینے کی بھاپ نے مجھے نیم برشت کر دیا۔ اگر میں دس منٹ مزید کھڑا رہتا تو میرے بالوں میں کتری ہوئی پیاز ڈال کر آملیٹ بنایا جا سکتا تھا لیکن اس لمحے کی آمد سے پہلے میرے ماموں کے گھر کا پالتو کتا "رونس" آ کر میرے پاؤں سونگھنے لگا اور میرے ماموں زاد بھائی وسیم نے آ کر مجھے گلے لگا لیا، میرا پسینے میں ابلا ہوا بدن اس کی بانہوں میں جمع ہو گیا اور ہم دونوں ایک ساتھ چاروں ٹانگوں سے چلتے، دہلیز عبور کر کے ڈیوڑھی میں گئے، ڈیوڑھی سے نکل کر آنگن میں پہنچے اور آنگن سے اس کمرے میں داخل ہوئے جو بیک وقت کچن اور ڈائننگ تھا۔ جہاں میری ممانی ایک پیڑھی پر بیٹھی تکیے کے غلاف پر پھول کاڑھ رہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا میرا عرق عرق ماتھا چوما اور پھر میری ماں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ان کے نصف سر میں درد رہتا ہے جو طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ طلوع ہوتا ہے اور غروب کے ساتھ ساتھ غروب ہو جاتا ہے۔ ممانی نے "اوہو" کی ایک لمبی حیرت کے ساتھ دائیں ہاتھ کی جو سر کی انگلی اپنی ناک پر رکھ لی۔ اس انگلی کے ساتھ انگوٹھا چٹکی بنا رہا تھا اور چٹکی میں سوئی تھی جس کے تاگے سے فیروزی رنگ کا دھاگہ نکل کر عموداً لہرا رہا تھا۔

انھوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا، میرے لیے چھاچھ پتلی کر کے لائیں اور دھات کا قلعی شدہ گلاس مجھے دیتے ہوئے بولیں "چل، شام کو میں تمہیں حضرت میر باز شاہ سے تعویذ لے دوں گی جس سے تمہاری ماں کا نصف سر کا درد جاتا رہے گا۔

"حضرت میر باز شاہ؟" میرے سر میں ایک زور کی دھول جمی اور پورا سر درد کرنے لگا

"ممانی جی،، میں نے چیخ کر کہا

"اے ہے"، کیا ہوگیا ہے جو جو تمہیں،، ممانی گھبرا کر بولیں۔

ارے ممانی، وہی میر باز شاہ ناں، جو برگدوں کے پاس مسطح چٹان پر بنے حجرے میں رہتے ہیں، جن کے پاس ایک مجہول صورت آدمی رہتا ہے جو جیب میں پڑے پیسوں کی صحیح گنتی دور سے بتا دیتا ہے''

تب ممانی نے بتایا کہ حضرت میر باز شاہ بڑے صاحبِ کرامت بزرگ ہیں جو علم غیب رکھتے ہیں، چنیوٹ شہر ان کے دم سے قائم ہے۔ جس کو گالی دیدیں اس کی بگڑی بن جاتی ہے اور جس کو برا بھلا کہہ دیں اس کی تقدیر سنور جاتی ہے

سورج چناب کے دونیم دھارے پر تعمیر شدہ دو منزلہ پُل کے پیچھے چھپنے کی کوشش میں مگن تھا اور گہرے عنابی رنگ کی شعاعوں سے بنا آنچل مغربی بن پر پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنی ممانی اور وسیم کے ساتھ حضرت میر باز شاہ کی خانقاہ کی طرف قدم قدم چل رہا تھا۔ میرا سر عجز سے خم تھا اور میرے پاؤں اس مضبوطی سے آگے کی طرف جم کر پڑ رہے تھے جیسے میں کسی نشیب میں اترتے ہوئے نہایت چوکسی سے پھونک پھونک کر قدم دھر رہا ہوں

ممانی نے کہا تھا کہ میں یَا وَدُودُ کا وِرد کرتا چلوں، میں نے اعتراض کیا تھا کہ باوضو نہیں ہوں۔ اس لیے نہیں کر سکوں گا تو ممانی نے کہا، نہیں، حضرت فرماتے ہیں، زبان ہمیشہ پاک ہوتی ہے، اس لئے یا وَدُودُ کا ورد کیا جا سکتا ہے یا وَدُودُ۔ اے محبت کرنے والے، اس اسم کی خلوت وجلوت ایک ہے۔'' چنانچہ میں یا وَدُودُ پڑھتے ہوئے دھیرے دھیرے برگدوں کے اس کہستانی سلسلے کے پہلو میں اپنے دو گواہوں کے ہمراہ چل رہا تھا۔ گواہ کے بارے میں ممانی نے کہا تھا کہ حضرت کے ارشاد کے مطابق ہر فرد دوسرے کا گواہ ہے

ہمارے خانقاہ تک پہنچنے تک سورج نے آنکھ میچ لی تھی۔ اندھیرے کی ایک مہین سی تہ آفاق سے اترتی ہوئی ہمارے قافلے کو بھی اپنے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ ہم جب برگدوں کے جھنڈ کا چکر کاٹ کر خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو وہاں صفیں بچھی تھیں اور مغرب کی نماز ہو رہی تھی لوگ جماعت میں تھے، امام سمیت سب کی تعداد گیارہ رہی ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ امامت کا منصب خود حضرت میر باز شاہ نے سنبھالا ہوگا لیکن نہیں،" وسیم نے بتایا کہ آپ تو اگلی صف میں سب سے داہنی جانب کھڑے ہیں۔" میں نے نگاہ دوڑائی، ایک دوہرے بدن کا آدمی جس کا سر کندھوں پر آگے کی جانب جھکا تھا، سفید براق داڑھی سینے پر پھیلی تھی، دونوں ہاتھ

پیٹ پر بندھے تھے اور سر پر سفید رنگ کی دستار تھی، محو قیام تھا۔ اس صفِ عابداں سے چند گز پیچھے ایک جامن کا پیڑ تھا، جس کے نیچے چارپائی بچھی تھی، ممانی وہیں رک گئیں اور ہم دونوں آگے چل دیئے۔ نمازی رکوع میں چلے گئے تھے۔ ہم ان کے پاس سے گزرے تو حضرت نے نیت توڑ دی اور صف سے باہر نکل آئے، وسیم نے آگے بڑھ کر سلام کیا، انہوں نے نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، میں نے بھی السلام علیکم کہا انہوں نے میرا بازو تھام لیا، نہایت شیرینی سے سلام کا جواب دے کر میرا نام پوچھا اور پھر ہمارے شانوں پر ہاتھ رکھ کر حجرے کی طرف لے چلے۔ حجرہ کیا تھا ایک کشادہ اور گہرا کمرہ تھا جسے پہاڑی کاٹ کر نشیب میں تراشا گیا تھا، اس کمرے میں بھاری گدوں پر چادریں بچھی تھیں، دیواروں کے ساتھ لحاف تہ کر کے پشت کی ٹیک لگانے کے لیے سہارے بنائے گئے تھے۔ حضرت ایک گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے، ان کے دائیں جانب صراحی رکھی تھی۔ انہوں نے مٹی کے دو پیالے پانی سے بھرے اور ایک مجھے دیا اور دوسرا وسیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا، "ماں جی کو دے آؤ۔"

"ممانی کو یہیں بلا لو نا،" میں نے وسیم سے کہا

"نہیں بیٹے، ہماری بیٹی یہاں نہیں آ سکتیں،" انہوں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔

"کیوں، وہ کیوں نہیں آ سکتیں؟" میں نے متحیر ہو کر پوچھا

"فقیر کی کٹیا میں عورت کا کیا کام" نہایت خنک اور بھرپور لہجے میں جواب دیا گیا۔

میں چپ رہ گیا۔ وسیم پانی لے کر جا چکا تھا، انہوں نے مٹی کے تیل کا چولھا جلایا اور اس پر پانی چڑھا دیا۔ میں کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔

"پانی پیو، اندیشوں اور فکروں کو جھٹک دو" مجھ سے کہا گیا

"لیکن، حضرت آپ نے نماز کیوں توڑ دی، اسے تو پوری کر لیتے،" میں نے پانی کا پیالہ تھامے تھامے کہا۔

"بیٹے عبادت کی قضا موجود ہے لیکن خدمت کی کوئی قضا نہیں، آپ آئے، اللہ کے پیارے محوِ صلوٰۃ تھے، آپ کی خدمت کے لیے میں یہاں آ گیا ہوں،" آپ نے مسکراتے ہوئے کہا

میں نے حضرت کے چہرے پر نگاہ ڈالی، ان کی غلافی آنکھوں میں ہلکے شربتی رنگ کی شیرینی تھی، پیشانی اتنی کشادہ کہ پورا چاند سما جائے، چہرے پر مسکراہٹ کا ایک موسم تھا جو سدا

جوان دکھائی دیتا۔

وسیم واپس آگیا تھا، چائے کا پانی کیتلی میں گنگنانے لگا تھا، آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور جھومتے ہوئے یا وَدود کہنے لگے، ان کے لہجے میں ایک عجیب ترنم تھا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کیتلی میں پتی اور چائے ڈالی اور پیالے بھر بھر کر ہمارے آگے رکھ دیئے۔ اتنے میں نمازی ایک ایک کر کے سلام علیک کہتے حجرے میں داخل ہونے لگے۔ آپ ان سب کے سلاموں کا جواب دیتے جاتے اور مسکرا مسکرا کر پیالے بھرتے جاتے اور تقسیم کرتے جاتے۔

لوگ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لگا کر بیٹھ رہے تھے، میں نے نگاہ دوڑائی اور ان سب کے چہروں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ یہ لوگ ہماری سماجی زندگی کی بیداوار نہیں لگتے تھے۔ اس کے برعکس ان کے چہرے کسی شاداب جنگل کی گہری سبز روئیدگی کی طرح تروتازہ تھے اور آنکھوں میں ایک گہرا خمار۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص نے جو میرے پہلو میں تھا میرے کان میں کچھ کہا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا"

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر تیزی سے شی کہا اور بولا، "سرگوشی کرنا شیطان کا کام ہے"۔ حضرت ایک لمبوتری داڑھی والے سبز پوش کو چراغ روشن کرنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ مغربی دیوار کے عین وسط میں ایک تابدان بنا تھا جس پر مٹی کا دیا رکھا تھا، اس میں سرسوں کا تیل ڈال کر جلا دیا گیا۔ برقی روشنی کے باوجود اس دیئے کی موجودگی میرے لیے ایک سوالیہ نشان تھی لیکن حضرت نے فرمایا، "یہ بزرگان دین کا چراغ ہے"، تب مجھے وئید وں میں اگنی کا تقدس یاد آیا۔ وہی شعلہ، وہی سلسلہ، وہی روایت "ایک نئے روپ میں" چائے کے بعد، حضرت، ممانی سے پرسش احوال کے لیے، مجھے ساتھ لے کر جامن کے پیڑ کی طرف چل دیے، وہیں پر تعویذ لکھا گیا، جسے ممانی نے اپنے دوپٹے کے ایک گوشے میں تہ کر کے باندھ لیا۔ اس کے بعد حضرت اٹھ کر جانے لگے تو فرمایا، "بیٹی ہم کھانا بھجواتے ہیں، کھا کر آپ لوگ گھر کو روانہ ہو جانا، ایک آدمی آپ کے ہمراہ جائے گا"

لمحہ بھر میں مٹی کے پیالوں میں سبزیوں کا سالن اور گرما گرم تندوری روٹیاں چن دی گئیں، حضرت خود لنگر تقسیم فرما رہے تھے، اور وہ مجہول ایک کونے میں کنڈا کان پر ہاتھ رکھے گا رہا تھا۔

اِٹ کھڑے ڈکڑ و نجے تپدار ہوئے ۔ جلہا
یار بہ رکے کھاندے جاون ، نجدا اہو ہوئے بلہا

سب اہل حلقہ کھا چکے تو برتن سمیٹنے کے لیے وہ مجہول آگے بڑھا، کچھ لوگ دوبارہ دیواروں کے ساتھ جم گئے، حضرت تکیے سے ٹیک لگاکر بیٹھ گئے تھے اور کچھ لوگ پتھریلی چٹانوں کے آس پاس چہل قدمی کر رہے تھے ۔

دریں اثنا حضرت ایک شخص سے مخاطب ہوئے ۔اس ادھیڑ عمر آدمی کا رنگ گہرا سانولا، آنکھیں روشن اور بڑی، سر پر جناح کیپ ، ٹھوڑی پر نوکدار سفید فرنچ کٹ اور پتلی پتلی سفید مونچھیں ۔ یہ گہرا سانولا آدمی سفید بالوں کی آرائشی ڈاڑھی مونچھوں کے ساتھ کسی تھیٹر کی چیز لگ رہا تھا، اس نے ملیشیا رنگ کا شلوار کرتا پہنا ہوا تھا اور اپنے سڈول بدن کی بنا پر ایک آبنوسی چٹان کی طرح نظر آتا تھا ۔

حضرت گویا ہوئے ، "تسکین شاہ جی ! ہمارا بیٹا حافظ آباد سے مہمان آیا ہے ، انھیں کچھ سناؤ" حضرت نے میری طرف اشارہ کرکے کہا ۔

تسکین شاہ صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے گھٹنے ٹیک کر آگے کو سرکے اور ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا ۔ فرمانے لگے ، "خاکسار کو تسکین خانقاہی کہتے ہیں ، میرے باپ کا نام اسلام ہے میری ماں کا نام پاکستان ہے ، میری نانی کا نام ہندوستان ہے اور میں حضرت کے پیروں کی مٹی ہوں ،" میں نے ہاتھ ملایا جو انھوں نے اپنے پھولے پھولے ہاتھ کی ہتھیلی میں اس شدت سے بھینچا کہ میری چیں بول گئی ۔

اس پر ایک گوشے سے مجہول کی ہنسی سنائی دی جو بغلیں بجا بجا کر جھوم رہا تھا ۔ حضرت نے اس کی طرف دیکھا اور بولے "مستان ! یہ تین روپے ۸۷ پیسے بول رہے ہیں" یہ سن کر اس نے ایک قلقاری مزید پھینکی اور پھدک کر کمرے سے باہر نکل گیا ۔ سب لوگ مسکرا رہے تھے ۔

"ہاں تو تسکین شاہ جی !" حضرت نے پھر اشارہ کیا
تسکین خانقاہی نے آنکھیں بند کرلیں اور ترنم ریز ہونے کے لیے گنگنانے لگے ۔

زندگی صفر کے سفینے میں
موت ، سورج کے آبگینے میں
لحظہ لحظہ صدف کو بھر دے گی

روشنی درد کے مہینے میں
تیرے زہد و ورع سے بہتر ہے
میری آوارگی مدینے میں
کون کہتا ہے فرق ہے کوئی
مے کے پینے میں اور جینے میں

اچانک حضرت نے دو تین بار دائیں ہاتھ سے زمین کو تھپتھپایا، ترنم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہر طرف چپ کی مہک اڑنے لگی، سکوت کی قوس و قزح کچھ اور بھی خم کھاگئی۔ حضرت کا چہرہ گہرا سرخ ہوگیا، آنکھوں کی مستی اور بھی سوا ہوگئی۔ آپ نے فرمایا، "صاحبو! جان لو، زندگی صفر کے سفینے میں، یہ صفر کیا ہے؟ یہ الف کا آغاز ہے، الف کا انجام ہے الف ایک صفر سے شروع ہوکر ایک صفر پر ختم ہوتا ہے، یہی الف اس صفر کا سفر ہے، جو اس صفر کی حدوں سے باہر نکلا، وہ خیر کی حدوں سے غیر کی حدوں میں چلا گیا، اس لیے صاحبو! فرمایا بزرگانِ دین نے، جو حکم میں رہتا ہے وہ حفاظت میں رہتا ہے۔

اکو الف تیرے درکار
علموں بس کریں او یار

ہاں تسکین شاہ جی!
تسکین شاہ پھر سے رواں ہوگئے

ہے جمالِ شبِ وصال عیاں
موسمِ گل ترے قرینے میں

حضرت نے پھر اپنے پہلو کی زمین بجاکر غزل کا سلسلہ توڑ دیا تھا۔

صاحبو! ہے جمالِ شب .... یہ جمال کیا ہے؟ جان لو کہ جمال رنگ و بو کی موزونیت اور اعضا کے تناسب کا نام نہیں جمال تو ہدایت کو کہتے ہیں اور ہدایت کے معنی نور کے نکلتے ہیں۔"

غزل پھر شروع ہوگئی

زندگی صفر کے سفینے میں
ہے کتاب و شنید بھی مسدود
غرق اک [illegible]

نوٹ "حضرت نے للکار کر فرمایا "مہر لگا دی ہے۔ بزرگان دین نے" کتاب کے سارے الفاظ لوحِ محفوظ کو واپس لوٹا دیئے گئے ہیں، اوپر اٹھا لیے گئے ہیں۔ کسی ساشتر میں کسی وید میں، کسی مصحف میں کسی زبور میں، کسی انجیل میں کوئی پیغام، ان زمینوں کی پشتوں پر باقی نہیں رہا۔ صاحبو! یہ کتاب و شنید کا نہیں، خاموشی سے عمل کا وقت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی حضرت بھی اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے، باہر سے اذان کی آواز آ رہی تھی،

حَیّ عَلَی الفَلاح، حَیّ عَلَی الفَلاح

جواباً کئی لوگ اَللّٰھُمَّ لبیک کی پکار کر رہے تھے

حضرت کی ہدایت پر ایک شخص ہمیں گھر پہنچانے کے لیے ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوا جس کے بائیں ہاتھ میں جلتی ہوئی لال ٹین، دائیں ہاتھ میں لاٹھی اور سر پر بھاری بھرکم پگڑی تھی۔

ہم اجازت لے کر اپنے گھر کی جانب چل دیئے۔

چند دن چنیوٹ میں گزار کر میں واپس ضلع گوجرانوالہ میں واقع اپنے گاؤں کو لوٹ گیا لیکن حضرت میر باز شاہ کی یاد کبھی نہ کبھی وہاں بھی آجاتی، وہ درویش خدا مست مجھے ایک عجیب اور برگزیدہ ہستی لگے تھے جب بھی چنیوٹ سے کوئی قریبی رشتہ دار یا دوست ملنے آتا تو میں ان سے حضرت کے بارے میں ضرور استفسار کرتا۔ وہ کوئی نہ کوئی کہانی کہتے یا حضرت کا ایک آدھ قول سنا دیتے۔ خاص طور پر حضرت کی کہی ہوئی یہ بات بہت سوں سے سنی کہ

"صاحبو! جان لو، قول نہ سچا ہوتا ہے نہ جھوٹا، وہ صرف عمل کی گواہی سے سچا یا جھوٹا قرار پاتا ہے"

ایک بار تو ایک شخص نے ایسی حیرتناک خبر سنائی کہ میں بھونچکا رہ گیا، اطلاع یہ تھی کہ حضرت میر باز شاہ لاپتہ ہیں، ایک شام وہ نماز مغرب کی امامت کے لیے خود مصلّے پر قیام فرما ہوئے اور پھر اپنے مقتدیوں کو سجدے میں گرا چھوڑ کر کہیں چلے گئے اور لوٹ کر نہیں آئے، دراصل سب لوگ سجدے میں تھے اور جب کتنی دیر تک حضرت نے اللہ اکبر نہ کہا تو کسی نے سر اٹھا کر دیکھا، سجّادہ خالی تھا، امام صاحب تحلیل ہو گئے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے حضرت کا اتہ پتہ پوچھتے لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ جاتے وقت حضرت اپنا جُبّہ اور عمامہ بھی مصلّے پر ہی چھوڑ گئے تھے

اگلے برس موسم گرما کی چھٹیوں میں چنیوٹ جانے کا اتفاق ہوا، تو پھر بس سے اتر کر اسی راستے

سے گزرا، ذہن میں اس خانقاہ کی وہ پرانی محفلیں ابھی تک تازہ تھیں۔ رہ رہ کروہ برگزیدہ صورت آنکھوں میں گھوم جاتی۔ اب وہاں کون لوگ ہوں گے، پہاڑی چٹانوں کے اس برگذار تک پہنچتے پہنچتے مین ذہنی طور پر جانے کتنی اذیت سے گزر چکا تھا لیکن برگدوں کے قریب پہنچا تو مجھے گھنگروؤں کے بجنے اور کورس میں مردانہ گانے کی آوازیں سنائی دیں، خانقاہ کے نواح میں بہت سے لوگ دکھائی دیئے۔ کوئی ہنگامہ سا ہنگامہ تھا، قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہاں تو جشن کا سماں ہے، ایک طرف کچھ ملنگ کچھ سبز پوش فقیر پاؤں میں گھنگھرو باندھے دھمال کے حلقے میں محو تھے۔ گانے والے گا رہے تھے۔

اٹھ بھنگیا اُٹھ جاگ سویرے
لیئے اللہ داناں فقیراں کھنگ گھوٹ لئی
گھوٹ لئی

"گھوٹ لئی" کی آواز کے ساتھ وہ سر کو دائیں بائیں گھماتے تو لمبے بالوں کے اڑتے ہوئے بادل ایک برق رفتار تصویر چھوڑ جاتے۔ یہ تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں اور رقص جاری تھا، ڈھول پیٹا جا رہا تھا، چمٹے بج رہے تھے۔

میں نے رک کر ادھر اُدھر دیکھا، اجنبی لوگوں کے درمیان کہیں وہ مجہول دکھائی دیا جس نے لمبا سبز چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر چار خانے کا سبز ہی رومال تھا۔ اچانک ہماری نظریں ملیں اور وہ بازو جھٹکا کر مسکرا کر میری طرف بڑھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آؤ، آؤ، حضرت سے ملو"

"کیا حضرت لوٹ آئے"؟

"نہیں حضرت تسکین خانقاہی سجّادہ نشین"

میری نظروں میں وہ سفید مونچھوں اور داڑھی والا سانولا سلونا، موٹا تازہ آدمی گھوم گیا جس کی صورت اسٹیج کے اداکاروں جیسی تھی۔

حجرے کے دروازے پر چلمن کے بجائے ٹاٹ کا پردہ تھا، کھڑکی سے دھواں مسلسل اٹھ کر سرمئی مرغولوں میں پرواز کر رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس مجہول نے آواز لگائی۔ "روشنی والے، روشنی والے"

حجرے میں سے بہت سوں نے بیک آواز جواب دیا، "روشنی والے، روشنی والے"

دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے، تسکین خانقاہی کی ڈاڑھی اب پورے رخساروں کو ڈھانپے

رہی تھی، اس کی آنکھوں کی سرخی اور گہری ہو گئی تھی۔ زمین پر کوئی گدا یا دری نہیں بچھی تھی، خاکی فرش کے وسط میں ایک دھونی تھی، دھونی میں لکڑیاں جل جل کر راکھ ہو چکی تھیں اور کمرے میں کو کنار کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ دو چار پوستی آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ حضرت تسکین شاہ کے پہلو میں ایک دھان پان سی عورت سمٹی سمٹائی دھواں دیتی لکڑیوں کو پھونکوں سے جلانے میں لگی تھی، اس کے کھلے بال پشت پر بکھرے تھے۔ عورت کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے میں ساکت رہ گیا۔ میرا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا۔ "شیر کی کچھار میں عورت کا کیا کام" مگر شیر اب کچھار میں تھا ہی نہیں۔ پھونکوں کے بل پر جب دھواں دیتی لکڑی نے شعلہ پکڑا تو عورت نے ناک سے شُڑ شُڑ کی آواز نکال کر بہتی آنکھوں کو ہتھیلیوں کے کناروں سے پونچھا۔ ادھر تسکین شاہ مجھے ہاتھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ کر کے بولے "تو پھر کیا ہوا دیندار جی!"

"ہوتا کیا شاہ جی، بس ماسٹر گام نے افضل مکوڑا کی بات سن کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔"

"بس، بس، جھوٹ پکڑا گیا ہے، یہ فلک شگاف قہقہہ کیا ہوا، یہ کیا لسانی فساد برپا کر رکھا ہے، ببر علی"! انہوں نے کسی کو زور سے پکارا

"اے ببر علی پٹھان!"

"جی شاہ جیوے" ایک کونے میں گٹھڑی بنے ایک بھاری بھر کم آدمی نے آنکھ کھول کر کہا

کیا ہے یہ فلک شگاف قہقہہ، ہوتا کیا ہے یہ؟ ذرا لگانا تو ایک آواز" شاہ جی نے کہا وہ گٹھڑی کھل گئی اور عموداً پھیل گئی، ایک گرانڈیل آدمی تھا، چٹان جیسے تن و توش کا۔ اس نے دونوں بازو پھیلا کر ایک اتنا کڑا کے دار قہقہہ لگایا کہ حجرے کی دیواروں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تب تسکین شاہ نے مجھ سے کہا۔ "ذرا بچو جی، باہر نکلنا اور دیکھنا آسمان کی طرف کہ کہیں سوراخ یا شگاف دکھائی دیتا ہے؟"

میں ایک عالم استعجاب میں ان کے منہ کو تکتا اٹھا اور ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر دیکھا آسمان اپنی جگہ بدستور تھا، مجھے ہنسی آ گئی

"ہاں دیکھا کوئی سوراخ"، تسکین شاہ نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"نہیں تو"۔

"تو پھر یہ فلک شگاف قہقہہ کیا ہوا؟" وہ رانوں پر ہاتھ مار کر گڑکے۔

"سب غلط، بالکل غلط، میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ یہ سارا فساد ہی اردو زبان کا ہے۔

ہاں تو دینداری پھر کیا ہوا"

"ہوتا کیا شاہ جی، آپ تو بات ہی نہیں کرنے دیتے، زبان کوئی ہم نے بنائی ہے۔ آپ تو بے فضول گیہوں کے ساتھ گھن پیس رہے ہیں۔"

"ہے، ہے" شاہ جی پھر رانوں کو پیٹ کر چنگھاڑے

"یہ کیا بد کلامی ہے، حضرت میر باز شاہ کے مجاور کے آس پاس، یہ گیہوں کے ساتھ گھن پیسنے کی بات۔ ارے کوئی نہیں جانتا کہ گیہوں اناج ہے اور گھن کیڑا۔ دونوں کو ایک ساتھ مت پیسو، ایک تو تشدد اور پھر اوپر سے ملاوٹ۔" شاہ جی بولے اسے کہتے ہیں ایک کریلا اور دوسرا نیم چڑھا" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اس پر شاہ جی کھیں کھیں کرکے ہنس پڑے بولے "یہ لیجیے ان کے منہ میں بھی زبان آگئی دینداری کو دیکھ کر ۔۔۔ ارے دینداری یہ ہیں تیرے مرید با صفا"۔

دینداری نے نظر بھر کر مجھے دیکھا، "یہ تو گاؤں کا گنوار چھوکرا دکھتا ہے"

"ارے ہے تو دکھتا ہے" شاہ جی نے ہتھیلی لہرا کر کہا۔

حجرے کی اندرونی فضا میں یہ کیفیت دیکھ کر میں حیران تو بہت ہوا مگر یہ منظر بے حد ڈرامائی لگا۔ میں اٹھنے لگا تو شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کو کہا۔ تب انھوں نے پہلو میں رکھی بغچی میں سے ایک ڈبہ نکالا، کھولا اور میری طرف بڑھایا، "تبرک" انہوں نے کہا میں نے برفی کا ٹکڑا اٹھایا اور کھانے لگا۔

"کب آئے گاؤں سے" شاہ جی نے پوچھا

"ابھی آرہا ہوں بس" عرض کیا

"اچھا تو پھر نکل لو اس وقت گھر کو، اور آتے رہا کرو" حکم ملا

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

شہر کے لوگ کہتے تھے کہ اب خانقاہ کا وہ پہلے جیسا وقار باقی نہیں رہا۔ کچھ تسکین شاہ کے بارے میں کہتے کہ یہ تو حجرے ہوئے باغ کا گلہری پٹواری ہے۔ کچھ لوگ اسے کو کنار کا خوگر بتاتے

اور تسکین پوستی کہہ کر بات کرتے۔ کچھ سادہ لوح ان کا بھی اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا حضرت میر باز شاہ کا۔

میں اگلے روز سہ پہر کے وقت وسیم کے ہمراہ حجرے پر پہنچا تو اندر سبھی لوگ بڑی گرم جوشی سے بات چیت کرتے نظر آئے۔ آگ پر ہنڈیا چڑھی تھی اور دیندارنی کچھ پکا رہی تھیں۔

ہم سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ تسکین خانقاہی نے ہمیں نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے آشیر واد دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر پکارے، ''دیندارنی پک گئی اوجھڑی۔''

دیندارنی نے مٹی کی ہنڈیا سے ڈھکنا اتارا اور چمچے سے ایک مٹیالا سا اوجھڑی کا ٹکڑا نکال کر دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے پکڑ کر کھینچا اور بولی، ''یہ تو آج گلنے والی نہیں، یہ ببر علی پٹھان بھی جانے کیسی بکری کی اوجھڑی لایا ہے جو شاید لوہا کھاتی تھی۔ آگ جلا جلا کے تھک گئی ہوں گلتی ہی نہیں۔

''آلینے دو اس ببر علی پٹھان کو، اس نے یاروں سے دغا کیا ہے، نہیں جائے گا یہ جنت میں، کہہ دیا ہے تسکین فقیر نے۔''

اگلے لمحے ببر علی پٹھان ''یا علی مدد'' کہتے اندر داخل ہوئے تو تسکین شاہ نے انھیں پھٹکارا، ''ہے موذی! یاروں سے بھی دغا، ببر کیا لوہے کی اوجھڑی لائے ہو جو گلتی ہی نہیں۔''

''لوہے کی اوجھڑی۔ مگر وہ اوجھڑی تو وہاں کھونٹی پر ٹنگی ہے، تم پکا کیا رہے ہو بابا شاہ'' ببر علی پٹھان نے کہا

ہم سب کی نظریں ببر علی کی انگلی کے ساتھ گوشے کی طرف گھوم گئیں جہاں ایک کھونٹی کے ساتھ سبزی مائل سفید گوشت کی اوجھڑی لٹک رہی تھی۔

''تو ہنڈیا میں کیا ہے دیندارنی'' شاہ جی نے پوچھا

ببر علی آگے بڑھے، ڈھکنا اتارا اور چمچے میں ایک ٹکڑا نکال کر دیکھا اور چیخے، ''ہو گئی کہانی، شاہ بابا، دیندارنی تے تولیہ کاٹ کر ہنڈیا میں چڑھا رکھا ہے''

''اوئے تیرا ناس جائے دیندارنی، پوست کی ترنگ میں تولیے اور اوجھڑی کا فرق ہی نہیں رہا۔''

ببر علی بری طرح ہنس رہے تھے، دیندارنی خاموش تھی، ایک کونے میں ماسٹر گام گٹھڑی بنے پڑے تھے۔ تسکین شاہ رانوں پر ہاتھ مار کر ''حق ہے، حق'' کی گردان کر رہے تھے

اچانک انھوں نے کہا "کچھ جل رہا ہے، بڑی دیر سے گوشت کے جلنے کی بو سی آرہی ہے، میں سمجھا او جھڑی ہے"۔

"ارے شاہ بابا، تمہارا گھٹنا، اسے آگ میں جھونک رکھا ہے اور کھال جل رہی ہے"، ببر علی نے کہا۔

سچ مچ تسکین شاہ کا ایک گھٹنہ دھونی میں گڑا تھا اور اس کی کھال جل چکی تھی لیکن شاید کوکنار کے نشے میں بدن اس طرح سن ہوگیا تھا کہ اپنے جلنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

انھوں نے اپنا گھٹنہ دھونی میں سے نکالا اور اسے جھاڑ کر بولے "دیندارنی! تیری اوجھڑی پکے نہ پکے میرا گھٹنہ پک گیا ہے"

"ہوں" دیندارنی نے اونگھتے ہوئے کہا۔

اگلے لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی اور پکارا "شاہ بابا!"

"بول" شاہ جی نے آنکھیں بند کئے نعرہ لگایا۔

"افضل مکوڑا کی وفات ہوگئی" آواز آئی

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ جنازہ کب ہے؟"

"صبح سات بجے"

"اچھا تو بھائی سب لوگ چلیں گے، ہمارا یار تھا بےچارہ"، شاہ جی نے کہا

حجرے کی فضا سوگوار ہوگئی تھی۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر اٹھ کر چل دیئے

"کیا تھا کیا ہوگیا"، وسیم نے کہا

"ہاں" میں نے جواب دیا

اگلی شام پھر حجرے پر پہنچے تو شاہ جی اونگھ رہے تھے، دیندارنی سو رہی تھی اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم نے دروازہ کھولا تو آہٹ سن کر شاہ جی بولے "ارے کون؟"

"ہم ہیں" وسیم نے کہا

"ارے میاں! صبح سات بجے ہمارے یار افضل مکوڑا کا جنازہ ہے، تم بھی ضرور آنا ساتھ چلیں گے"

"مگر شاہ جی"

"مگر کیا، یاروں کے سفرِ آخرت میں شرکت ضروری ہے بچو!"

"مگر شاہ جی جنازہ تو آج صبح اُٹھ چکا، وفات کی خبر کل شام ملی تھی" وسیم نے کہا

"کیا؟" شاہ جی نے سر اٹھایا

"جی ہاں، اُن کا جنازہ تو آج صبح اٹھا تھا" میں نے کہا

"دیکھ لیا دیدارنی" شاہ جی بولے "دغا دے گیا یہ مکوڑا، یاروں کی دعا کلام کے بغیر ہی چلا گیا، تھا ہی ایسا"

ہم نے یہ سُنا اور بغیر کچھ کہے سنے حجرے کے دروازے سے نکل کر چل دیئے اور شاہ جی آہیں پکارتے رہ گئے۔

خانقاہ کی بربادی نے طبیعت پر ایک عجیب تاثر مرتب کیا تھا، رہ رہ کر حضرت میر باز شاہ یاد آجاتے، کیا تھا، کیا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے جتنے دن چینوٹ میں قیام کیا کبھی اس حجرے کا رُخ نہ کیا اور جب واپس گاؤں جانے کا قصد کیا تو بس اسٹینڈ تک جانے کے لیے وہ راستہ بھی اختیار نہ کیا تھا۔

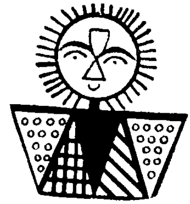
ایک سال کا عرصہ یوں ہی بیت گیا میں تسکین شاہ کے بارے میں سب کچھ بھول گیا، البتہ کبھی کبھی حضرت میر باز شاہ یاد آجاتے یا ان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگتیں۔ میں بی اے کا امتحان دے کر گاؤں آگیا تھا۔ ان ہی دنوں وسیم کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ ستمبر کی ایک خوش گوار صبح کو ہم لوگ چینوٹ پہنچے، میں، میری دونوں بہنیں اور والدین۔ ہم سب خانقاہ والے پرانے راستے سے گزرے، اچانک میں حیران سا ہو کر اس جگہ کو دیکھنے لگا، جہاں کبھی حجرہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں اب ایک بے سقف کھنڈر تھا جس کے دروازے اور کھڑکیاں نابید تھیں، میں نے آنکھوں پر ہاتھ کی اوٹ بنا کر بغور دیکھا، ایک کُتا دروازے کے شگاف سے باہر آرہا تھا، میں دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ گھر کے دوسرے افراد آگے نکل گئے تھے، اچانک ایک شناسا صورت برگد کی اوٹ سے نکلی اور میرے قریب آگئی۔ یہ وہی مجہول تھا، جس نے کبھی میری جیب میں موجود رقم کی صحیح گنتی بتا دی تھی۔

"مستان! یہ سب کیا ہوا"

"صغر سعیدہ غرقاب ہو گیا۔ حضرت میر باز شاہ نے ایک روز نزول جلال فرمایا تھا اور شیر کی کچھار میں عورت کو دیکھ کر، واپس لوٹ گئے اور جس دن وہ آئے، اسی رات اس حجرے نے اچانک آگ پکڑ لی آگ جو اسی کی نشانیوں میں سے ایک ہے، سب جل گئے، انھیں قبر بھی نصیب نہ ہو سکی"۔

مستان نے آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھا اور، برگد کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

شردن کمار ورما



تتلی

میں برسوں بعد ادھر آیا ہوں

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسٹ ہاؤس کی اونگتی سی عمارت اور کسی فلسفی کی طرح گہری سوچ میں ڈوبے۔ بوڑھے پیپل والے موڑ کے بیچ یہ دومنزلہ، خوب صورت مغربی طرز پر بنا ہوا مکان کہاں تھا پہلے! سڑک کے کنارے جنگلی جھاڑیاں، جن میں پیلے، نیلے گلابی پھول کھلا کرتے تھے، دور تک چلی گئی تھیں اور بانس کے جھنڈ تھے اور ان کے پیچھے پہاڑوں تک پھیلے ہوئے کھیت، جن پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا میں تازگی اور جنگلی مہک ہوا کرتی تھی۔

بانسوں کے جھنڈ سے لپٹا ہوا راستہ۔ کھیتوں سے نکل کر پہاڑ کے قدموں تک چلا گیا تھا اور وہاں جیسے ٹھہر کر اوپر سرجو کے مکان کی طرف چلا گیا تھا — سرجو نے اپنے کھیت سے توڑ کر مجھے بھٹہ دیا تھا۔ دودھیا اور میٹھا — میری آنکھوں میں سرجو کی شبیہ اور زبان پر بھٹے کا دودھیا ذائقہ جاگ اٹھتا ہے — اگر میں جا کر شہتوت کے پیڑ کے گرد بنے چبوترے پر بیٹھ جاؤں تو سرجو گڑگڑی چھوڑ کر آجائے گا اور میرا ہاتھ تھام کر گھر تک لے جائے گا اور مجھے چارپائی پر بٹھا کر خود دیوار کے ساتھ بورے پر جا بیٹھے گا، اس کی بہو تلسی دہلیز پر آکھڑی ہوگی، آنکھوں میں برف سے ڈھکی چوٹیوں کا ان چھوا پن لئے، چہرے پر ہرے کھیتوں کی تازگی اور شادابی لیے اور گوری کلائیوں میں ہرے کانچ کی چوڑیاں چھنکاتی، لمبے کرتے کے چاندی کے بٹن چمکتے ہوئے اور پتلے، گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کسی تتلی کی طرح تھرکتی ہوئی — سرجو کا اکلوتا بیٹا برجو بھی آجائے گا ،

کھڑی مکئی سے نکلتا ہوا قد، گلے میں ریشمی مفلر، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ، ہونٹوں میں دبا سگریٹ، آنکھوں میں تجسّس لیے، جیسے کچھ کھوجتا آرہا ہو۔ جیسے کچھ ڈھونڈنے جارہا ہو۔

پہلی بار ایسا ہی ہوا تھا

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ راستہ اوپر ایک بہت پرانے مندر کی طرف جاتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر واقع شوجی کا یہ مندر اس علاقہ کا سب سے پرانا مندر ہے۔ میں کندھے سے کیمرہ لٹکائے کھیت پار کر کے اس راستے پر۔ اس جگہ ذرا سی دیر کو رکا تھا، جہاں یہ سانپ کی طرح کنڈلی مار کر ٹھہرا سا لگتا ہے، پھر آہستہ آہستہ اوپر گیا تھا، راستے میں جنگلی پودینے کی کیاریاں ملتیں اور فضا میں پودینے کی مہک۔ اس چبوترے پر بیٹھ کر میں نے سگریٹ سلگایا اور اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ سامنے ایک چھوٹا، لیکن صاف ستھرا سا گھر تھا، سلیٹ کی چھت والا، مکان کے باہر جگہ ہموار کر کے صحن بنالیا گیا تھا۔ ایک کونے میں ناشپاتی کا پیڑ کھڑا تھا، قریب ہی گائے بیٹھی جگالی کر رہی تھی، دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بوریے پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص گڑگڑی لیے بیٹھا تھا، پتلا، چوڑے ہاتھ پاؤں والا محنتی اور مضبوط شخص، وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں مسکرادیا۔

گڑگڑی دیوار کے ساتھ ٹکا کر وہ میری طرف آگیا میں کھڑا ہو گیا

"بابوجی، یاتری" ؟

"ہاں، اوپر جارہا ہوں، سنا ہے اوپر بہت پرانا مندر ہے، شوجی کا۔"

اس نے اوپر چوٹی کی طرف دیکھا، جہاں ہرے گھنے درخت پر پھیلا ہوا نیلا، شفاف آسمان تھا۔

"مندر تھا کبھی ـــــ" اس نے حسرت سے کہا

"تو کیا اب نہیں ہے۔؟"

"ہے، دیکھو آؤ، دیکھنے میں کیا برائی ہے، چڑھائی بہت ہے

"تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔"

وہ مسکرایا

"چلوں گا، پر بابوجی، اب وہاں کچھ نہیں رہ گیا۔ میرے دادا اور باپ دونوں روزانہ

صبح و شام اوپر دیا جلانے جایا کرتے تھے، تب میں بہت چھوٹا تھا، میں بھی جایا کرتا تھا ان کے ساتھ۔ کبھی کبھی اکیلا بھی چلا جاتا تھا، تب اچھا لگتا تھا، من کو وہاں جا کر شانتی ملتی تھی، مندر کی صفائی کا کام میرے ذمہ تھا ــــ ان کے بعد ــــ اس نے ناشپاتی کے پیڑ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا ــــ "میرا جانا کم ہو گیا، برجو، میرا لڑکا، کہتا ہے، کیوں بیکار میں، جان کھپاتے ہو، مندروں کی دیکھ بھال سرکار کا کام ہے۔ ایک بار کچھ سرکاری افسر آئے بھی تھے، پوچھتے تھے اوپر جیپ جا سکتی ہے، بھلا یہ بھی کوئی منتا ہوئی، آدمی لگن اور وشواس لے کر آئے تو کوئی بادھا نہیں آتی، میں تو یوں دوڑتا ہوا اوپر پہونچ جاتا تھا، میرا بوڑھا دادا باتیں کرتا چلا جاتا تھا، اس کا کبھی سانس نہیں پھولا تھا، راستے میں بیٹھ کر کبھی سستایا نہیں تھا۔ میں تو بھیڑ، بکریوں سے بھی پہلے پہونچ جاتا تھا، بابو جی وہ لوگ آئے، مندر کے چاروں طرف گھوم پھر کر سگریٹ پھونکتے رہے، پھر وہاں بیٹھ کر بیئر پی، مندر کی دیواروں کو شیشوں سے دیکھتے رہے، رجسٹروں میں کچھ لکھا اور چلے گئے میں نے انھیں اپنی طرف سے مندر کی سیوا کرنے کا وشواس بھی دلایا تھا، بڑے صاحب ہنس کر بولے۔ تم مندر کے پجاری بننا چاہتے ہو ــــ بابو جی انھیں اس طرح مجھے گالی دینے کا کیا حق تھا، میری کئی پیڑیوں نے اس مندر کی سیوا کی ہے، بھولے شنکر ہماری رکھوالی کرتے ہیں، ہمیں اناج دیتے ہیں، ڈھور، ڈنگروں کا پالن کرتے ہیں، میں کیا اتنا کمینہ ہو گیا ہوں کہ ــــ"

میرا سگریٹ انگلیوں میں دبے دبے ہی راکھ ہو گیا تھا، آپ سے آپ میرا ہاتھ سرجو کے کندھے تک چلا گیا تھا

●

"بابو جی، چا، پی لو، پھر چلتے ہیں ــــ"

"چا، واپسی پر پئیں گے ــــ"

"جیسی آپ کی اچھا ــــ"

●

وہ پھرتی سے گھر کے اندر گیا، جلدی جلدی تلسی کو کچھ ہدایات دیں اور ہاتھ میں پوجا کی تھالی اٹھائے آ گیا

"چلو بابو جی ــــ"

ہم آہستہ آہستہ، باتیں کرتے ہوئے اوپر چڑھتے گئے۔ خاصی سیدھی چڑھائی اور دشوار

راستہ تھا۔ جانے پچھلے زمانے میں یہ مندر ایسی جگہوں پر کیوں بنائے جاتے تھے، شاید لوگوں کا امتحان لینے کے لیے، ان کا صبر آزمانے کے لیے، سرجو بتا رہا تھا کہ کبھی وہ دن بھی تھے جب یاتری اکثر آیا جایا کرتے تھے، یہ راستہ جے بھولے ناتھ کے نعروں سے گونجا کرتا تھا، اوپر مندر کی گھنٹیاں لوگوں کو پکارا کرتی تھیں اور صبح وشام آرتی ہوا کرتی تھی، اب تو لوگ جیسے دیوی دیوتاؤں کو بھولتے جا رہے ہیں اب تو علاقے کے جوان بھی اوپر جاتے ہوئے تھکتے ہیں، کہتے ہیں کیا رکھا ہے ـــ فضول ہی جان کھپاؤ ـــ شردھا، وشواس، لگن، کچھ باقی نہیں رہ گیا، اب لڑکے نیچے شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں ـــ" اس نے جھک کر کانچ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کھڈ میں پھینک دیا

وہ ٹکڑا بیئر کی بوتل کا تھا۔ کوئی منچلا بوتل خالی کر کے راستے میں پھینک گیا تھا

"اب کسی کو پیچھے آنے والے کی چنتا نہیں رہی"

میں نے محسوس کیا سرجو کی آواز زخمی تھی، جیسے وہ کانچ کا ٹکڑا اس کی روح میں گہرا اُتر گیا تھا۔ میں اس کے قدموں کو دیکھ رہا تھا جو مضبوطی سے اوپر چڑھ رہے تھے، میرے دل میں جو اسے سہارا دینے کا خیال آیا تھا، اس کے عزم و استقلال کو دیکھ کر دب گیا۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ اوپر درخت گھنے اور راستہ تنگ ہو گیا تھا، کبھی کبھی کسی پہاڑی چڑیا کی آواز خاموشی میں دور تک چلی جاتی۔

اوپر گہری اداسی اور سناٹا تھا، نیچے سے آنے والا راستہ ایک میدان میں ختم ہو گیا تھا سامنے اجاڑ اور ویران سا مندر کھڑا تھا، جیسے کوئی مجبور عورت اپنی عزت و آبرو لٹا کر کھوئی کھوئی سی کھڑی ہو، میں نے دیکھا مندر کے دروازے غائب تھے سیڑھیوں کے پتھر جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے، پیتل کے گھنٹے کی زنجیر خالی لٹک رہی تھی اور اندر تقریباً اندھیرا تھا، چاروں طرف خشک ٹہنیاں اور پتے بکھرے تھے، مندر کے اندر بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، سرجو سیڑھیوں سے کچھ ادھر ہی رک گیا تھا اور کسی مجرم کی طرح برآمدے میں لٹکی خالی زنجیر کو دیکھ رہا تھا۔

میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی بوتلیں، خالی ڈبے، پتھروں کے عارضی چولہے اور ردی اخبار ہر طرف بکھرے تھے۔

سرجو پوجا کی تھالی برآمدے میں رکھ کر مندر کی صفائی میں جُٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر

میں وہ اس کام سے فارغ ہو گیا، میں نے دیکھا اس کے چہرے پر چمک آگئی تھی اس نے دیا جلایا۔ مندر میں ہلکا سا اجالا ہو گیا۔ سرجو دیر تک آنکھیں موندے پرارتھنا کرتا رہا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مندر سے نکلا تو خالی زنجیر کو پکڑ کر جیسے لٹک گیا، میں نے قریب جاکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے منھ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں۔

سرجو تمہیں دکھ ہے کہ کوئی پیتل کا گھنٹہ اور مندر کے دروازے چرا لے گیا۔ لیکن بھگوان ان چیزوں میں تو نہیں رہتا، اسے کوئی نہیں چرا سکتا۔ خود آدمی نے بھگوان کو سونے چاندی میں چھپا کر مندروں میں رکھ دیا تھا، جانتے ہو کیوں —— کیوں کہ آدمی بھگوان کو اپنے من میں، اپنے ساتھ رکھتا ہوا ڈرنے لگا تھا۔ اس کے پاپ اسے ہر گھڑی شرمندہ کرتے رہتے تھے، تمہیں اس بات کا دکھ نہیں ہونا چاہیئے، تم نے نہ بھگوان کو کبھی من سے نکال دیا نہ تم اسے بھولے، جب یہ مندر یہاں نہیں تھا تو بھگوان کہاں رہتا تھا؟"

سرجو نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرے پر چمک تھی۔ میں مسکرا دیا تو وہ نرمی سے بولا

" بابو جی، میں نے تو شروع سے ہی اس مندر کو یہاں دیکھا ہے، وہ پیتل کا گھنٹہ میں رگڑ رگڑ کر چمکایا کرتا تھا اور اس کی آواز چاروں طرف گونجا کرتی تھی —— آدمی کتنا کمینہ ہو گیا ہے، کچھ چیزیں، جو ویسے بہت معمولی ہوتی ہیں، بھگوان کے نام سے جڑ کر پوتر ہو جاتی ہیں، ان کی چوری ——"

" تمہیں دکھ ہوا ہے، لیکن برجو کو نہیں ہو گا، کیوں کہ اس کا ان تمام چیزوں سے رشتہ اتنا مضبوط نہیں رہا "

"چلیں بابو جی، میں یہاں اور نہیں ٹھہروں گا "

ہم واپس ہو لیے۔ راستے میں ہمیں سوائے بکریوں کے ریوڑ کے اور کوئی نہیں ملا، ایک معصوم سا لڑکا، بڑے سے پتھر پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا، سرجو نے اپنی بھاشا میں اس سے کچھ پوچھا، لڑکا ہنس کر جواب دیتا رہا۔

ہم نیچے پہونچے تو تلسی ہمارا انتظار کر رہی تھی، اسے دیکھ کر محسوس ہوا کہ مندر میں تو میں

اب پہنچا ہوں۔ اس کے چہرے پر ایسا تقدس تھا، جس کے سایے میں من کے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ اس نے ہمیں چائے دی۔ سسر کے لیے گڑگڑی لے آئی اور ناشپاتی کے پیڑ کے سایے میں بیٹھ کر پودینے کی چٹنی پیسنے لگی۔ بار بار اس کی چوڑیاں چھنک جاتیں، تبھی برجو بھی آ گیا، سر کے ہلکے سے اشارے سے اس نے مجھے سلام کیا اور اپنے پیکٹ سے مجھے سگریٹ پیش کیا، میں نے لے لیا۔ اس دوران سرجو دور تک پھیلے اپنے کھیتوں کو دیکھتا رہا۔

"تمہارے لیے چاء لاؤں۔؟" تلسی نے برجو سے پوچھا

"نہیں میں کشنے کی دکان سے پی کر آیا ہوں"

"کشنے کی دکان ہے چوک میں۔؟" میں نے دل چسپی سے پوچھا

"اب تو اس نے بڑی دکان لے لی ہے، بیکری بھی شروع کر لی ہے، آپ اسے جانتے ہیں۔؟"

"ہاں جب پہلی بار ادھر آیا تھا تو اس کی دکان سے چاء پی تھی، تب تو چوک میں وہی ایک دکان تھی۔

"اب تو تین چار دکانیں ہو گئی ہیں۔ لیکن یہاں اتنی آمدن نہیں جتنی شہر میں ہو سکتی ہے کسی بڑے شہر میں آدمی لاکھوں کما سکتا ہے۔"

سرجو نے جیسے اداسی سے ہماری طرف دیکھا، تلسی کی چوڑیاں بھی ایک دم جیسے خاموش ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ سرجو بھی اب کہیں دور دیکھ رہا تھا، گڑگڑی کی نے اس کے لبوں میں دبی تھی لیکن وہ کش نہیں لے رہا تھا۔ ایک دم بوجھل سی خاموشی چھا گئی تھی اور میں جو خود کو ان ہی میں ایک سمجھنے لگا تھا، ایک دم اجنبی محسوس کرنے لگا،

"ایسی بات نہیں شہروں میں بھی غریب آدمی ہیں، اتنے غریب کہ نہ بھر پیٹ کھانے کو اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا، نہ رہنے کو گھر، نہ ایسی کھلی ہوا اور نہ دھوپ" میں نے یہ سب اس طرح کہا تھا جیسے کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔

"میں بھی جوانی میں شہر گیا تھا، سرجو نے آہستہ سے کہا "پیسہ کمانے، جو پلّے تھا وہ بھی گنوا کے آ گیا تھا، وہاں بیمار ہوا تو پوچھنے والا کوئی نہ تھا، ساتھ کے لوگ صبح کام پر چلے جاتے اور رات کو دیر سے لوٹتے، میں تو بخار ہی میں بھاگ آیا"۔

برجو نے باپ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور مفلر لپیٹتا ہوا کھڑا ہو گیا "میں کھانا نہیں کھاؤں گا"۔ کہتا ہوا وہ کھیتوں کی طرف اتر گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ تلسی ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی، گائے ڈکرائی، سرجو نے اٹھ کر اس کی گردن پر پیار کیا اور اس پتھر پر آ بیٹھا جہاں سے برجو اٹھ کر گیا تھا۔

"اس کا جی نہیں لگتا اب یہاں۔"

میں خاموش رہا۔

"اس غریب کو بھی رلاتا ہے، اب وہ اندر بڑی رو رہی ہوگی، میں کتنے مان سے اس کے باپ سے مانگ کر لایا تھا، کیا منہ دکھاؤں گا اُسے، میں نے کہا تھا، میرا ایک ہی لڑکا ہے، تیری لڑکی راج کرے گی، سب کچھ اسی کا تو ہے۔ لیکن ——" وہ اوپر پہاڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا، کہتا ہے شہر جائے گا، وہاں کاروبار کرے گا، لاکھوں کمائے گا، بابو جی، پردیس پھر پردیس ہے، اپنا کبھی نہیں بنتا، اپنی تو یہ دھرتی ہے، یہ کھیت ہیں یہ مٹی اپنی ہے، دکھ سکھ کی ساتھی، میں تو جب اداس ہوتا ہوں ان کھیتوں میں چلا جاتا ہوں، من کو شانتی مل جاتی ہے، سب دکھ بھولنے لگتا ہوں"

میں خاموش رہا یہ جذباتی لگاؤ اور وابستگی کی بات تھی، یہاں کسی لمبی چوڑی بحث کو دخل نہیں ہو سکتا تھا، ہر بات، ہر رشتہ، ذہنی سطح پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔

برجو گیا، تو تلسی بھی جائے گی پھر میں اکیلا کیا کروں گا، اور یہ گھر یہ ڈھور ڈنگر میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، برجو تلسی کی بھی نہیں سنتا۔"

مجھے ماتادین کا خیال آیا جو یو۔پی کے کسی گاؤں سے شہر آیا تھا اور اس کی بیوی کو دق ہو گئی تھی۔

جب میں چلنے کے لیے اٹھا تو سرجو کھیتوں تک میرے ساتھ آیا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔ بابو جی جب بھی ادھر آؤ یہاں ضرور آنا۔"

میں وعدہ کر کے کھیت پار کر آیا تھا۔

۵

آج یہ دو منزلہ، مغربی طرز پر بنا ہوا مکان میرے اور سرجو کے بیچ کھڑا ہو گیا ہے۔ ایک ٹیرس ہے جس کے جنگلے کا وارنش دھوپ میں چمک رہا ہے، پورچ میں نئی کار کھڑی ہے، ایک جیپ بھی ہے، نیچے باہر کی طرف تین دکانیں ہیں، انگریزی اخبار کی ایجنسی کا بورڈ بھی آویزاں ہے۔ ٹیلی فون کے تار پر ایک تار پر شکرا دیر سے بیٹھا ہے۔

ایک خوب صورت سا بچہ کھڑکی میں کھڑا مجھے دیکھے جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا ہے، گول، مول، گوری چٹی، صحت مند، کھاتے پیتے گھرانے کی عورت، وہ مقامی لوگ نہیں ہو سکتے، پہاڑی عورتیں ایسی نہیں ہوا کرتیں۔

لگتا ہے یہ مکان میرا تعاقب کرتے ہوئے آ گیا ہے اور آنکھ بچا کر یہاں ایستادہ ہو گیا ہے، میں جانتا ہوں یہ بالکل بے معنی سا خیال ہے لیکن ایسا شاید اس لیے محسوس ہوا ہے کہ جس شہر میں، میں رہتا ہوں، وہاں مکان ہی مکان ہیں، لوگ ہی لوگ ہیں، میرا فلیٹ چوتھی منزل پر ہے، چار منزلیں اس کے اوپر ہیں۔ صبح جب دن چڑھتا ہے تو سڑک پر ٹریفک اور بلڈنگ میں فلش چالو ہو جاتے ہیں۔ ڈیزل کی بو، ٹریفک کا شور، مشینوں کی آواز اور دھواں، بلڈنگ کی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے، اجنبی، پڑوسی۔ یہ سب میری زندگی کا لازمی جزو ہیں۔

وہ عورت پیچھے ہٹ گئی ہے۔ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کا یہ بھی ایک خوبصورت طریقہ ہے۔ میری آنکھوں میں تلسی سراپا ہے اور سرجو کی اداس آنکھیں۔ بانسوں کے جھنڈ کی طرف چلتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ اس مرتبہ مندر میں گھنٹہ لگوا دوں گا۔ یہ تو میں نے اس وادی میں داخل ہوتے ہوئے ہی سوچ لیا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟" بچہ پوچھتا ہے۔

"کسی سے نہیں بیٹے۔"

بچے نے پیچھے دیکھا ہے وہ شاید میرے جواب پر حیران ہی ہوا ہے۔ اگر کسی سے ملنا نہ ہو تو کوئی کسی کے گھر کی طرف بھی نہیں جاتا۔ یہ ایک طے شدہ مہذب طریقہ زندگی ہے کم از کم شریف آدمی تو ایسا نہیں کرتے۔ میں اپنے اس خیال پر مسکرا دیا۔ یعنی اب میری شرافت مشکوک ہے۔ جب یہ مکان، یہ دکانیں، ٹیلی فون کے تار اور اخبار کی ایجنسی نہیں بھی تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ سرجو نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر اپنے گھ

لے گیا تھا۔

بانسوں کے جھنڈ میں منھ مارتے ایک   نے میری طرف دیکھا ہے ۔۔۔ پچھواڑے بہت بڑا شیڈ ہے۔ ایک آرا مشین پر لکڑیاں چیری جا رہی ہیں۔ فضا میں لکڑی کے برادے کی بُو اور مشین کی تیکھی آواز ہے۔ ناک منھ لپیٹے۔ مزدور کام میں مصروف ہیں، یہ سب مقامی نوجوان ہیں۔ کھیت بہت پیچھے دھکیل دیئے گئے ہیں۔ شیڈ سے ذرا ہٹ ایک بڑا سا بورڈ کھڑا ہے ۔۔۔ فیکٹری کے لیے۔

میں سر جھکائے آگے بڑھ رہا ہوں، کھیت ویران پڑے ہیں، زیادہ حصّے میں عمارتی سامان بکھرا پڑا ہے۔ بنیادیں کھودی جا رہی ہیں۔ شاید بہت بڑا کارخانہ لگے گا۔

وہ شہتوت کا درخت اپنی جگہ پر ہے، ناشپاتی کا پیڑ بھی ہے، لیکن سوکھ گیا ہے، مکان کی صرف دیواریں رہ گئی ہیں، سلیپوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں، اندر گھاس اگ رہی ہے، باہر جنگلی جھاڑیاں دیواروں تک آ گئی ہیں، میں دل میں عجیب سا درد لیئے اس پتھر پر آ بیٹھا ہوں اور گھر میں اگی لمبی گھاس کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک آوارہ کتا سونگھتا ہوا کہیں سے آ گیا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا ہے پھر مجھے نظر انداز کر کے ناشپاتی کے تنے پر پیشاب کر کے چلا گیا ہے۔ میرے جی میں آتا ہے سرجو کو پکاروں، پھر اپنے اس خیال پر ہنسی آتی ہے۔ میں تھوڑی دور تک مندر کی طرف جاتا ہوں لیکن تکان محسوس ہونے لگتی ہے اور واپس آ جاتا ہوں۔

پودینے کی کیاریاں بھی ویران ہیں ان کے نیچے جہاں وہ راستہ کنڈلی مارے بیٹھا تھا، رکتا ہوا، لگتا ہے سرجو میرے پاس آ کھڑا ہوا ہے۔ کہہ رہا ہے۔ بابو جی، پھر ادھر آؤ تو یہاں ضرور آنا ۔۔۔

وہ منیمہ اب وہاں نہیں ہے۔ کھڑکی میں اب ایک مرد کھڑا ہے۔ سڑک پر سے ایک تیز رفتار بس گزر جاتی ہے۔ چند منٹ بعد مختلف سمت سے بس ہارن بجاتی گزر جاتی ہے۔

جیپ کو ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھاتے ہوئے من بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا ہے لگتا ہے وادی میں آنا بیکار رہا، سوچتا تھا ساگ اور مکئی کی روٹی کھا کر آرام کروں گا۔ پھر ہم مندر جائیں گے، پھر ریسٹ ہاؤس جاؤں گا۔ لال سنگھ سے رات کے کھانے پر مرغی بنانے کے لیے کہوں گا اور اس سے ان دنوں کی کہانیاں سنوں گا جب انگریز افسر ٹراوٹ مچھلی کے لیے وہاں

، تھے۔

ہلی بار جب میں ادھر آیا تھا تو ریسٹ ہاؤس جیسے میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا، سویا سویا
طرز کا، گھنے اونچے پیڑوں میں خاموش کھڑا جیسے کہانیاں سنا رہا تھا۔ آؤ میری آغوش میں
تمہیں بتاؤں گا، جب ہوا گھنے درختوں میں سے گزرتی ہے تو کیا ہوتا ہے جب چوٹیوں پر
تی ہے تو چاروں طرف کیسی خاموشی چھا جاتی ہے۔

ی عمارت کے ایک تاریک کوارٹر سے نکل کر لال سنگھ میرے سامنے آگیا تھا۔ وہ وہاں
ار، رسوئیا، گائیڈ، سب کچھ تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ وہاں یہی کام کرتا تھا۔ اس کا
جب میں نے پکارا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہا تھا
ں کے بارے میں تمام معلومات مجھے سسر جو سے ملی تھیں۔

لال سنگھ ہم رات کو ادھر ہی ٹھہریں گے۔ اور کھانا بھی یہیں کھائیں گے"

جی ساب۔"

کھانے پر مرغی بنے گی اور اس سے پہلے ایک پیالی گرم گرم کوفی۔"

جی ساب"

ہ میرا سامان اٹھا کر چلنے لگا تو میں نے کہا۔

میرے پاس پرمیشن نہیں ہے۔"

جی ساب" پھر جیسے وہ چونکا۔"کوئی بات نہیں ساب، ہو جائے گا۔"

ں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا میں، پچھلی طرف سے اندر داخل ہوا۔ ریسٹ ہاؤس دو بڑے
ر مشتمل تھا۔ باہر کی طرف ایک بڑا سا چوبی برآمدہ تھا جس کا فرش ننگا تھا اور
ں کا پلستر کئی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ کمروں میں پرانی طرز کے بڑے آتش دان تھے۔ دو
پلنگ اور ایک ایک الماری تھی۔ بس بجلی نہیں تھی۔

امان قرینے سے رکھ کر لال سنگھ رجسٹر لے آیا تھا اندراج کرنے کے بعد میں نے اسے
یگ سے کوفی کی ڈبی، شکر اور بسکٹ وغیرہ نکالنے کے لیے کہا۔ وہ جی ساب، کہہ
لگا تو میں نے نہانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کمرے سے ملحقہ غسل خانے
کھولا اور بالٹی لے کر چلا گیا

ر کام کے لیے مجھے اسے پکارنا پڑتا تھا اور وہ فوراً آ بھی جاتا تھا۔ وہ کوفی بنا لایا میں

بے مطلب کمروں میں ٹہلتا رہا۔ لگتا تھا عرصہ سے یہاں کوئی آکر ٹھہرا نہیں۔ برآمدہ کھلے ہونے کے سبب خنک ہوا اندر تک آتی تھی اور اچھی لگتی تھی، باہر سڑک ویران ہو چکی تھی دور سے کھڑکی آواز آرہی تھی۔ آسمان پر تارے روشن ہوتے جا رہے تھے۔ چاند ابھی پہاڑیوں کے اُس پار تھا۔

لال سنگھ گرم پانی لے آیا۔ نہا کر میں تازہ دم ہو گیا اور برآمدے میں جا بیٹھا۔ اب چاند کسی شرمیلی دلہن کی طرح ایک چوٹی کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ میں نے بوتل نکال کر لال سنگھ سے گلاس اور پانی لانے کے لیے کہا۔ وہ فوراً ہی مطلوبہ چیزیں لے آیا۔

"یہاں کوئی گوشت وغیرہ کی دکان ہے۔؟"

"نہیں ساب، نیچے گاؤں سے لایا ہوں"

"کتنی دور سے"۔

"میل بھر ہو گا، صبح کی چائے کے لیے دودھ اور انڈے بھی لے آیا ہوں، بریڈ نہیں ہوگی ساب پراٹھا بنا دوں گا۔"

میں نے اپنے لیے بڑا پیگ بنا لیا تھا، اچانک لال سنگھ کا خیال آگیا۔

"لال سنگھ تم بھی پلا تو لیتے ہو؟"

وہ چپ رہا۔ میں سمجھ گیا کہ نوکری کے آداب اس کی زبان بند کیے ہوئے ہے۔ میں نے اسے ایک خالی گلاس لانے کے لیے کہا تو وہ انکار کرنے لگا۔ آخر بہت کہنے پر گلاس لے آیا میں نے اسے بھی بڑا پیگ دیا۔ وہ گلاس لے کر برآمدے کے دوسرے سرے پر چلا گیا، جہاں روشنی بہت کم تھی اور تقریباً اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

میں اطمینان سے پیتا رہا۔ بیچ میں وہ نہیں آیا۔

اس نے بڑی توجہ اور سلیقے سے کھانا کھلایا۔ ہاتھ دھلانے کے لیے گرم پانی لایا۔ میرا بستر بھی لگا دیا۔ سونے سے پیشتر مجھے سگریٹ پینے کی عادت ہے۔ پیکٹ دیکھا تو خالی۔ لال سنگھ شاید بھانپ گیا۔

"ساب، کون سا سگریٹ پیتے ہیں؟"

"کیوں مل جائے گا یہاں سے؟"

"یہاں سے تو نہیں، بھاگ کر گاؤں سے لے آؤں گا۔ لالہ دکان کے اوپر ہی رہتا ہے وہ بڑھیا

بھی رکھتا ہے

"نہیں، رہنے دو، تمہارے پاس ہو تو دے دو۔"

"ہے تو ساب، لیکن۔"

"سب چلے گا اس وقت۔"

اس نے جھکتے ہوئے لیمپ کا پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک سگریٹ لے لیا۔

"لال سنگھ تم تو برسوں سے یہاں ہو۔"

"جی ساب، بچپن سے۔"

"کیسا لگتا ہے تمہیں، کوئی فرق، کوئی تبدیلی محسوس کرتے ہو؟"

"جی ساب، بہت پھرک پڑا ہے، سب بدل گیا ہے، ساب آپ مہینوں بعد ادھر پہلے ٹورسٹ ہیں، کبھی کبھار کوئی افسر آجاتا ہے، دس پانچ منٹ ٹھہر کر چلے جاتے ہیں، رجسٹر میں دستخط کئے اور بس، ساب یہاں رکھا بھی کیا ہے۔ پہاڑ، کھنڈر، جنگل، ساب لوگوں کو شوق تھا، دیسی لوگ تو ـــــ سب بدل گیا ہے ساب، ایک دم بدل گیا ہے ـــ چار مہینے ہوئے ہوئے رات کو ـــ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔" ـــ "صبح کو بیڈ ٹی کتنے بجے دوں ساب۔؟"

"تم کچھ بتا رہے تھے۔"

"کچھ نہیں ساب، دکھ ہوتا ہے۔" لال ٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد اداس اور جامد لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ماضی میں کچھ دیکھتا دیکھتا ایک دم پتھرا گیا ہو۔ "افسروں نے اسے اڈہ سمجھ لیا ہے، لڑکی لائے، رات رہے اور صبح بھاگ گئے، رجسٹر میں اپنا نام اور کام انسپکشن درج کرتے ہیں۔" وہ چپ ہو گیا پھر بول پڑے، آپ پہلے تو ادھر نہیں آئے، میرا نام کیسے جانتے ہیں۔!"

"سرجو نے بتایا تھا۔"

"وہ ـــ سرجو کا باپ، آپ جانتے ہیں اسے"؟

"ہاں اچھا آدمی ہے۔"

"بہت اچھا ہے ساب، اس علاقے میں سب سے اچھا، لیکن بہت دکھی ہے اولاد

کے ہاتھوں۔"

"ہاں۔"

"ساب آپ برجو کو سمجھائیں۔ زمین ماں ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ کر نہ جائیں۔"

"کوشش کروں گا۔"، میں نے جھوٹ بول دیا، اور اپنے اس جھوٹ کو لیے میں سو گیا۔"

کھڑکی میں کھڑا وہ شخص مجھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی ہے۔

ریسٹ ہاؤس میں پہلے ہی ایک سرکاری جیپ کھڑی ہے اور ایک خاندان لان میں موجود ہے۔ ایک مرد کرسی پر نیم دراز ہے، ٹانگیں جوتوں سمیت میز پر ہیں اور اخبار چہرے پر، سامنے والی کرسی پر ایک مرگھی سی بزرگ خاتون اونگھ رہی ہے، اون کا تھیلا گھاس پر پڑا ہے۔ دو بچے گھاس پر گھتم گھتا ہو رہے ہیں۔ قریب ہی چائے کے برتن اوندھے پڑے ہیں اور مرد کی کرسی کے چاروں طرف سگرٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے اور ماچس کی تیلیاں بکھری ہوئی ہیں۔ برتنوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ایک جوان عورت کیاریوں کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی ہے، وہ شاید کسی ایسے پھول کی تلاش میں ہے جو اس کے بالوں میں سج سکے آخر اس نے ایک پھول توڑ لیا ہے۔ اس نے میری طرف یوں دیکھا ہے جیسے کہہ رہی ہو — میں اس علاقے کی جوان، خوب صورت اور امیر ترین عورت ہوں۔ مجھے عورتوں کی یہ خوش فہمی ہمیشہ اچھی لگی ہے۔ اس لیے مسکرا دیتا ہوں۔ وہ بطخ کی طرح چلتی ہوئی اس مرد کی طرف بڑھ رہی ہے اس کی چال میں عجیب سی تمکنت، ملکیت اور احساس برتری کا شائبہ ہے۔ مرد کے چہرے سے اخبار ہٹا کر وہ مسکراتی ہے لیکن مرد کو جیسے یہ ادا ناگوار گزری ہے، اس نے بیزاری اور غصہ سے اخبار دوبارہ چہرے پر پھیلا لیا ہے۔ عورت نے میری طرف اس طرح دیکھا ہے جیسے میں اس خوب صورت تصویر میں کوئی غیر ضروری دھبہ ہوں، اس کی آنکھوں میں مجھے مٹا دینے والی آگ ہے، چہرہ غم و غصہ سے بگڑ گیا ہے۔ وہ پلٹ کر بچوں پر برسنے لگتی ہے ایک کو تو اس نے چپت بھی لگا دیا ہے۔ بزرگ خاتون سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ مرد بھی جاگ گیا ہے اور بچوں کو ڈانٹنے لگا ہے۔

تم سوئے رہو جی "۔ عورت مجھے یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں دبتی، اپنے خاوند سے بھی نہیں۔

اس بات پر مرد اس سے الجھ جاتا ہے۔ بزرگ خاتون بھی اس جھگڑے میں شریک ہو جاتی ہے اور بچے دور کھڑے ہنستے ہیں۔

میں نے سوچ لیا ہے کہ اگر یہ لوگ یہاں ٹھہرے تو میں آگے نکل جاؤں گا۔

عورت نے تین چار پھول اور توڑ لیے ہیں۔ اس کی دیکھا دیکھی بچوں نے بھی کیاریوں پر دھاوا بول دیا ہے، نادر شاہ نے دلی کا بھی کچھ ایسا ہی حال کیا ہو گا۔ اب ایک کونے میں وہ تختی بچی ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے ۔" پھول توڑنا منع ہے"۔ ہر طرف پھول کی پتیاں بکھری ہوئی ہیں۔

مرد نے چوکیدار کو آواز دی ہے۔ چوکیدار دبا دبا سا ہے۔ برتن لے کر وہ دوبارہ کچن کی طرف چلا گیا ہے۔ مرد نے بچوں کو ڈانٹ کر جیپ میں بیٹھنے کے لیے کہا ہے اور وہ اس میں جا بیٹھے ہیں۔ بزرگ عورت بھی ان کے ساتھ جا بیٹھی ہے۔ اب وہ مرد اور عورت آپس میں الجھ رہے ہیں۔ مرد وہاں اکیلا ٹھہرنا چاہتا ہے۔ عورت کو شاید یہ پسند نہیں تھا آخر وہ اپنی ملکیت جتانے پر اتر آیا ہے۔ اس نے عورت کو بھی سختی سے ڈانٹ دیا ہے' وہ پاؤں پٹکتی ہوئی جیپ میں جا بیٹھی ہے۔

چوکیدار ڈرائیور کو بلا رہا ہے۔ جیپ باہر نکل گئی ہے، وہ مرد سڑک پر چلا گیا ہے، شاید روٹھی ہوئی بیوی کو الوداع کہنے۔

میں یہ سب بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں، لگتا ہے کسی فلم کا مزاحیہ سین چل رہا ہے میرے ہارن بجانے پر چوکیدار پھر باہر آ گیا ہے۔

"لال سنگھ کہاں ہے ۔؟"

"ریٹائر ہو کر چلا گیا۔"

"کب ۔؟"

"کوئی دو سال ہوئے ۔"

میں ریسٹ ہاؤس کی عمارت کو دیکھ رہا ہوں۔ جو بدلی ہوئی سی لگتی ہے۔ برآمدہ آگے سے بند کر دیا گیا ہے، بڑے بڑے شیشوں پر بھاری پردے پڑے ہیں، بجلی بھی لگ چکی ہے۔ چھت کی

ٹینوں پر نیا رنگ کیا گیا ہے۔

"کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں یہاں۔"

"جی، یہ ریسٹ ہاؤس 'A' کلاس کر دیا گیا ہے۔"

"ہم رات یہاں ٹھہریں گے۔"

"پرمیشن۔؟"

"نہیں ہے۔ اس کا بغیر کام نہیں چل سکتا۔"

"پرمیشن کے بغیر ——"

میں نے پانچ کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو وہ مسکرا دیا۔

"تمہارا نام۔؟"

"درشن سنگھ ——"

اس نے میرا سامان اٹھایا اور اندر لے گیا، اس کے پیچھے میں بھی اندر گیا۔ اندر بھی سب کچھ بدل گیا تھا۔ اب چار کمروں پر مشتمل دو سیٹ بنا دیئے گئے تھے، فرش پر دیواروں تک میٹنگ بچھی تھی، ڈنلپ کے گدّے دار پلنگ، ٹیوبز، پردے، غسل خانے میں جدید فٹنگز، پھر بھی مجھے جیسے کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی —— آتش دان اب نہیں تھا۔

میں نے درشن سنگھ سے آخری بیگ سے کوئی وغیرہ نکالنے کے لیے کہا تو اس نے بتایا کہ اب یہاں ہر چیز کا انتظام ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوئی لے آیا۔

لال سنگھ کا گھر کہاں ہے۔؟"

"یہاں سے کوئی بارہ میل دور، لیکن آج کل وہ یہاں نہیں رہتا، شملہ کے کسی ہوٹل میں نوکر ہو گیا ہے۔"

"اچھا سرجو کو جانتے ہو؟"

"کون سرجو، سر؟"

"سرجو ——" میں نے درشن سنگھ کی طرف دیکھا اس کا چہرہ سپاٹ اور خالی تھا، میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

"سر میں یہاں کسی کو نہیں جانتا، میں ادھر کا نہیں ہوں۔ کلّو سے تبدیل ہو کر آیا ہوں ——"

"دیکھو درشن سنگھ ہم نہائیں گے۔ اور ہاں رات کے کھانے پر کیا دوگے؟"
"جو آپ کہیں سر، مٹن، مچھلی، مرغا۔"
"چکن۔"
"ٹھیک ہے سر، بن جائے گا، میں گیزر آن کیے دیتا ہوں، آپ نہالیں۔"
غسل خانہ مغربی طرز پر بنایا گیا ہے۔ 'H' والی ٹوٹی سے گرم پانی آرہا ہے۔ اب چوکیدار کو پکارنے کی ضرورت نہیں، آرام، سکون، سہولت اور اطمینان کے لیے ہر چیز مہیا ہے۔
اب میں اپنے کمرے میں، اپنے ساتھ چین سے ہوں، میرے قریب بجلی کا بٹن ہے اسے دباؤں تو چوکیدار سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔ واش بیسن پر لگے آئینے میں خود کو ننگا دیکھ کر ہنسی آگئی ہے۔ ایسا نہیں کہ پہلے کبھی خود کو ننگا نہیں دیکھا، لیکن یہ ہنسی پہلی بار آئی ہے اور آئینے میں پھیل گئی ہے اور عجیب سی لگ رہی ہے، جیسے کوئی دوسرا مسکرا رہا ہے۔
تو میں کہاں آگیا۔
شال کندھوں پر ڈال کر میں برآمدے میں آگیا ہوں۔ عمارت کے اندر باہر روشنی ہو رہی ہے۔ شیشوں پر پردے پڑے ہیں، اس لیے باہر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا۔
"درشن سنگھ۔ گلاس اور پانی۔"
وہ لپک کر گلاس اور پانی لے آیا ہے۔ پیگ بنا کر میں نے پردہ ہٹا دیا ہے اور کرسی پر بیٹھ گیا ہوں، سامنے والا درخت نہیں ہے۔
"درشن سنگھ سامنے کونے میں ایک درخت ہوا کرتا تھا۔"
"جی کاٹ دیا گیا۔ منسٹر صاحب نے کٹوا دیا، اسی کرسی پر بیٹھے تھے، نہ جانے کیا جی میں آئی کہ درخت کاٹنے کا حکم دے دیا، اگلے ہی دن وہ درخت کاٹ ڈالا گیا۔"
شراب پھیکی ہو گئی ہے، اس لیے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا ہوں، اور دوسرا پیگ بنا لیا ہے۔ لگتا ہے میرے قریب لال سنگھ کھڑا ہے۔ میں اس کے لیے بھی پیگ بنانا چاہتا ہوں۔
"لال سنگھ گلاس لے آؤ۔"
وہ لپک کر گلاس لے آیا ہے۔ میں نے اسے ایک بڑا پیگ دے دیا ہے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے ایک ہی بار میں پی گیا ہے۔ ایک دم مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تو درشن سنگھ ہے

میں مسکرا کر کہتا ہوں
"تم لال سنگھ سے نہیں ملے، سرجو کو بھی نہیں جانتے، وہ دونوں بہت اچھے آدمی تھے، تم بھی اچھے آدمی ہو ۔۔"

وہ خوش ہو کر زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔
گو ـــ ڈ۔ وہ لوگ جو یہاں بیٹھے تھے۔ کون تھے؟
"وہ، منسٹر صاحب کے رشتہ دار تھے ۔"
"ویری ـــ گو ـــ ڈ ـــ"
"اور پی ہو گئے؟"

مسکراہٹ اس کے لبوں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیل جاتی ہے
میں اسے ایک بڑا پیگ اور دیتا ہوں اور تیسرا پیگ خالی کر کے باہر آ جاتا ہوں۔ دروازہ مقفل کرتے ہوئے۔ ہاتھ کانپتے ہیں۔ پہلے تو تالا نہیں لگایا تھا، اب یہ خیال کیوں آیا میں نے تالا لگا کر تالی جیب میں ڈال لی ہے۔

آسمان پر تارے نکلنے لگے ہیں۔ ہوا خوشگوار ہو گئی ہے۔ دھیرے دھیرے چلتے چوک میں آ گیا ہوں۔ بہت سی دکانیں کھل گئی ہیں۔ کتنے کی دکان میں ایک ہپی جوڑا بیٹھا چرس کے سگریٹ پھونک رہا ہے۔ کچھ مقامی نوجوان للچائی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہے ہیں جس نے قمیص کے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا ہے، وہ جوڑا سب سے بے نیاز ایک دوسرے میں محو ہیں۔ لڑکی اپنی بھاشا میں لڑکے کو کچھ سمجھا رہی ہے، لڑکا ہنس رہا ہے۔ اگلی دوکان میں ایک عورت کونٹر کے پیچھے بیٹھی سوئٹر بن رہی ہے، آگے وہ جگہ ہے جہاں سے نیچے کھڈ اور مندر نظر آتا ہے یہ مندر بھی بہت پرانا ہے۔ پہلے وہاں صرف ایک زرد سی بتی جلا کرتی تھی، اب تو ٹیوبز کی تیز روشنی پھیلی ہے۔ قریبی درخت کے تنے پر ٹین کی پلیٹ لگی ہے، جس پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ ۔ ۔ Area adopted by Bank of

میں مندر کی طرف جانے والی سڑک پر اتر گیا ہوں۔ دور پُل اور دھرم شالہ کی بتیاں جھملا رہی ہیں، پُل کی طرف سے ایک بس چلی آ رہی ہے، پل پار کر کے میں مندر کی حدود میں داخل ہو گیا ہوں۔ شاید چٹان اڑائی جا رہی ہے، کھڈ پر پشتہ بنایا جا رہا ہے، اس مطلب کا ایک لمبا چوڑا بورڈ ایستادہ ہے، چٹان کاٹ کر پارکنگ کے لیے جگہ بنائی جا رہی ہے۔

مندر تک راستے کے دونوں طرف عمارت کا کام جاری ہے ۔ دھرم شالہ، اسپتال، ہنومان مندر، شوالہ، درگا مندر، لکشمی نارائن مندر ــــ دفتر اور پھر پرائیویٹ، رہائش گاہ، پجاری جی ــــ

پجاری جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں، دو ہپی بھی ہیں۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھ گیا ہوں، پجاری جی ان دونوں کو 'آتما پرماتما' کا گیان دے رہے ہیں ــــ شانتی، مکتی، سیوا، پریم۔ جیسے شبد بار بار ان کی گفتگو میں آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ہپی چلے جاتے ہیں تو پجاری جی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور میرے آنے کی وجہ پوچھتے ہیں۔ میں کچھ ان کے درشنوں، کچھ بھگتی بھاؤ کی بات کرتا ہوں، ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے وہ بتانے لگتے ہیں کہ وہ دونوں ہپی مکتی اور شانتی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں، بھارت درشن نے مانو اہتاس کے ہر موڑ پر جگ کو اجالا دکھایا ہے۔ پتھ پردرشن کیا ہے۔

مجھے دو امریکن لڑکیاں یاد آرہی ہیں جو سکھ دھرم اپنا کر کیرتن کیا کرتی تھیں، میں نے ایک سے پوچھا تھا عیسائیت اور سکھ دھرم میں کیا فرق ہے اور سکھ دھرم انھیں عیسائیت سے کیوں بہتر لگا کہ وہ اس میں شامل ہوگئیں اس کا جواب تھا ــــ یہ ہمارا نجی معاملہ ہے، میں اس پر بحث نہیں کرنا چاہتی ــــ فل برائٹ۔ راک فیلر اور فورڈ سٹاپینڈ ندہ باد ــــ

"اب تو یہ ملٹی پرپز مندر بن گیا ہے۔"

"جی، لوگوں کی آسانی کے لیے، یہاں ہر وچار کا یاتری آتا ہے، مینجنگ کمیٹی نے بہت سوچ وچار کے بعد یہ مندر بنانے کا فیصلہ کیا ہے، اسپتال اور دھرم شالہ بھی بن رہی ہے۔"

"خاصہ شاندار کامپلیکس بنے گا۔"

"ادگھاٹن ایک منتری جی کریں گے، پورنماشی کو۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے، جنتا کو دھرم کی بہت آوشیکتا ہے، آگیا دیجئے پھر درشن کروں گا ــ"

سرجو کو شکایت تھی کہ لوگ دیوی دیوتاؤں کو بھولتے جارہے ہیں۔ سرکار اور مندروں

کی میٹنگ کیٹیاں مل کر جنتا اور بھگوان کا فاصلہ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فضا میں گٹار کی مدھر جھنکار گونج رہی ہے، کوئی دل کو چھونے والا مغربی نغمہ ہے، شاید وہ دونوں ہپی اوپر کمرے میں ٹھہرے ہیں، من کی شانتی کے لیے بھٹکتی ہوئی روحیں۔

وہ جوڑا، جو کشتے کی دکان میں بیٹھا تھا، جھومتا ہوا مندر کی طرف آ رہا ہے۔ لڑکی سے اپنا آپ نہیں سنبھل رہا ہے، لڑکے نے اس کی کمر میں بازو ڈال رکھا ہے اور لڑکی تقریباً اس پر جھول گئی ہے۔ موڑ پر رک کر لڑکے نے لڑکی کے ہونٹوں پر طویل بوسہ دیا ہے اور لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی ہے۔

"ہیلو بلگرم ——" لڑکی نے مجھے دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔

میں 'ہیلو' کہتا ہوا آگے نکل آیا ہوں۔

چوک اب تقریباً ویران ہے۔ کشنا بھی دوکان بند کر رہا ہے۔ کمرے میں پہونچتا ہوں تو درشن سنگھ آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دیتا ہے، میرے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ آرا مشین کا مالک ملنے آیا ہے میں اسے اندر بلا لیتا ہوں۔ وہی کھڑکی والا شخص ہے۔ وہ نمسکار کہہ کر بیٹھ جاتا ہے۔

"سیر کر کے آ رہے ہیں۔؟" وہ مسکراتا ہے۔

"جی، مندر تک گیا تھا ——"

"کیسا لگا ——"

"آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔؟"

"وہ بات یہ ہے کہ صبح میرے آدمیوں سے غلطی ہو گئی، اس کے لیے معافی مانگنے آیا ہوں انھوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔

"وہ فیکٹری آپ لگا رہے ہیں ——"

"جی ——"

"وہ زمین شاید سرجو کی ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم۔؟" وہ حیرت سے دیکھتا ہے۔

"سرجو اور اس کا بیٹا برجو کہاں چلے گئے۔؟"

"برجو تو شہر چلا گیا تھا، وہاں کاروبار میں اسے نقصان ہوا، کسی کیس میں شاید جیل بھی

(بقیہ ص۱۴۵ پر)

مثلث

ہری مندر میں ستھاپت ان مورتیوں کے حضور میں وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

تین مقدس مورتیاں۔

برہم، شِو وشنو۔ انسانی مقدروں کے دیوتا برہما کے ہاتھ میں تخلیق کی کتاب اور قلم۔ شِو کے ہاتھوں میں ان کا جانا پہچانا ترشول اور ڈمرو۔ وشنو کے ہاتھوں میں تیر کمان، سدرشن چکر اور شنکھ۔ ان کا چوتھا ہاتھ جو خالی تھا بھگتوں میں وہ غیر مرئی برکتیں بانٹ رہا تھا جن کو پانے کے لیے وہ دیودرشنوں کو آتے ہیں

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا خدا کون ہے، لہذا ہری مندر میں آنے سے پہلے وہ احتیاطاً بڑے گرجا گھر پر سلیب، برٹنگے کرائسٹ اور مقامی بڑی مسجد کی وسیع و عریض فضا میں مہکتے اللہ پاک کو بھی اپنے ارادے سے مطلع کر آیا تھا ــــــ

اس شہر کے لوگ انھی تین مذاہب سے منسلک تھے۔ وہ جو اپنی ولدیت کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا ظاہر ہے آخری چھلانگ لگانے سے پہلے کسی چوتھی عدالت میں نہ جا سکتا تھا

اسے انصاف کی طلب تھی۔ ایسے انصاف اور ایسی روشنی کی طلب تھی جو صرف خدا کی عدالت میں ملتی ہے۔

خدا کا گھر۔

انصاف کا مندر۔

روشنی کا منبع۔

برہما، شو اور وشنو۔ تین بڑے ستون تین اہم نقطے۔ ہندو دھرم کی مثلث خدا بیٹا اور دی ہولی گھوسٹ، عیسائیت کی تکون اللہ، رسول، اسلام۔

اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ زمین آسمان اور پاتال۔ آدمی کے خوابوں کی تین آخری حدیں۔ خشکی، تری اور ہوا۔ زندگی کے تین ضروری اجزاء سرخ نیلا اور پیلا، قوس و قزح یعنی حسن کے تین بنیادی رنگ۔ تین پتی، تین پانسے۔

وہ زندگی کی بازی ہار گیا تھا اور وہ مثلث جس کا وہ کبھی خود بھی ایک اہم زاویہ تھا ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اس کا وجود اب اس اکیلے نقطے کی مانند تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ صفر زیرو۔ شونیہ۔ یعنی کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

کبھی اس کی بھی ایک دنیا تھی۔ ایک مکمل متساوی الاضلاع مثلث، مگر آج اس تکون کے دوسرے دو نقطے کہیں کھو گئے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ اکیلا بھی اکائی ہوتا ہے، مگر وہ تو صفر تھا صفر یعنی زیرو یعنی شونیہ۔ یعنی کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

نقطے تو گئے ہی تھے، اپنے ساتھ زاویے اور لکیریں بھی لے گئے۔ مثلث کٹ کر گر گیا، ٹوٹ گیا۔

"اب میرے وجود کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد ہے؟ میں کیا ہوں۔ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ صفر۔ زیرو۔ شونیہ۔"

"میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں" وہ وشنو بھگوان کے مہرباں اور مسکراتے ہوئے چہرہ سے مخاطب تھا۔

"تم سب جانتے ہو۔ اب جب کہ میرا کوئی مصرف نہیں تو پھر تمہارے پاس خود اپنے آپ چلے آنے میں کیا قباحت ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی خوشی کے لیے۔ اس خوشی کے لیے مر رہا ہوں جو تم نے چھین لی ہے۔ میری موت کو خودکشی کہہ کر تم آدمی کے بنائے ہوئے بے رحم قانون سے۔ بغاوت کے جرم میں مجھے مزید اذیت بھی پہنچا سکتے ہو۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو اور غالباً کرو گے بھی۔ مگر جو تمہارا قانون ہے اس کے مطابق میں اپنے ویراگیہ کے بل پر جنم مرن سے آزاد ہونے یعنی نروان پانے کا حقدار ہوں ــــــ تمہاری دی ہوئی یہ زندگی اتنی الجھی ہوئی ہے کہ میرے ایسا آدمی اس میں زندوں کی طرح نہیں جی سکتا۔ میری خودکشی خود مختاری کا اعلانیہ نہیں۔ زندگی سے نجات پانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم بڑے شریر ہو

اور میری ہر ایسی کوشش کو بیکار بھی کر سکتے ہو۔ خدا بخش بے چارہ مسجد کی سب سے اونچی محراب سے چھلانگ لگا کر بھی زندہ ہے۔ کتنے ہی لوگ ریل گاڑی کے نیچے کچلے جا کر بھی نہیں مرے۔ بس اپاہج ہوگئے اور اسی حال میں سالہا سال جئے۔ مگر میں اس طرح جینا نہیں چاہتا۔ میں تم سے موت کی بھیک مانگتا ہوں۔ کیوں کہ بے مقصد و بے مطلب جینا اور دھرتی کا بوجھ بنے رہنا مجھے اب اچھا نہیں لگتا۔ میری رہنمائی کرو۔ جیسے میری زندگی کی تکون توڑی ہے، اسی طرح مجھے بھی توڑ دو"

مگر بھگوان مسکراتے رہے۔

"میں تمہاری اس اشتہاری مسکراہٹ کا کیا مطلب سمجھوں؟

مگر بھگوان نے کوئی جواب نہیں دیا اسی طرح اپنی رحیمانہ مسکراہٹ کی روشنی بکھیرتے رہے۔

بہت عرصہ تک یوں ہی کھڑے کھڑے جب وہ تھک گیا تو مندر کے ستون سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

"آج تو میں فیصلہ کر کے ہی جاؤں گا"

بیٹھے بیٹھے اس کے بے چین من کو تھوڑی شانتی اور اس کے تھکے ہوئے اعضا کو تھوڑا آرام ملا۔ پجاری کے منتروں سے اس کے منتشر دل و دماغ کو ماں کی لوری کا سا آبھاس ہوا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ سو گیا۔ کتنی ہی دیر اس کا بدن مندر کے اس ستون سے سکون پاتا رہا ——————

جب وہ جاگا تو شام ہو چلی تھی، اسے دیوتا سے اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملا تھا۔ کوئی ڈھارس نہ ملی تھی۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی اب لوٹ جائے گا۔ وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو پھر مرنے کے لیے اسے دیوتا کی اجازت کی ایسی کون سی ضرورت ہے۔ ایکا ایک اسے لگا کہ وہ ایک بہادر یودھا ہے اور اس کے بدن میں بھیم کی طرح سو ہاتھیوں کا بل ہے۔ جس نے موت کے خوف سے چھٹکارہ پالیا اس سے بڑا بلوان کون ہو سکتا ہے۔؟

اس نے تینوں بے جان مورتیوں پر رحم بھری آخری نگاہ ڈالی اور باہر نکل آیا۔

بھگوان کیا ہے؟

ایک مِتھیہ، چھلاوا، کمزوروں کا سہارا، زخمیوں کا مرہم، آدمی کے اختراعی ذہن کی ـــــ ایک فرسودہ ایجاد

"میں کمزور نہیں، زخمی بھی نہیں، وہی بھاگے ان سایوں کے پیچھے جو موت کے خوف سے ہراساں ہو یا جسے کوئی دنیاوی طلب ہو۔ میں کیوں بھاگوں؟"

ایکاایک وہ بلند آواز سے چلّایا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا"

شام کو مندر میں آنے جانے والے بھگت لوگ اس کے اس بلند اعلان کو سن کر ٹھٹھک گئے۔ جو کمزور تھے پرے ہٹ گئے، جو کمزور نہیں تھے انھوں نے اسے پاگل سمجھ کر راستہ دے دیا۔

اب وہ بستی کو لوٹ رہا تھا۔ چلتے چلتے اسے لگا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہی آوارہ کتا تھا جو پچھلے چند روز سے اس کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا ہوا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے مسکرا کر کتے کی طرف دیکھا

"میں یدھشٹر نہیں ہوں دھرم راج جو تمہیں بیکنٹھ لے چلوں گا۔ وہاں تو مجھے اکیلے ہی جانا ہے وہ سورگ ہے یا نرک ـــــ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں

وہ رکا تو کتا بھی رک گیا۔ اس نے چند قدم بڑھائے، کتا بھی چلنے لگا اتنی ہی دوری پر جتنی ان دونوں کے درمیان پہلے تھی۔ وہ پھر رک گیا۔

"تو تم نے جان لیا ہے کہ میں مرنے جا رہا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ بننا چاہتے ہو۔ مگر گواہی تم کسے دو گے۔ کون سمجھے گا تمہاری زبان؟

کتا کھڑے کھڑے دم ہلا رہا تھا اور بھری بھری ملائم آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس نے لوٹ کر کتے کے بدن کو بڑی شفقت سے سہلایا۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے دیکھا کہ کتے نے بڑے اطمینان سے آنکھیں میچ لی ہیں اور ایک انوکھی چاہت سے اس کی دم ہل رہی ہے۔

"تم میرے کون ہوتے ہو بھائی، جاؤ اپنا راستہ ناپو"

کتے نے سر ہلا کر جانے سے انکار کر دیا، تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"تم کس مٹی کے بنے ہو میاں کون ذات ہو۔ مگر ذات تو آدمی کی ہوتی ہے۔ میری اپنی کوئی ذات نہیں تو کیا ـــــ میرا نام تو ہے، تمہارا تو نام بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ تم بھی میری ہی طرح کوئی مجہول النسل چیز ہو۔ مجھے ایک غریب مزدور نے اسی ہری مندر کی دہلیز پر پڑے پایا تھا، لہٰذا اس نے میرا نام رام کرشن رکھ دیا ـــــ رام کرشن ایک غریب مزدور کے لڑکے کا نام ہی ہو سکتا ہے۔ آج کل کون اپنی چہیتی اولاد کو ایسے پرانے نام دیتا ہے ـــــ منوج، پنکج، دلیپ، راج، دیو، اشوک، ورنے، دویک یہ تو نام ہوئے نہ۔ رام کرشن بھی کوئی نام ہے۔ بابا مجھے رام کسن کہہ کر بلاتے تھے ان کا خیال تھا کہ میرے نام میں دیوتاؤں کے منتروں کی دھن ہے۔ مجھے دن میں دس بیس بار پکار کر وہ دیوتاؤں کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ انھیں عاقبت سدھارنے اور پربھو دھام جانے کا بڑا شوق تھا ـــــ

"بابا بھی کیا چیز تھے۔ چوروں کے کارخانے میں پورے چالیس سال ملازمت کرنے کے باوجود چور نہ بنے۔ انھوں نے کیسے مجھے لکھایا پڑھایا اور بی اے پاس کرا کر مل کے بڑے بابو کی لڑکی سے میری شادی بھی کرا دی۔ بابا اماں اور میں یہ میری زندگی کا پہلا مثلث تھا بابا گئے تو ستی سادھوی ماں نے بھی دیہہ تیاگ دیا۔ زندگی کا دوسرا مثلث تھا۔ میری بیوی رانی، میں اور ہمارا چاند ایسا بیٹا راجا۔ پہلا مثلث ٹوٹا تو دوسرا بن گیا۔ اب دوسرا بھی ٹوٹ گیا ہے مگر یہ سب میں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ تم اس طرح دُم ہلا رہے ہو اس طرح من لگا کر میری گاتھا سن رہے ہو، جیسے سب سمجھتے ہو۔ دھرم راج ہو نا۔ مگر پربھو میں یدھشٹر نہیں ہوں۔ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔ خود میرے پاس جب کچھ نہیں ہے تو تمہیں کہاں سے کھلاؤں گا ـــــ پھر ـــــ میں تو مرنے جا رہا ہوں"

جب اس نے دیکھا کہ اس کے پیار، دلار بلکہ دُھتکارنے کے باوجود کتا نہیں گیا تو اس نے بھی مناسب سمجھا کہ اس کا خیال چھوڑ دے اور چلا چلے جہاں اسے جانا ہے

مگر اسے کہاں جانا ہے۔ مرنے کے لیے لوگ کہاں جاتے ہیں۔ ریل کی پٹری، کسی بڑی عمارت کی سب سے اونچی منزل۔ تیز و تند دریا۔ گہرا سمندر، تیز طرار چھرا۔ بندوق کی گولی زہر کی پڑیا ـــــ وہ اسی ادھیڑ بن میں گم کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے اوپر سے کوئی نرم سی شے چپکے سے گزر گئی۔ یہ ایک کالے رنگ کا بڑا ہی ڈراونا سانپ تھا۔

کتا سانپ کو دیکھ کر زور سے بھونکا اور پھر حملہ کی غرض سے اس کی جانب لپکا

بھی مگر سانپ اتنے میں قریب ہی کی کسی جھاڑی جا چھپا تھا۔

موت کتنی قریب آئی تھی مگر کیسے چپکے سے سرک گئی گویا کہہ رہی ہو، ہر کسی کے مرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا۔ کتا آکر اس کے پاؤں کے اس حصہ کو چاٹنے لگا جس پر سے سانپ ابھی ابھی رینگ کر گیا تھا۔

وہ مسکرایا" نہیں نہیں مرے دوست، اس نے مجھے نہیں کاٹا۔ وہ کوئی سانپ تھوڑے ہی تھا وہ تو اشارہ تھا قدرت کا کہ مجھے ابھی کچھ دیر اور جینا ہے۔ تو کون ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں کون ہوں۔ رام کرشن، مگر کیا نام ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بابا، اماں، رانی، راجہ سب مر گئے۔ ایک ہی سال میں زندگی کے سارے نشان سارے نقطے اور زاویے مٹ گئے، مگر میں زندہ ہوں اور یہ سانپ ابھی ابھی بتا گیا ہے کہ مجھے ابھی اور جینا ہے ——

کتا دم ہلا کر اس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ چار بار۔

"ہم نے بھی چار بار اگنی کے گرد گھوم کر پھیرے لیے تھے اور وعدے کئے تھے کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ بڑے اہتمام سے اپنی زندگی کا دوسرا مثلث مکمل کیا تھا۔ مگر وہ بھی ٹوٹ گیا۔ پہلے چھوٹا نقطہ ٹوٹا پھر بڑا اور پھر —— میں اکیلا ہو گیا —— آدمی بڑا بے حیا ہوتا ہے —— میرا سب کچھ چلا گیا، مگر میں اب بھی زندہ ہوں ——

اب تم ساتھ دینے کے لیے تیار ہوئے ہو تو بھی مجھے خوف ہو رہا ہے کہ ان کی طرح تم بھی ۔"

کتے نے گردن جھٹک کر یقین دلایا کہ وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔

مقدس جانور ——

"میں بڑا منحوس ہوں دوست!"

اور تب اچانک ہی اس نے اسے دیکھا —— وہ درخت کے نیچے تنے کے سہارے گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ چھوٹی سی۔ معصوم بچی ایسی

"تم کون ہو؟"

"تم کون ہو ؟" لڑکی نے دہرایا۔ آواز میں بجلی ایسی کڑک تھی۔

"میں" وہ سوچ میں گم ہوگیا۔ وہ کہہ سکتا ہے وہ رام کسن ہے مگر یہ بھی کوئی تعارف ہے۔ نام تعارف تو نہیں ہوتا۔ بس نام ہوتا ہے اس سے تو صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مرد ہے۔ جواب نہ پاکر لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں تمہیں جانتی ہوں!"

"تم مجھے جانتی ہو؟"

تم ایک پاگل ہو۔ میری ماں کی طرح۔ تم کتے سے باتیں کرتے ہو۔ وہ ہر چرند پرند سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے۔ جو آدمی کی زبان نہیں سمجھتے ان سے وہی باتیں کرتے ہیں جو حواس باختہ ہوں۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے قریب کے ایک کھنڈر کی طرف اشارہ کیا "وہاں"

"وہ تو کھنڈر ہے۔"

میں تمہیں کوئی شہزادی دکھائی دیتی ہوں؟"

"تمہارا نام؟"

"عائشہ"

"تمہارے ابا، امی۔"

"ابا نہیں صرف امی۔ وہ بھی اب نہیں کے برابر ہے کیوں کہ پاگل ہے۔"

"تم اندھیرے میں بیٹھی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔"

"ڈر انھیں لگتا ہے جنہیں موت کا خوف ہوتا ہے میں ادھر اس لیے بیٹھی ہوں کہ اس جھاڑی کا کالا ناگ مجھے اپنی خلوت میں مخل ہونے سے ناراض ہوکر ڈس لے اور میں ایک دم مرجاؤں۔"

"تم تو ——— ابھی!"

"جوان ہوں۔ اسی لیے تو مرنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے کالے ناگ کا کاٹا پانی تک نہیں مانگتا۔ یوں تل تل مرنے سے ایک دم مرجانا کیا بہتر نہیں۔"

"تم مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو گی۔"

"کون ایسی دور ہے ۔ خود ہی چلے جاؤ نا ـــــ مگر وہ تم سے بات نہیں کرے گی"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ تم آدمی ہو، ایک مرد ہو، اور مردوں سے اسے نفرت ہے"

"وجہ ؟"

"میرا باپ"

"کہاں ہے تمہارا باپ ؟"

"کہا نا کہ نہیں ہے ۔ مر گیا کمبخت ۔ اچھا ہی ہوا کہ اپنے آپ مر گیا ورنہ اس کا خون میرے سر لگتا ۔ بڑا ظالم تھا ۔ ہر شب شراب پی کر ہم دونوں کو پیٹتا تھا ۔"

"تمہاری کہانی ذرا مختلف ہے مگر میری اپنی کہانی کی طرح ہی دردناک ہے ۔ مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو ۔"

لڑکی پھر ہنسی "اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے نا ۔ پاگل عورت ہے جانے کیا کر بیٹھے ۔"

"ڈر مجھے بھی نہیں لگتا کیوں کہ تمہاری طرح میں بھی موت سے نہیں ڈرتا ۔" پھر جیبے کتے کو ساتھ بتاتے ہوئے اس نے کہا ۔ "کیوں مولا بخش ٹھیک کہتا ہوں نہ میں"

"مولا بخش ؟ تمہارے کتے کا نام مولا بخش ہے ؟"

"یہ کتا میرا نہیں اور دیکھا جائے تو ہے بھی ۔ ابھی ابھی بخشا ہے مولا نے، سو میں نے اسے مولا بخش کہہ دیا ۔"

"میری ماں کے سامنے کتے کو نہ بلانا ۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ۔"

"میرا مطلب ہے میری ماں کے سامنے یہ نام نہ لینا"

"کیوں ؟"

"مولا بخش میرے باپ کا نام تھا ۔"

"تو تم لوگ مسلمان ہو ۔"

"عائشہ کیا کسی ہندو لڑکی کا نام بھی ہو سکتا ہے ؟ ۔"

"آج کل سب کچھ ہو سکتا ہے ۔ میرے مرحوم باپ کے ہندو کارخانہ دار کی بیٹی کا نام گل بدن تھا جب کہ وہ کوئلے کی طرح سیاہ فام تھی ۔ آج کل ناموں سے آدمی کا مذہب

یا ذات نہیں پہچانی جا سکتی ۔۔۔

"تم مسلمان نہیں ہو ؟"

"کون جانے ۔"

"تم نہیں جانتے ؟"

"نہیں "

"پھر اپنے کتے کو مسلمانی نام کیوں دیا ہے تم نے ؟"

"مولا بخش مسلمانی نام ہے یہ میں نے نہ سوچا تھا۔ تم نے کہا تمہارا نام عائشہ ہے۔ پہلے میں سمجھا تمہارا نام آشا ہے ، آشا یعنی امید ، مگر تمہارا تلفظ بڑا صاف ہے ۔ تمہارا نام سن کر میرا رام رحیم بن گیا اور کتے کو رام دتا یعنی رام کا دیا ہوا کہنے کی بجائے میں نے مولا کا دیا ہوا یعنی مولا بخش کہہ دیا ۔"

"تمہارا ذہن خاصا تیکھا ہے ، بہت تیزی سے سوچتا ہے ۔ تم دلچسپ آدمی ہو ۔"

"میں آدمی کہاں ہوں عائشہ ۔ میں تو ایک لاش ہوں ۔ اپنے ماضی کا بھوت" ۔

"تم بڑے اچھے بھوت ہو ۔ چلو تمہیں ماں کے پاس لے چلوں ۔ اسے زندوں کی نسبت بھوت اچھے لگتے ہیں ۔"

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ جسے اس نے پہلے ایک چھوٹی سی بچی سمجھا تھا وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی ۔ پھٹے حال ہوتے ہوئے بھی اس کے بدن سے زندگی کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف بکھر رہی تھیں ۔

"چلو مولا بخش ——"

اور وہ تینوں کھنڈر کی طرف چل دیئے ۔ اس نے سوچا ایک نئی تکون ابھر رہی ہے ، تیسری تکون ۔ ایک اجنبی نوجوان عورت ۔ وہ خود اور مولا بخش کیا زندگی لوٹ رہی ہے —— ایکا ایک اس نے پوچھا ۔

"تمہارا نام عائشہ ہے نا ، اور تمہارے ابا کا نام مولا بخش ۔"

"مولا بخش مرحوم ——"

ہاں مرحوم ۔ اور تم بھی مرنا چاہتی ہو اور تمہاری ماں انسان کی نسبت چرند پرند سے ہم کلام رہنے کو ترجیح دیتی ہے !!

"میں نے انسان کی بات کب کی۔ میں نے تو آدمی یعنی مرد کی بات کی تھی۔ تم کیا آدمی اور انسان کے فرق کو نہیں سمجھتے۔"

"تم تو سمجھتی ہو؟ پڑھی لکھی ہو نا!"

"اس میں کیا شک ہے، دسویں پاس ہوں" لڑکی نے بڑے فخر سے بتایا پھر کتے کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ تو ظاہر ہے کہ بے نسلے ہیں اور کوئی ایسے پڑھے لکھے بھی نہیں"

"میں بی اے پاس ہوں۔"

"میں ابا جان سے ہم کلام تھی تم سے نہیں۔ تم تو ظاہر ہے کہ خاصے پڑھے لکھے ہو۔"

"تم بڑی عجیب لڑکی ہو!"

"ہوں نا۔ وہ سب مجھے عجیب و غریب شے کہتے تھے"

"وہ کون؟"

"کالا آصف، میرا عاشق اور میری سہیلیاں۔"

"آصف کہاں ہے؟"

"اسے ابا جان نے کاٹ کھایا۔ ابا کو باولے کتے نے کاٹا تھا، ابا نے اسے کاٹ لیا اور اتنے زور سے کہ دونوں ایک ساتھ مرے۔ "خس کم جہاں پاک"

کھنڈر کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھی وہ ایک ٹک نیلے آسمان پر بکھرے ہیرے موتیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ انھیں آتا دیکھ کر بپھری۔

"تو پھر کسی کو لے آئی ہے گشتی؟"

"نا نا اماں۔ کنواری بیٹی کو گشتی نہیں کہتے!"

"تو پھر یہ کون ہے؟"

"ایک نایاب چیز —— انسان"

"یہ اس کے ساتھ کیا ہے۔"

"یہ ہیں تمہارے مرحوم شوہر مولا بخش۔ میرے ابا جان۔"

"یہ تو ایک بے نسلی کتا ہے ری۔"

"تمہارا شوہر کیا کسی بڑی نسل کا کتا تھا؟"

بیٹی کا جواب سن کر عورت مسکرائی۔ اندھیرے بھی اس کے سفید دانت چمک رہے تھے،

"یہ مرد —— تونے کیسے جانا کہ یہ انسان ہے ،،

"مجھے دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ہوس کی وہ لو نہ چمکی تھی جو ہر آدمی کی آنکھ میں ہر خوب صورت اور نوجوان لڑکی کو اکیلی اور بے سہارا دیکھ کر اپنے آپ ——— ،،

"تیرا نام ؟"

"رام کسن —— یعنی رام کرشن ،،

"تو تو کافر ہے ؟ ،،

"تم مومن ہو تو میں ضرور کافر ہوں ،،

عورت بولی۔ "مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ علم نہیں۔ مجھے مولا بخش یعنی اس کے باپ نے مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا پایا تھا۔ بیٹی کی طرح پالا مگر جیسے ہی میں جوان ہوئی۔ ابھی جوان بھی کہاں ہوئی تھی رے

"پھر وہی پرانی کہانی"۔ لڑکی نے ماں کو ڈانٹا، مگر عورت کہتی گئی۔ "تو اس نے مجھے اپنی داشتہ بنالیا۔ یہ لڑکی حرام کی اولاد ہے —— ،،

"حرام کی کیوں"۔ لڑکی احتجاجاً چیخی۔ میں کیا ابا کی بیٹی نہیں ،

"میں بھی تو اس کتے کی بیٹی تھی۔ میری کیا اس سے شادی ہوئی تھی ری۔ بغیر نکاح جنمی دوزخی، تو حرام کی اولاد نہ ہوئی تو کیا حلال کی ہوئی۔ وہ تو شکر کر کہ تیرے جوان ہونے سے پہلے ہی وہ حرام زادہ"

"تو، تو بازاری عورتوں کی طرح گالیاں بکتی ہے ،،

"تو کیا میں گھر کی عورت ہوں ری ۔ بازاری عورت اور کیا ہوتی ہے۔ تیرا باپ بازاری مرد تھا۔ آوارہ مجہول النسل کتا، ورنہ کون اپنی منھ بولی بیٹی سے ۔ ،،

"اب اس لمبی تمہید اور اس تعارف کے بعد کون اپنائے گا تیری بیٹی کو ۔ ،،

رام کرشن کے منھ سے اچانک نکل پڑا "میں اپناؤں گا تیری بیٹی کو اماں ! ،،

"اماں ! ! ارے تو نے مجھے اماں کہا۔ سن رہی ہو منیا۔ سن رہے ہو میاں مٹھو، اس انسان کے بچے نے مجھے۔ مولا بخش کی رکھیل کو اماں کہا ہے۔ تو جانتا ہے رے اس کا مطلب؟"

"مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ میں جو دو ماؤں کا حرامی بیٹا ہوں، ایک کا نام دیو کی

یا کوشلیا تھا دوسری کا یشودھا۔ ایک نے جن کر مندر کی دہلیز پر چھوڑ دیا دوسری نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اب دونوں ہی نہیں ہیں۔"

"میں تو ہوں رے، میں تیری اماں ہوں۔ مگر تو بہت دیر سے آیا" عورت نے قریب مرے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے مار ڈالا مگر اس سے ڈسے جانے کے بعد۔ اس کا زہر میرے بدن میں سرایت کر چکا ہے اور ہولے ہولے ——"

وہ چپ ہو گئی ایکا ایک اس نے ایک ہچکی لی اور ——"

"یہ وہی سانپ ہے جس کی مجھے کئی دنوں سے تلاش تھی" لڑکی بولی

"یہ وہی سانپ ہے جو میرے ننگے پاؤں کے اوپر سے ایسے رینگ گیا تھا گویا وہ کسی آدمی کے پاؤں نہ ہوں۔ راستے کے بے جان پتھر ہوں۔

بے جان! اس نے مجھے کاٹا نہ تھے جب کہ ہم دونوں کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس نے ماں کو کاٹ لیا۔ جس کا مرنے کا ابھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ مگر جسے اب مر تو جانا چاہیئے تھا۔"

"تمہاری ماں بہادر تھی۔ مری، مگر دشمن کو مار کر ——"

"وہ بہادر ہوتی تو کیا پیدا ہوتی میں —— وہ بہادر نہ تھی اسی لیے میں وجود میں آئی۔ میں اس کی بزدلی، اس کی کمزوری، اس کی بے حیائی کی نشانی ہوں"

"ہم دونوں کی ایک ہی کہانی ہے۔"

"کتا اب ان دونوں کے قریب آ گیا تھا اور باری باری دونوں کے ہاتھ پاؤں چاٹ رہا تھا۔ رام کرشن نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ہماری ہستی کے بکھرے اجزا جوڑ رہا ہے —— خدا کا قاضی —— بھگوان کا پنڈت —— گرجے کا پادری"

"مگر؟"

"مگر کیا!"

"میں تو کچھ نہیں ہوں۔ ایک یتیم بے سہارا غریب لڑکی۔ ایک صفر۔"

"میں خود بھی ایک صفر تھا مگر اب ایک اکائی بن گیا ہوں۔ تم میرے دائیں آجاؤ۔ اکائی اور صفر مل کر دس ہو جائیں گے۔"

"میں ایسے ہی یہیں کھڑی رہوں تو"

"تب تو میں اکائی ہی رہوں گا اور تم صفر۔"

''تو پھر مجھے تمہارے دائیں ہی رہنا چاہیئے۔ میں بھی اب صفر بن کر جینا نہیں چاہتی،،

''میں آج مرنے کے ارادہ سے نکلا تھا۔ بھگوان سے اجازت بھی مانگی تھی مگر اس نے میری رہنمائی نہ کی، الٹے رکھا دیئے۔ سدرشن چکر، تیر کمان، شنکھ، ترشول، کتاب اور قلم،،

''تم ہندو لوگ بڑے سیانے ہوتے ہو۔ شنکھ موسیقی اور انبساط کا سمبل ہے، کتاب اور قلم تخلیق کے اور سدرشن چکر، ترشول اور تیر کمان مرد کی طرح جینے کے۔ تم مورتیوں سے زندگی کا درس لیتے ہو جب کہ ہم مورتی پوجا کو کفر سمجھتے ہیں۔

''اقلیدس کیا مورتی نہیں؟''

''سیدھی لکیریں، گولائیاں اور زاویے مورتی نہیں ہوتے،،

''گولائیوں اور زاویوں کا گیان نہ ہو تو مورتی کہاں بنتی ہے،،

''ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔،،

''کیا یہ ممکن ہے میں میں اور تم تم ہی رہو اور ہم؟،،

''یہ ممکن نہیں!،،

''تو پھر؟،،

''ایک راستہ ہے۔ نہ تم تم رہو نہ میں میں رہوں۔ میرا مطلب ہے تم عائشہ تو رہو اور میں بھی رام کشن ہی رہوں مگر نہ تم مومن رہو نہ میں کافر نہ میں ہندو رہوں نہ تم ملیچھ،،

''ہم دونوں تو یوں بھی کچھ نہیں ہیں۔ حرامیوں کی نسل نہیں ہوتی، مذہب نہیں ہوتا، دھرم نہیں ہوتا۔ حرامی صرف مرد اور عورت ہوتے ہیں ــــــ مگر وہ مسکرائی ''حرامی ہوتے بڑے اچھے ہیں ــــــ،،

''خدا نے جب مرد اور عورت کی تخلیق کی تھی تو اس کا بھی غالباً کچھ ایسا ہی ارادہ تھا، شادی بیاہ، نکاح۔ یہ اُسی اُنھی کے پھیلائے ہوئے زہر ہیں، جس نے آدم اور حوا کو بے آبرو کرکے باغ عدن سے باہر پھنکوایا تھا۔،،

''تمہیں وہ پرانی کہانی یاد ہے۔،،

''کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ پھر اپنی ذلت کی کہانی کسے بھولتی ہے۔،،

''حیرت ہے کہ چرند پرند اور درند تو سمجھ گئے یہ کہانی۔ نہیں سمجھا تو وہی نہ سمجھا جسے خدا نے اپنے اسٹیج پر گھڑا تھا وہ اشرف المخلوقات تو ہے مگر اپنی ذات کو حصاروں میں اسیر کیے بغیر اسے

چین نہیں پڑتا ـــــ کھلی فضا میں اس کا دم گھٹتا ہے ـــــ بھیڑ و سماج کا بندر ـــــــــ،،

"آدمی فطرتاً لالچی، کمینہ اور کمزور ہے ،،

"اس کے برعکس حرامی ہونا کتنا دل فریب ہے۔ حرامی اکثر بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ جیسے سکندر، پانڈو، مہان یودھا کرن اور ہماری صدی کا وہ عظیم آدمی آئن اسٹائن ،،

"مرحبا۔ کیا منظر ہے۔ چاند نے اُبھر کر اُوپر اُٹھ کر اپنی پوری گولائی کو پالیا ہے اور اب کیسی مہربان روشنی پھیلا رہا ہے فضا میں۔ یہ طوطا یہ مینا۔ میرے ابا جان۔ یہ شکستہ و ویران کھنڈر کسی بے نام حکمراں کا باڑا۔ ایک مردہ عورت۔ ایک مرا ہوا سانپ ـــــــ،، کتا اب بھاگ بھاگ کر دونوں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

"دیکھ رہے ہو تم۔ ابا میاں کتنے خوش ہیں،،

"حیرت ہے کہ تمہیں اپنی جننی کی موت کا کوئی غم نہیں ،،

"وہ بزدل کی طرح بلا وجہ ایک طویل زندگی جی ـــــ مگر ایک بہادر کی طرح دشمن کی سے لڑکر اسے مار کر مری۔ وہ جو موت کے سامنے سرنگوں نہ ہوئی اس کے لیے روتے نہیں، فخر و احترام سے مسکراتے ہیں ،،

"میں بھی سوچتا ہوں موت جب آزادی بن کر آئے تو اس کا خیر مقدم ہی کرنا چاہیئے، میں نے مرنے کا طے کیا تھا تو بھی تھا کہ میں ایک بے خوف اور طاقتور انسان ہوں اب جینے کا منصوبہ بنا رہا ہوں تب بھی اپنے آپ میں وہی حوصلہ وہی طاقت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کیسی عجیب کیفیت ہے ـــــــ،،

"تم ایک بہادر عورت کی بہادر بیٹی کو اپنا رہے ہو۔ ایک مرد ایک عورت کی ذات اور مان مریادہ جانے بغیر اسے سماجی کسوٹیوں پر جانچے پرکھے بغیر،،

"آج میں واقعی بہت خوش ہوں۔ میں جینا چاہتا ہوں ،،

"موت کے دروازے سے لوٹا ہوا ہر آدمی جینا چاہتا ہے ـــــ میں بھی جینا چاہتی ہوں، صفر بن کر نہیں تمہارے ساتھ مل کر صفر سے دس بن کر ـــــ یہی وہ لمحہ ہے جو ہمیں ایک سے دس بنا سکتا ہے۔ تم ہو ـــــ میں ہوں ـــــ ابا میاں ہیں۔ مثلث مکمل ہے۔ مگر دونوں نے دیکھا۔

مولا بخش وہاں نہیں تھا ایکا ایک بجانے کہاں ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔

ہائی پو کونڈریاسس

"سلطان صاحب آپ بڑے گاؤدی ہیں، اب یہ سالن کیا آپ کے ابا مرحوم کھائیں گے کمبخت زہر ہو رہا ہے ۔"

سلطان میاں چپ چاپ کمرے کے کونے میں کھڑے رضا بھائی کی گالیاں سُن رہے تھے۔ بیچارے کہتے بھی کیا، حرکت ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی ان سے ۔

"لے چھوڑ غصّہ اور کھا موتی چور کے یہ لڈو۔ جب تقدیر میں لڈو لکھے ہوں میاں تو سالن سالا کیا کرے گا۔"

"تو ہر بڑی بات کو سکیڑ کر چھوٹی اور غیر اہم بنا دیتا ہے۔ تیری یہ حرکت مجھے قطعی نہیں بھاتی۔ کل دوپہر سے میں نے ڈھنگ کا کچھ نہیں کھایا۔ اللہ قسم رات بھر کام میں مصروف رہا۔ صبح ناشتہ کے لیے آنجناب مرغ بھون رہے تھے۔ چنداں چاہتے ہوئے بھی چائے کے ساتھ ہم نے کچھ نہ لیا۔ مبادا مرغ کے ساتھ ناانصافی ہو جائے اور مرغ پکا ہے تو —"

"بھئی ایسی بھی کیا بات ہے ؟"

"تو خود ہی چکھ کر دیکھ لے نہ ۔"

"ارے تھوک غصّہ یار میرے اور چل میرے ساتھ آج شیرِ پنجاب میں مرغ مسلّم کھلاتا ہوں اس نمک بھرے مرغ کا بھی کچھ کریں گے ، مگر بعد میں۔"

"تو میرا ایمان خراب کرنا چاہتا ہے ؟"

"اتنا کمزور ہے تیرا ایمان جو ایک اچھے بھلے سکھ کے ہاتھ کا کاٹا اور پکا مرغ کھانے سے ہی متزلزل ہو جائے گا۔ میں روز تیرا گوشت کھاتا ہوں۔ میرے ایمان کا تو کچھ نہ بگڑا۔"

میرا گوشت تو کیوں کھائے گا کمبخت ــــ مگر تو تو کافر ہے۔

علی رضا کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے سلطان میاں کی طرف دیکھ کر مسکرائے ـــــــــ "ایکٹر بننے آئے تھے بمبئی میں، بیچارے کوئی خاندانی باورچی تھوڑے ہی ہیں۔"

سلطان نے بتیسی نکالی۔ اچھا خاصہ دلہن بننے کی صلاحیت تھی اس کے چہرے میں۔ آواز بھی ماشاء اللہ خاصی مردانہ تھی۔

"اب آپ کی سزا یہی ہے کہ لڈو چباتے چباتے دفع ہو جائیں اور سیدھے سینٹرل سٹیڈیو پہنچیں اور وہاں منیر میاں کا پکا ہوا مردہ کتوں کا چرغہ کھائیں۔"

سلطان کی جان میں جان آئی، بڑی مسکین ادا سے ذرا اور کھل کر مسکرائے۔ چلنے ہی لگے تھے کہ رضا نے حکم فرمایا: "یہ میرا دس سیر کا بستہ بھی اٹھا کر لے جائیں ۔ میں کافر ہونے جا رہا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

اس روز دوپہر دو ڈھائی کے قریب ہم بیلا ڈ بیئر لوٹے تو دیکھا کہ علی رضا کا وہ ایک ہی کمرہ والا فلیٹ مقفل ہے۔ دروازہ پر ایک بھاری بھرکم علی گڑھی تالا لگا تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے نجی بریف کیس کے علاوہ چند ضخیم کتابیں، تھوڑی سبزی اور پولسن کا پاؤ بھر مکھن بھی تھا جو ہم صبح والے گوشت کو سنوارنے کی غرض سے لیتے آئے تھے۔ اب یہ ساری خرافات کہاں پھینکیں۔ ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اچانک نگاہ اسی کمرہ کے ساتھ والے دروازے پر جا ٹکی جس کے اوپر والا روشندان کچھ اس ترتیب سے کھلا تھا کہ اس میں سے چھوٹی موٹی چیزیں بڑے مزے سے اندر پھینکی جا سکتی تھیں۔ ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے کتابوں کا بنڈل کھولا اور ایک ایک کر کے ساری کتابیں یکے بعد دیگرے اندر پھینکنا شروع کر دیں۔ جب سبزی کی باری آئی تو اصل مشکل پیش آئی۔ اب اس موٹی تازی لحیم شحیم لوکی کو کس طرح اندر گھسیٹریں۔ جیسے ہی اُچک کر ہم نے روشندان کے ادھ کھلے پاٹ کو مزید کھولنے کی غرض سے پکڑا، دروازہ پر ہمارا بوجھ بڑھتے ہی اس کا ایک پٹ کھل گیا اور ہم اندر گرتے گرتے بچے۔ ہم ایکدم ہکا بکا رہ گئے۔

دروازہ کے اندر قدم ڈالتے ہی کیفیت سمجھ میں آ گئی۔ دروازہ میں ایک ہی چٹخنی تھی جو غلط تختہ پر لگی تھی۔ اور یہ دروازہ تب سے اسی طرح کھلا تھا جب سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی یا یہ دروازہ

بنا تھا ـــــ یعنی لعنت ہے ایسی الغرضی اور لاپروائی پر۔ پورے دو سال سے حضرت اس کمرہ میں تشریف فرما ہیں اور ـــــ بھئی حد ہوگئی۔

آنے دو علی بابا کو ہم بھی نہ بتائیں گے کہ بغیر تالا کھولے ہم اندر کیسے گھسے۔

اب اگر بغرض محال شام تک ان لوگوں میں سے کوئی بھی ادھر نہیں آتا۔ تو ہم کریں گے کیا۔ اب جبکہ ہم نے جان ہی لیا ہے کہ کمرہ محفوظ نہیں تو اسے اس طرح بے سہارا چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہیں، خدا نہ کرے اگر کچھ ہو جائے تو ؟

کیا ہو جائے گا۔ کمرہ میں ہے ہی کیا۔ دو معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے اٹیچی ہیں۔ دو تین درجن کتابیں ہیں چند پرانی سکرین پلے کی سکرپٹس اور کچھ برتن۔ ہوسکتا ہے کچھ نقدی وقدی بھی کہیں رکھی ہو کسی کونے میں۔

اب تو آپ اس کمرہ کے قیدی ہیں حضرت۔ تب تک نظر بند رہئے جب تک کہ ان لوگوں میں سے ایک آدھ آکر آپ کو نجات نہیں دلا دیتا۔

مگر وقت کیسے کٹے گا۔ کچھ پڑھا جائے، مگر پڑھنے والی عینک تو ہم اپنے ہوٹل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ چلو سالن کو دیکھتے ہیں۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور شام کا کھانا بھی تیار ہو جائیگا۔ یہی ٹھیک رہے گا۔ سلطان میاں دعائیں دیں گے ـــــ

باقی کہانی، یعنی اس کہانی کا اصلی پلاٹ بتانے سمجھانے کے لیے ہمیں آپ کو اس کمرہ کا پورا جغرافیہ سمجھانا ہوگا۔ دو اطراف ننگی دیواریں، ایک طرف دو دروازے، ایک بیکار جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، اور ایک مقفل یعنی جس پر باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ اِس، یعنی ان دروازوں والی دیوار کے سامنے والی دیوار میں دروازوں کے عین سامنے دو بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جو پاٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ البتہ لوہے کی موٹی موٹی مضبوط سلاخوں نے انہیں چوروں سے محفوظ کر رکھا ہے۔ مقفل دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے بالمقابل پانی کا نل ہے جسے دو ڈھائی فٹ کی دوطرفہ دیوار نے کمرہ سے کسی قدر علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ جگہ فلیٹ کے مکینوں کا باتھ روم ہے۔ اور کپڑے اور برتن دھونے مانجنے کا کونہ بھی۔

جیسے ہی ہم نے کاٹنے کی غرض سے لوکی کو ہاتھ میں پکڑا ' چٹاخ ' کی آواز آئی اور ساتھ والے مکان کی ہمارے عین سامنے والی کھڑکی تڑاخ سے کھل گئی۔ سامنے جو منظر تھا، وہ زندگی میں ایک ہی بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس بھی نہیں۔

لیجئے آپ بھی دیکھئے۔ مگر آپ تو تبھی دیکھ سکیں گے نہ جو ہم دکھا سکیں گے۔ خیر کوشش کرنے میں کیا قباحت ہے۔

ہاں تو صاحب سامنے والا گھر ہمارے والے اس گھر کے عین بالمقابل ہے اور دونوں کے درمیان بہ مشکل چار چھ فٹ کی خلا ہے۔ جس میں دونوں گھر کے مکین یعنی کرایہ دار اپنے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ بلا تکلف دن رات پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہی ایسا کمرہ اُدھر دوسری طرف بھی ہے اور اس میں بھی ہماری ایسی ہی کھڑکیاں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پانی کا نل جو اس کمرہ میں بھی ہے ہمارے نل والی کھڑکی کے بالمقابل نہ رہ کر ہماری دوسری والی کھڑکی کے سامنے بنا ہوا ہے۔ اور ہمارے نل والی کھڑکی کے سامنے جو کھڑکی ہے، اور جو کُھل اور بند بھی ہو سکتی ہے، اس میں ایک دبیز صوفہ چیئر رکھی ہے، جس پر ایک خاتون بڑے سکون سے ٹانگیں پھیلائے ننگ دھڑنگ بیٹھی ہیں۔ ان کے بیٹھنے کے انداز میں کوئی ادا یا تکلف نہیں گویا وہ اسی طرح بیٹھنے کی عادی ہوں۔

ان کے قدموں میں انھیں کی طرح ننگ دھڑنگ ایک مسکین سی قسم کا شہدہ مُکڑا سمٹا بیٹھا ہے۔ خاتون کے ہاتھ میں ایک سوئگر سٹک ہے۔ بالکل ایسی جیسی بڑے فوجی افسران کے ہاتھوں میں اکثر دیکھی جاتی ہے۔

شہدہ بیچارہ نہتا ہے۔

عورت نے ہمیں دیکھا تو مسکرائی۔ جھجھکی وغیرہ کچھ نہیں۔ شہدہ نے البتہ ہماری جانب دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

عجیب وغریب منظر ہے۔ ہے نہ۔

منٹ دو منٹ بعد شہدہ کا ہاتھ محترمہ کی پنڈلیاں سہلاتے سہلاتے ان کے گھٹنوں کے اوپر سرکنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ پر زور سے چھڑی کا وار پڑتا ہے۔ وہ اسی طرح مار کھائے جا رہا ہے مگر اپنی اس حرکت سے باز نہیں آ رہا۔ وہ پوز بدلنے کے لیے بھی ذرا اوپر اٹھنا چاہتا ہے تو چھڑی حرکت میں آجاتی ہے اور اس کے نیم گنجے سر پر۔

ہم بے بس ہیں کھڑکی بند نہیں کر سکتے اور ترکاری بنانے کاٹنے کے لیے دوسری کوئی جگہ بھی کمرہ میں نہیں ہے۔

ہم سوچتے ہیں۔ ہم مرد ہیں۔ جب عورت کو شرم نہیں تو ہم ہی کیوں موم کی طرح حیا کی تپش میں

پگھلتے جائیں۔

اب ہم بھی اس کھیل میں ذہنی طور پر ہی سہی، باقاعدہ شریک ہیں۔ ہم سبزی کاٹتے جاتے ہیں اور سامنے کا منظر بھی دیکھتے جاتے ہیں، عورت کی اشتہاری مسکراہٹ میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دونوں اپنے اس عجیب وغریب کھیل یا تنازع میں پوری دلچسپی سے مصروف ہیں۔

ہم نے لوکی کاٹی، پیاز لہسن، ادرک اور ٹماٹر کاٹے۔ سٹوو جلایا، اس پر پیاز لہسن اور چھلا ہوا ادرک بھوننا شروع کیا۔ مسالہ بھُن کر تیار ہو گیا تو ہم نے اس پر صبح کے سالن کا شوربہ گوشت الگ کر کے ڈال دیا۔ پھر لوکی بھی ڈال دی۔ دس پندرہ منٹ بعد جب لوکی نیم تیاری کو پہنچ گئی تو ہم نے اس میں علیحدہ رکھا ہوا گوشت بھی ڈال دیا۔ اتنے میں بھی سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی نہ وہ غریب مسکین اپنی مجنونانہ حرکت سے باز آیا نہ وہ عورت اور نہ اس کی چھڑی۔

یہ عورت ہے کون؟ کوئی پیشہ ور طوائف۔ کوئی بگڑی ہوئی فلمی ایکٹرس کوئی بیمار مغز سلٹ یا پھر کوئی تشنہ آرزو، سادیت کی مریضہ

اور وہ آزردہ و مغموم خبیث۔ یہ آدمی ہے یا سنڈاس کا کیڑا۔

عورت خاصی قبول صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی کافی حسین رہی ہو گی۔ مگر اب تو ——

وہ جس انوکھی ادا سے اپنے پاؤں سے لپٹے اس خبیث کتے کو جنسی ایذا پہنچانے کا لطف لے رہی ہے اس سے بھی اس کے کردار کی کوئی واضح تصویر نہیں بنتی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ بیچاری بے حد اداس بھی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جیسے ہم لمحہ بھر پہلے اس کی اشتہاری مسکراہٹ کہہ رہے تھے، وہ دراصل بڑی ہی دلگیر ملول اور حزیں مسکراہٹ تھی گویا وہ عورت کسی بڑے ہی اندوہناک تجربہ سے گزر رہی ہو اور اس کا مضروب ساتھی اپنے کمزور ہاتھوں کی مضراب سے جن تاروں کو جھنجھنانا چاہتا ہے وہ ڈھیلے پڑ کر کب کے بے آواز ہو چکے ہیں۔

اور یہ سب۔ سب کا سب۔ ناقابل اصلاح ہے۔

ارے یہ کیا ہم تو بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں ان انجانے لوگوں کے بارے میں۔

لعنت ہے ہم پر۔

اچانک ہمارا سارا وجود نفرت اور حقارت سے بھر جاتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ سارے کا سارا گرم گرم شوربا پھینک کر اس خبیث مرد کی چاند اور عورت کی رانیں جلا دیں۔

یہ ہم نے سوچا ہی۔ خدا کا شکر ہے کہ کیا نہیں۔ ہم ایک بڑے ہی کمزور دل اور یتیم قسم کے

آدمی ہیں۔ بے گناہی کی ندامت سے ہم اپنے اندر ہی اندر ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ جم کر اُبھر کر کچھ کر گزرنا ہم سے کبھی نہیں بنا۔

گوشت اور سبزی چکھی تو لطف آگیا۔ نمک مرچ مسالہ سب مناسب اور ذائقہ ایک دم اے ون۔ اب سالن کو اے ون بنانے کے لیے ہم نے اپنا آخری اور برسوں کا آزمودہ حربہ استعمال کیا اور پاؤ بھر مکھن کی ٹکیہ سالن میں ڈال کر دیگچی بند کر دی۔ اور اسٹوو بجھا دیا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور رضا، عباس اور سلطان تقریباً ایک ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے۔

ہم نے ایک نظر ان لوگوں کو دیکھا اور پھر گھوم کر سامنے والی کھڑکی کی طرف، مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔ کھڑکی کب بند ہوئی، دروازہ کھلنے سے پہلے، بعد، یا ایک ساتھ۔

ہم اندر کیسے آئے۔ ہم نے اندر آ کر کیا دیکھا۔ ہمارے پاس دو دلچسپ کہانیاں تھیں۔ مگر ہم نے چپ رہ کر آنے والوں کے ردِ عمل سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے زبان بند رکھی۔

وہ تینوں چپ چاپ ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

اور ہم مزے سے مسکرائے جا رہے تھے۔

"تم اندر کیسے آئے ہو؟"

"جیسے تم آئے ہو۔"

"کیا بکتے ہو!"

"بکنے کی اس میں کون سی بات ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اندر ہوں اور اندر آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ کھڑکیوں سے تو ظاہر ہے کہ میں گھسا نہیں۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔"

"تم علی بابا ہو کر پوچھتے ہو۔ میں نے کہا 'کھل جا' اور دروازہ کھل گیا۔ شکر کرو کہ میں چالیس چوروں کا سرغنہ نہیں ہوں، اور میں نے تمہارا کوئی خزانہ بھی نہیں چرایا۔"

علی رضا نے اپنے ساتھیوں کی طرف مشکوک انداز سے دیکھا۔

وہ بُت بنے، بوکھلائے کھڑے تھے۔

"مجھے دیوی کا وردان ہے علی بابا۔ میں چاہوں تو تمہارے دیکھتے دیکھتے دیوار میں تحلیل ہو سکتا

ہوں۔ آزمانا منظور ہو تو پھر سے دروازہ مقفل کر کے نیچے سڑک پر اتر جاؤ، میں تمہیں وہیں مل جاؤنگا۔
تب علی رضا نے جو قہقہہ پر قہقہہ لگانا شروع کیا تو عباس اور سلطان تو جیسے سکتے میں آ گئے۔
ہم سمجھ گئے کہ اس کی تیز نگاہوں نے دوسرے دروازہ کی غلط تختی پر چپکی چیونگم پہچان لی ہے
ہم نے بھی جواباً ویسا ہی پُر بہار قہقہہ لگایا۔
ہنستے ہنستے ہم دونوں بے حال ہو رہے تھے۔ کافی دیر بعد جب یہ سلسلہ ذرا تھما تو علی رضا نے ہمارا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بھئی مان گئے ہم تمہیں۔ ہم دو سال سے اس سالی کھولی میں جھک مار رہے ہیں اور تم نے ایک ہی نظر میں بھانپ لی۔ اس کی اتنی بڑی کمزوری۔''
عباس اور سلطان ابھی تک ویسے ہی چُپ چاپ کھڑے تھے۔
ہم نے جواب دیا۔ ''بھانپا ہم نے بھی کچھ نہ تھا۔ بس اتفاق ہی سمجھو۔ جو ــــــ
عباس نے غرا کر کہا۔ ''اب چھوڑو یہ لطیفہ بازی اور ہمیں بھی بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے۔''
''دروازہ کھول کر۔''
''مگر وہ تو مقفل تھا۔''
''تالا کھولا نہیں جا سکتا۔''
''مگر چابی؟'' سلطان نے اپنی بساط کے مطابق جرح کی۔
''ارے احمق، چابی تو اور بھی بن سکتی ہے۔ یہ پوچھو کہ وہ دروازہ کھول کر اندر تو آ گئے، پھر باہر سے دروازہ پر قفل کس نے ڈالا۔''
بڑا مزہ رہا جب علی رضا نے اپنی دیرینہ حماقت کی تشریح فرمائی۔
''کمبخت نے ہنسا ہنسا کر بھوک بھڑکا دی ہے۔ جائیے جناب سلطان صاحب اور کافروں کی دوکان سے درجن تندوری روٹیاں اور قورما لے آئیے۔''
''گھر میں آٹا نہیں ہے کیا۔''
''آٹا تو ہے مگر وہ صبح والا سالن کون کھائے گا۔''
''تم روٹی پکاؤ سلطان میاں، سالن کا انتظام ہم کیے دیتے ہیں۔''
''ابے چھوڑ کبیر نے بھانجے۔ صبح ناشتہ پر پورے دس اڑا دیئے تھے تو نے۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔''

وشو کرما۔

اور ہم نے دیگچی کا ڈھکن پلٹ دیا۔ سالن کی خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو اُٹھا۔

علی رضا نے ایک بوٹی منہ میں ڈالی اور تالی بجاتے ہوئے چلایا۔

"انقلاب ــــــ خدا قسم تو دنیا کا سب سے بڑا باورچی ہے۔"

٭ ٭ ٭

کھانے کے بعد سلطان شام اور اگلی صبح کے لیے سبزی، انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ لینے چلا گیا، اور عباس ریڈیو اسٹیشن خبریں پڑھنے۔

"تم اس گھر میں دو سال سے رہ رہے ہو؟"

"دو سال تین مہینے سے!"

"یہ سامنے والا گھر اور تمہاری یہ بلڈنگ تقریباً ایک سے ہیں۔"

"تقریباً نہیں، قطعی ایک جیسے۔ دونوں عمارتیں ایک ساتھ ایک ہی آدمی نے بنوائی تھیں، حاجی دستگیر صاحب نے جو کبھی بمبئی میں پہلے نمبر کے ڈرائی فروٹ مرچنٹ تھے۔ اب یہ دو سگے بھائیوں کی ملکیت ہیں۔"

"اور ہمارے اس کمرے کے سامنے والے کمرہ میں جو غالباً ہماری ہی طرح کا ہے اس میں کون صاحب رہتے ہیں؟"

اس پر علی رضا قدرے چونکے۔ "تو تم نے بھی؟"

"تو کیا اس سے پہلے تم میں سے بھی کسی نے وہ سب دیکھا ہے جو آج ہم نے دیکھا؟"

"تم نے دیکھا؟"

ہم نے ڈرامائی انداز میں حاتم طائی کی طرح فرمایا: "ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔"

"بکواس بند کرو اور سناؤ سارا قصہ۔"

ہم نے بکواس بند کر دی اور سارا قصہ جوں کا توں بغیر مرچ مسالہ لگائے یا سجائے سنوارے سُنا دیا۔

یہ سب تو پہلے کسی نے نہیں دیکھا، مگر عباس اور مجروح صاحب بتا رہے تھے کہ انھوں نے اس کمرہ میں ایک مرد عورت کو ننگے گھومتے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطرناک بات ہے، اور

ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ حج کے دن قریب ہیں۔ لکھنؤ سے درجنوں بزرگ بمبئی آئیں گے اور یہیں ٹھہریں گے۔ ان کے رہتے بھی ان لوگوں نے کوئی ایسی ہی حرکت کر ڈالی تو وہ کیا سوچیں گے۔ سیدزادے نے انہیں کیسی منحوس جگہ ٹھہرایا ہے۔ ابا پہلے ہی ہماری فلمی وابستگی سے پریشان ہیں۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

کیوں نہ آج ہی بلکہ اسی وقت۔

اگلے پانچ منٹ میں ہم دونوں بغل والی بلڈنگ کے کمرہ نمبر سات کے سامنے کھڑے گھنٹی بجا رہے تھے۔

اندر سے ایک مہین سی نسوانی آواز آئی۔ "کون صاحب ہیں؟"

"ہم آپ کے پڑوسی ہیں۔" علی رضا نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ان کے لہجہ میں غصہ وغیرہ ایسی کوئی علامت نہ تھی۔

دروازہ کھلا۔ "آیئے تشریف لایئے۔"

تھیں تو یہ وہی دوپہر والی خاتون ہی مگر کالے کنارے والی سفید سوتی ساڑی اور آدھے بازو والے نیم سفید بلاؤز میں ملبوس، وہ اب قطعی نئی ہستی لگ رہی تھیں۔

بڑی بڑی، کالی کالی معصومیت سے دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی پُراسرار آنکھیں، چوڑی پیشانی، خوش رنگ چہرے پر انوکھی سجاوٹ سے سجی سجائی، ستواں ناک، بھرے بھرے نیم سُرخ ہونٹ اور سفید موتیوں ایسے بے داغ دانت۔

بھرے بھرے مگر کس کر تنے ہوئے خوبصورت جسم والی یہ عورت راجہ روی ورما کا کوئی ماڈل لگتی تھی دمینتی رادھا، سیتا۔ کوئی بھی۔

بڑا وقار تھا اس عورت کے سرتا پا وجود میں۔ کچھ عجب تمکنت سے آنکھیں جھپکائے بغیر وہ ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کوئی سوال تھا نہ جھجھک نہ شکایت۔ نہ ندامت ہی۔

قدرے جھجھک کر علی رضا نے کہا۔ "ہم آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں۔"

"میں آپ کو جانتی ہوں رضا صاحب۔"

"یہ ہمارے دوست ہیں!"

"میں انھیں بھی جانتی ہوں۔"

"تو گویا ..... "

"میں ہی کیا اڑوس پڑوس کا ہر آدمی آپ کے نامِ گرامی سے واقف ہے۔ آپ چائے لیں گے یا کہ ٹھنڈا ؟"

" جی ہم ——— "

" دیکھئے آپ پہلی بار ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ اتنی عزت بخشی ہے تو تھوڑی اور بھی ——— "

" آپ ضرور ہی کچھ پلانا چاہتی ہیں تو ہم لوگ چائے لے لیں گے "۔

شکریہ کہہ کر وہ پردے کے پیچھے چلی گئی جو کمرے کے بیچوں بیچ کھنچا ہوا پارٹیشن تھا۔ کمرے میں دو گاڈریج کی الماریاں تھیں۔ گہرے ہرے رنگ کا لیدر صوفہ تھا۔ کتابوں کی خاصی بڑی الماری اور لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی۔ ہر چیز قیمتی تھی، اگرچہ کسی قدر پرانی۔ کمرہ علی رضا والے کمرے جیسا ہی تھا۔ اتنا ہی لمبا چوڑا مگر دونوں کی ترتیب و تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دیواروں پر چند ہی تصویریں تھیں، مگر سب کی سب ایسی کہ جنہیں ایک ہی نظر دیکھتے ہی صاحبِ خانہ کے بلند ذوق و شوق کا پتہ چلتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھی خاصے بھاری اور قیمتی پردے ٹنگے تھے۔

عورت چائے لے کر آ گئی۔ چائے کے ساتھ اس نے درجن بھر کباب بھی سینک لیے تھے ٹرے میں چار پیالے تھے۔

چوتھا پیالہ کس کے لیے تھا۔ یہ ہم پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی ہم دنگ رہ گئے۔ یہ وہی دوپہر والے حضرت تھے، مگر پتلون اور بش شرٹ میں ان کی شخصیت اب قطعی دوسری تھی۔

چھوٹتے ہی چہکے " ارے رضا صاحب ! آپ ہیں ؟ "

محترمہ نے نووارد کو ہم سے متعارف کراتے ہوئے فرمایا ! " یہ ہریش بابو ہیں، فلموں میں کام کرتے ہیں۔ "

جواب میں ہریش بابو مسکرائے اور محترمہ کی طرف دیکھ کر بولے " ان سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔ آپ سعیدہ بیگم ہیں۔ آپ کی ہم وطن اور آپ ہی کی طرح سعید زادی بھی۔ ۔ "

ہم لوگ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فلموں کی باتیں، ادب و آرٹ، مقامی سیاست اور گرد و نواح کی باتیں۔

ہریش بابو اور سعیدہ بیگم دونوں خاصے پڑھے لکھے، ذہین اور سلجھے ہوئے مذاق کے بڑے لوگ تھے۔ جنہیں ناشناس زندگی نے چھوٹے لوگوں کی طرح جینے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ میاں بیوی تھے یا بن بیاہے ہی میاں بیوی کی طرح رہ رہے تھے۔ جو بات ہم سے پوچھتے نہ بنی تھی وہ آخر علی رضا نے پوچھ ہی لی۔ جواب میں ہریش بابو مسکرائے۔

"میں نے ان کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے مذہبی عقاید میں کبھی مخل نہ ہوں گا اور اپنا نام بھی تب تک نہ پہناؤں گا جب تک کہ یہ نام واقعی اس قابل نہ ہو جائے، لہٰذا یہ آج تک سعیدہ بیگم ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک کسی قابل نہ ہو سکا، میں دس برسوں سے فلموں میں ہوں۔ سبھی مجھے اچھا ایکٹر مانتے ہیں مگر آج تک مجھے کوئی ایسا رول نہیں ملا جو مجھے وہ مقام دلا سکتا جس کا میں حقدار ہوں۔ سوائے پولیس افسر اور جج کے میں نے آج تک کوئی کردار نہیں کیا۔ حالانکہ ——————" وہ یکایک رُک گئے۔ ہم نے دیکھا کہ محترمہ بھی کچھ کہنا چاہتی ہیں۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" پھر رضا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

"رضا صاحب، یہ غلط فرما رہے ہیں، میرا نام 'سعیدہ ہریش' ہے۔ اور یہ میں پورے فخر سے کہہ رہی ہوں۔" ان کے لہجہ میں پیار بھری شکایت تو تھی ہی وہ یقین بھی تھا جو اپنی کہی منوا لینے کا دم رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم کوئی دو گھنٹہ بعد لوٹے تو آتے ہی کپڑے بدل کر لیٹ گئے۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

آخر ہم سے رہا نہ گیا۔ "تم سوچ رہے ہو کہ اس عجیب و غریب جوڑے کے بارے میں جو واقعہ ہم نے تمہیں ابھی ابھی سنایا تھا من گھڑت تھا۔"

"نہیں۔" رضا کا جواب مختصر تھا۔

ہم دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"تم تحت الشعور کی ہپناٹک طاقتوں کے قائل ہو کہ نہیں۔"

"تو تم ؟"

"آدمی کے ذہن کے تہہ خانوں میں نہ جانے کیا کیا چھپا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے

جو دیکھا یعنی تم جو سمجھتے ہو کہ تم نے واقعی دیکھا تھا، وہ تم نے دراصل دیکھا نہ ہو۔ وہ سب تمہارا تصور یا کوئی خواب آوارہ ہی ہو۔"

ہمیں غصّہ آرہا تھا۔" ہم نہ صرف جاگ رہے تھے علی بابا بلکہ باقاعدہ کام کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ہم نے ہی نہیں، تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ ہم سے پہلے عباس میاں اور مجروح صاحب نے بھی۔"

" کبھی کبھی آدمی جاگتے جاگتے بھی سویا سویا سا ہوتا ہے۔ اب تم خود ہی غور کرو تم کس طرح اچانک اس کمرہ میں داخل ہوئے۔ ایک بار اندر آگئے تو لوٹ نہ سکے کیونکہ اس طرح کمرے کو کھلا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے جانا تمہاری نظر میں مناسب نہ تھا۔ اب تم کمرے میں اکیلے تھے، تمہارے سوچ کی اُڑان تمہیں کہیں بھی لے جا سکتی تھی۔ اب اس حالت میں یا تو تم کوئی ایسی شعوری حرکت کرتے جو تمہارے لیے بغیر کہیں جائے ممکن ہوتی یا پھر تم سے دوسرے عامیانہ کام کراتی۔ آدمی کا شعور اسے اپنے غیبی ساتھیوں یعنی تحت الشعور اور لاشعور کے حوالے بھی کبھی کبھی کر دیتا ہے۔"

" بکواس بند کرو۔" ہمیں اب واقعی غصّہ آرہا تھا۔

میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہے، مگر ہم دونوں نے ابھی ابھی تمہاری کہانی کے جن دونوں کرداروں کو دیکھا ہے، وہ کیا ــــــ؟"

یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو دیکھا، وہ درست تھا، مگر جس کیفیت کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ہماری بجائے اس وقت اُن دونوں پر طاری تھی ــــــ

ہو سکتا ہے۔ آدمی واقعی بڑی خبیث شے ہے۔ البتہ مناسب یہی ہے کہ ہم اب مان لیں کہ

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا ــــــــ
جو سُنا، افسانہ تھا ــــــــ

مہک —

بوڑھی خادمہ نسرین دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھی۔ جھجکتے جھجکتے ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا اور بڑی عاجزی اور انکساری سے ڈری سہمی آواز میں اطلاع دی "ایک مریضہ آئی ہے ڈاکٹر صاحبہ"

ڈاکٹر نیلیما جو گئی رات شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک ایک بڑی ہی مکروہ صورت مجرمہ کے بدنما اور بھرپور شکم سے خاصی بڑی رسولی کے اخراج سے بغیر دم لیے الجھی رہی تھی آج صبح کافی دیر سے اٹھنے کے باوجود خاصی تھکی تھکی ٹوٹی ٹوٹی سی محسوس کر رہی تھی، رات وہ وہسکی کے چار بڑے پیگ حلق میں یکے بعد دیگرے انڈیل کر سوئی تھی تاکہ شام کی اس منحوس تھکاوٹ سے کچھ نجات ملے ———

نجانے کس منحوس گھڑی میں اس نے مقامی جیل کے زنانہ وارڈ کی مجرم مریضاؤں کی نگرانی کا ذمہ قبول کر لیا تھا ـــ

جرم و سزا کی الجھنیں۔ میری اپنی زندگی ہی کون ایسی ......

وہ اپنے چوتھے بلیک کافی کے پیالے اور ساتویں سگریٹ سے دل ہی دل میں محو گفتگو تھی۔ بوڑھی نسرین کی بیجا مداخلت اسے اچھی نہیں لگی

تم تو جانتی ہو بڑی بی کہ میں کتنی تھکی ہوئی ہوں۔ سوچا تھا آج اتوار ہے۔ پورا دن آرام کروں گی۔ ابھی تو میں نے منہ بھی نہیں دھویا"، کچھ دیر نسرین چپ رہ کر بولی "مگر ڈاکٹر صاحبہ، یہ بڑا پیچیدہ اور غیر معمولی کیس ہے۔ یہ بچی ......"

نیلیما جیسے خواب سے جاگ اٹھی ہو۔ کیا کہا تم نے ـــ" بچی ؟"

جی ہاں ڈاکٹر صاحبہ۔ بالکل بچی بمشکل تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ دیکھنے میں اس سے بھی چھوٹی لگتی ہے۔ بالکل گڑیا سی۔ میں نے بہت کوشش کی۔ بہت سمجھایا، ذرا ڈرایا دھمکایا بھی مگر میں کچھ نہ کر سکی، معلوم ہوتا ہے آپ کو جانتی ہے۔ بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہے آنٹی سے ملادو۔ آنٹی سے ملادو۔ اس کا اس طرح چیختے چلاتے روتے جانا مجھ سے قطعی برداشت نہ ہو سکا تو مجبوراً ــــــــــ

تم نے نام نہیں پوچھا ؟

پوچھا تھا مگر جواب میں وہ صرف روتی رہی۔ کہہ رہی تھی اس کے پاس بس چند گھنٹے ہیں نیلیما نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور سگریٹ بجھا دیا۔ "تم نے پوچھا تو ہوگا کہ کیا مرض ہے" ؟

بہت پوچھا مگر جواب میں وہ صرف روتی رہی۔ مجھے لگتا ہے بچی پاؤں سے بھاری ہے۔

بچی، تیرہ، چودہ سال کی نوعمر بچی، پاؤں سے بھاری، کیا بک رہی ہو ؟ ڈاکٹر نیلیما کے اندر کا ڈاکٹر ایک دم ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا "بچی۔ تیرہ چودہ سال کی بچی۔ لعنت ہے اس مغربی فضا پہ" وہ ہڑبڑاتے اندر چلدی۔ "میں ابھی آتی ہوں تم اسے کنسلٹیشن روم سے لے جا کر سیٹی پر لٹادو۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے وہ واپس لوٹی تو دیکھا کہ ڈاکٹر کے کنسلٹیشن روم میں جانے کی بجائے نجمہ وہیں فائیر میں سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اور گردن جھکائے بدستور روئے جا رہی ہے۔

ارے تم نجمہ ؟

نجمہ نے اعتراف گناہ سے سر کو اور بھی جھکا لیا ــــــــــ

کیا بات ہے بیٹی ؟

بیٹی کا پیار بھرا لفظ سن کر نجمہ ایک دم پھوٹ پڑی

نیلیما نے مصنوعی ناراضگی کا آڈمبر بھرتے ہوئے دھمکایا۔ تم رو دھو کر تھک جاؤ تو مجھے بلا لینا۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے ــــــــــ

پلیز آنٹی !!

یہ ہوئی نا بات۔ ڈاکٹر کے دواخانہ میں آئی ہو تو اسی طرح بات کرو جس طرح مریض

کرتے ہیں، اور بتاؤ کہ تمہیں کیا تکلیف ہے اور تم اکیلی کیوں آئی ہو۔ تمہارے ابوّ کہاں ہیں؟
وہ برمنگھم گئے ہیں۔
تمہیں کیا تکلیف ہے۔
میں آنٹی ـــــ میں ـــــ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب کے ڈاکٹر نیلما کو غصہ نہیں آیا۔ بڑی شفقت سے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور تسلی دیتے ہوئے اس نے پوچھا " بات کرو بیٹی۔ بولو گی نہیں تو میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں، جو جان جاؤں گی کہ تمہارا مرض کیا ہے۔ کیسا درد ہے، کہاں۔ ہے، کتنا ہے۔ تمہیں بھولنا نہیں چاہیئے نجمہ کہ میں اس علاقے کے دوسرے لوگوں کے لیے بھلے ہی محض ایک ڈاکٹر ہوں مگر تمہاری تو آنٹی بھی ہوں۔ تمہارے ابوّ میرے منہ بولے بھائی ہیں۔
"جبھی تو آنٹی،" مگر آنسو تھے اس معصوم بچی کے جو تھمتے ہی نہ تھے۔
بالآخر ڈاکٹر نے حکم دیا۔ جوتے اتارو، کوٹ اتارو، یہ بیل اور قمیص بھی اتار دو اور دم سادھ کر ایک دم لیٹ جاؤ اس سیٹی پر۔
نجمہ نے مزید کوئی اڑچن نہیں ڈالی۔ آنکھیں موند کر جیسے کہا گیا تھا ویسے ہی لیٹ گئی۔
آج صبح تم نے کچھ کھایا پیا بھی کہ نہیں۔
نجمہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں البتہ بدستور بند رہیں۔
آنکھیں موندے ننگے بدن سیٹی پر لیٹی وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک قسم قسم کے اوزاروں سے پوری کلینیکل جانچ پڑتال کے بعد ڈاکٹر مسکرا دی۔
بدماش لڑکی، تو نے تو مجھے ایک دم ڈرا دیا تھا۔ اللہ کے فضل سے تم بالکل اچھی اور ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔
مگر وہ بچہ؟
کون بچہ؟
جو میرے پیٹ میں ہے۔
کیا بک رہی ہو؟
بک نہیں رہی ہوں آنٹی۔ اللہ قسم سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ دن رات میرے پیٹ میں اچھلتا کودتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی عجیب و غریب آوازیں بھی نکالتا ہے۔ خدا گواہ ہے آنٹی کہ میں

ہی جانتی ہوں اس نٹ کھٹ کی شرارتیں۔ اس کی اچھل کود اور کلکاریوں کی وہ عجیب غریب آوازیں جو دن رات میرے کانوں میرے سارے بدن کے رگ و پے میں ہلکے ہلکے گونجا کرتی ہیں۔ اب تو یہ راز چھپانا جان لیوا ہوتا جارہا ہے آنٹی، میں جانتی ہوں یا میرا خدا کہ کیسے کیسے جتنوں سے دبائے رکھتی ہوں اس کی یہ حرکات۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔

نیلیما مسکرائی۔ تمہارے اندر کچھ نہیں ہے نجو۔ تمہاری یہ ساری پریشانی بیجا ہے

مگر آنٹی!!

وہم کا کوئی علاج نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر ڈاکٹر نیلیما نے کہا۔ غالباً ایک علاج ہے بھی، بشرطیکہ تم دل و جان سے اور اللہ و رسول کی قسم لے کر کہو کہ جو بات میں پوچھوں گی، تم اس کا جواب دوگی۔ سچ بولوگی اور سچ کے سوا کچھ نہ بولوگی۔

میں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا آنٹی۔ آج تک صرف اسی ایک راز کو چھپا کر رکھا ہے دنیا سے۔ تمہارے سامنے یہ بھی ظاہر کر دیا آج۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گی اور تم جو بھی پوچھوگی سچ سچ بتاؤں گی۔

یہ کب سے ہے؟

کیا؟

یہی سب۔ یہ کیفیت جو تم بیان کر رہی ہو

آٹھ سال سے!

کیا کہا!!

ٹھیک کہتی ہوں آنٹی۔ آج پورے آٹھ سال ہو گئے اسے۔

کیا بکتی ہو، بچہ تین مہینے کا ہو تو عورت کا پیٹ پھول کر فٹ بال بن جاتا ہے جبکہ تمہارا پیٹ ریڑھ کی ہڈی سے چپکا ہوا ہے۔

میں کوئی عورت تھوڑے ہی ہوں آنٹی۔ ابھی تو میں اتنی چھوٹی ہوں اور پھر میں نے کہا نہ آنٹی کہ میں نے اسے زبردستی دبا کر رکھا ہوا ہے۔ تم تو جانتی ہو آنٹی ابو کا غصہ۔

تم جانتی ہو بچہ کیسے ہوتا ہے؟

جانتی ہوں آنٹی!

تو پھر بتاؤ۔ تمہارے بیٹے کا باپ یعنی تمہارا مرد کون ہے

رشید!

کیا کہا؟ رشید؟ تمہارا چھوٹا بھائی وہ تو ابھی دس سال کا بھی نہیں ہوا۔

کل اس کی سالگرہ ہے۔ ابو اسی لیے برمنگھم سے سیدہ آنٹی کو لینے گئے ہیں۔ کل وہ پورے نو سال کا ہو جائے گا۔

لندن جیسے آزاد اور کھلی فضا والے شہر میں یہ دقیانوسی مسلمان اپنی اکلوتی بیٹی کو جس طرح گھر میں ہر دم بند کئے رکھتے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو ظاہر ہے کہ آخر نکلنا ہی تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ رشید بمشکل نو برس کا ہے اور یہ خود تیرہ یا چودہ سال کی ہوگی۔ پچھلے آٹھ سال سے یقیناً بچی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے ——

یہ کب سے چل رہا ہے۔

کہا نا آنٹی کہ پچھلے آٹھ سال سے۔

یعنی وہ ابھی دو ہی سال کا تھا تب سے۔

دو سال کیوں آنٹی۔ جیسے ہی وہ سال بھر کا ہوا تھا امی نے اسے میرے ساتھ سلانا شروع کر دیا تھا ——

تو خود تب کتنے سال کی تھی۔

یہی کوئی پانچ چھ سال کی۔ بڑا مزہ آتا تھا اسے ساتھ سلانے میں۔ وہ بستر پر پیشاب کر دیتا تھا تب بھی مجھے برا نہ لگتا تھا۔

جانتی ہے بچہ کیسے ہوتا ہے !

جب کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ سوتی ہے

مرد؟

آپ بھی عجیب ہیں آنٹی رشید مرد ہی تو ہے اور میں چھوٹی عمر کی سہی مگر ہوں تو عورت ہی۔ رشید میرے ساتھ پورے آٹھ سال سے سو رہا ہے۔

تم بھائی بہن ہو تمہارے ایک ساتھ ہونے سے بچہ نہیں ہوتا اور پھر محض ساتھ ساتھ سو جانے سے ہی تو کچھ نہیں ہو جاتا۔ رشید بچہ ہے اور ماشاء اللہ تم خود بھی ——

اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ——

میں سب جانتی ہوں آنٹی ۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ بیچارے رشید کا قصور نہیں،
سارا دوش میرا اپنا ہے ۔ رشید کتنا گول مٹول پیارا پیارا بچہ ہے ۔ میں ان پچھلے آٹھ سالوں
میں ہر رات اس کو اپنے اوپر لٹا کر سوتی رہی ہوں ۔ پیار آتا تھا تو زور سے بھینچ بھی لیتی تھی ۔ میں نے اکثر
محسوس کیا ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے ـــــ مگر
مگر کیا؟

میری نہ بتاتی تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ اسے اس طرح ساتھ چمٹائے رکھنے اور اس طرح
بھینچنے اور والہانہ پیار کرنے سے اس کا کچھ نہ کچھ دھیرے دھیرے میرے پیٹ میں بھی جاتا
رہے گا ۔ اب تو آنٹی تھوڑا تھوڑا کر کے ایک آسیبی سایا سا ہے جو ظاہر ہے کہ اسی کا ہے ،
میرے اندر جم کر بیٹھ گیا ہے ۔ میری روز میرا مذاق اڑاتی ہے آنٹی کہتی ہے رشید تیرا بھائی بھی
ہے اور بیٹا بھی ۔ تیرے ہونے والے بیٹے کا باپ بھی ۔ میں بہت پریشان ہوں آنٹی ۔
کل سعیدہ آنٹی آرہی ہے اور آپ تو جانتی ہی ہیں اسے ۔ بڑی تیز نظر ہے اس کی ایک نظر دیکھتے
ہی جان لے گی کہ میں پیٹ سے ہوں ۔ وہ اپنے بڑے بیٹے سے میرا نکاح کرنا چاہتی ہے ۔
اماں اور ابو بھی یہی چاہتے ہیں ۔ میں خود بھی خلیق بھائی کو بے حد پسند کرتی ہوں ۔ سب کا
سب چوپٹ ہو جائے گا ۔ یہی ایک دن بچا ہے آنٹی مجھے بچالو ۔ میرا پیٹ خالی کر دو ۔ آسانی سے
ممکن نہ ہو تو آپریشن ہی کر ڈالو میرا ۔ تم تو ڈاکٹر ہو ۔ تم اسے اپینڈیسائی ٹسٹ ایسی کیسی نامراد
سی بیماری کا نام دے کر بھی یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہو۔

ڈاکٹر اب واقعی پریشان ہو گئی تبالآخر مجبور ہو کر اس نے پوری تفصیل سے نجمہ کو سمجھایا کہ
حمل کیسے ہوتا ہے بچہ کیسے پیٹ میں آتا اور جنمتا ہے ۔ سمجھاتے سمجھاتے وہ ایک ڈاکٹر ہو کر بھی
خود شرم وحیا سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی ، مگر نجمہ پر اس کی کسی بات کا اثر نہ ہو رہا تھا
تم سمجھتی کیوں نہیں ہو بجی ۔ تم ایک کنواری لڑکی ہو ۔ تمہارے ساتھ آج تک ایسا کچھ نہیں
ہوا جس سے بچہ ہوتا ہے ۔

میں نے کب کہا ہے آنٹی کہ مجھے بچہ ہو گیا ہے ۔ میں تو آپ کو بس اتنا ہی سمجھا رہی ہوں
کہ میرے پیٹ میں بچہ ہے ۔ جو جیسا بھی ہے جیسے بھی ہوا ہے دنیا کی نظر میں ناجائز ہے ۔ مجھے
بچالو میری اچھی آنٹی نہیں تو میں ٹیمز میں کود کر جان دے دوں گی ۔

میں نے پوری جانچ پڑتال کر لی ہے ۔ تم ایک نابالغ کنواری بچی ہو ـــــ سو فی صدی

کنواری ۔

نجمہ ایک لمحہ کے لیے رکی ، پھر بولی :" کیا میری کنواری نہ تھی ؟

میری کون ؟

کرائسیٹ کی ماں ۔ کنواری مریم جو ایک فرشتہ تھی ۔ میں تو ایک معمولی مسلمان ہوں ۔ اس نے خدا کے بیٹے کو جنما تھا جس کی مبارک پیدائش پر چاروں دشاؤں کے حکمراں اور علماء سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے آئے تھے ۔ مریم کو مبارک دینے اور اس کے فرشتہ بیٹے کو خوش آمدید کہنے ۔ ساری دنیا کے علماء وفضلاء نے میری کے حضور میں سرنگوں ہو کر بنی نو کے نجات دہندہ کی ولادت پر عقیدت کے بیش قیمت تحائف پیش کیے تھے ۔ دیوتاؤں نے آسمانوں سے پھول برسائے تھے ۔

یہ سب تمہیں کس نے بتایا ؟

سسٹر سانڈرہ نے جو ہمیں تواریخ پڑھاتی ہیں ۔ مگر وہ ایک اور یگ تھا ۔ آج اس قسم کا حادثہ پیش آیا ہوتا تو لوگ میری کا سر قلم کر دیتے ۔ یا رسوا کر کے اسے گھر بدر کر دیتے ۔ میرے والد ذات کے پٹھان ہیں ، طبیعت کے بھی قصاب ہیں ۔ میری بتا رہی تھی اور کنتی بھی جو ہماری کلاس فیلو ہے کہ اس طرح کے بچے بڑے اہم ہوتے ہیں جیسے عیسیٰ مسیح تھے ۔ پانڈو تھے ، مہان ویر کرن تھے اور ہمارے اپنے دور کے سب سے بڑے انسان مہاتما آئنسٹائن ۔ میری کہتی ہے میں گھر سے بھاگ جاؤں ۔ کنتی کا بھی یہی مشورہ ہے کیوں کہ میرا بچہ بھی یقیناً کوئی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا ، مگر میں کیسے بھاگوں آنٹی ۔ جاؤں تو کہاں جاؤں ۔ میرے ابو تو مجھے سمندر کی تہہ سے بھی برآمد کر لیں گے ۔

تو یہ بات ہے ؟ اب ڈاکٹر نیلما کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی نجمہ کہتی گئی ۔ دوزی بتا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوزی کون ؟

وہ بھی میری ایک سہیلی ہے

کیا بتا رہی تھی دوزی ؟

یہی کہ کرائسیٹ کی پیدائش سے پہلے میری کو عجیب وغریب خوشبوئیں آیا کرتی تھیں ۔ آہستہ آہستہ یہ خوشبوئیں کنواری میری کے اندر سماتی چلی گئیں اور آخر کار ایک بچہ بنکر بیٹھ

گئیں اس کے پیٹ میں۔ میرے ساتھ بھی آنٹی بالکل وہی ہو رہا ہے۔ رشید کے جسم کی ساری بُو باس میرے جسم نے جذب کر لی ہے۔ میں سوتی ہوں تو وہ جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں تو وہ سوتا ہے۔ میں ڈھنگ سے نہ سو سکتی ہوں نہ جاگ سکتی ہوں۔ اپنا یہ راز چھپانے کے لیے مجھے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا آنٹی۔ میں ہی جانتی ہوں اپنا یہ دکھ۔ مجھے بچا لو میری اچھی آنٹی، میں عمر بھر تمہارا یہ احسان نہ بھولوں گی۔

تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے بچی۔ میرا علم کہتا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں مگر میں تمہاری بات کو بھی جھٹلانے سے قاصر ہوں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا ــــــــــ

آپ چاہو تو اپنی کسی دوست، کسی دوسری ڈاکٹر سے مشورہ کر لو مگر جو کرنا ہے ابھی کرو آج ہی سب کر ڈالو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا وقت آ پہنچا ہے۔ کئی دنوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جلد ہی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ کون جانے کب کیا ہو جائے۔ کون جانے جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ کون جانے میری عزت بچانے کے لیے ہی امی ابو آج گھر میں نہیں ہیں

کیا ہونے والا ہے؟ تمہیں کیسا لگتا ہے؟

دوزی کہہ رہی تھی بچہ پیچھے ہوتا ہے۔ اللہ اس کی خوراک پہلے پیدا کر دیتا ہے۔ اب دیکھیے نہ آنٹی میری یہ چھاتی کے یہ گول، گول ابھار۔ کتنے بھدے لگتے ہیں۔ ہاتھ تک لگانے سے درد ہوتا ہے۔ میٹھا میٹھا۔ دوزی بتا رہی تھی یہ دودھ کے دو کٹورے ہیں۔ میرے ہونے والے بچے کی خوراک ــــــــــ

یہ تو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں تم انھیں بھدا کہتی ہو تمہارے سینے کے ابھار تو تمہاری اُمڈتی ہوئی چنچل جوانی کی شوخ نشانیاں ہیں۔ میری طرف دیکھو۔ میرے بھی تو ہیں ــــــ مگر مجھے ــــــــــ

یوں تو یہ دوزی کے بھی ہیں اور میری اور کنتی کے بھی۔ مگر

مگر کیا؟

وہ تینوں کبھی کسی کے ساتھ نہیں سوتیں اور ابو امی سے کہہ رہے تھے۔

کیا کہہ رہے تھے تمہاری امی سے تمہارے ابو؟

مجھے شرم آتی ہے۔ آپ خفا ہو جائیں گی۔

کیوں ایسی کیا بات ہے ؟

وہ کہہ رہے تھے

ارے بھئی کہہ بھی چکو نا !

کہہ رہے تھے ڈاکٹر نیلیما بھی خوب ہے ۔ اسے دیکھ کر کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ وہ ایک عورت ہے ۔ اور کہہ رہے تھے

کہو کہو ! !

کہہ رہے تھے ، میرا ایمان کہتا ہے کہ ڈاکٹر نیلیما نے آج تک کسی غیر مرد کے ساتھ ہم بستری نہیں کی ہے بھرپور عورت ہوتے ہوئے بھی وہ ایک کنواری لڑکی کی طرح ہے ۔

ڈاکٹر نیلیما نے ندامت سے سر جھکا لیا ۔ اور پھر جیسے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ۔

تم انڈہ میٹ تو کھاتی ہونا ؟

جی نہیں آنٹی ۔ زیادہ کھانے سے پیٹ پھول جاتا ہے ۔ ابو کہہ رہے تھے کسی بھی کنواری لڑکی کو انڈہ میٹ وغیرہ نہ کھانا چاہیئے ۔ وہ آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے ۔ کہہ رہے تھے اتنی جوان ہے ڈاکٹر نیلیما مگر مجال ہے جو دوسری ہندوستانی پروفیشیل عورتوں کی طرح کبھی کسی غیر مرد کے پیچھے بھاگی ہو ۔ جسم کو مریادہ میں رکھنے کے لیے وہ کبھی کوئی گرم چیز نہیں کھاتی جبکہ لندن میں مقیم ہندوستانی عورتیں ، انڈے میٹ تو ایک طرف سگریٹ اور شراب تک کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں ـــــــــ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔ میں ایک چینی عورت ہوں ۔ میرے مذہب میں ان اشیاء کی ممانعت ہے مگر تم تو مسلمان بچی ہو ۔ تمہارے مذہب میں تو یہ سب جائز ہے ۔ تم خوب بھر پیٹ کھایا پیا کرو یہ سب ۔ لندن کی آب و ہوا میں انڈا میٹ مچھلی سب جائز بلکہ ضروری ہیں ـــــــ لندن میں کون پرواہ کرتا ہے ، مذہب کی آنٹی ، ابو شراب پیتے ہیں ، پورک بھی کھاتے ہیں جب کہ ہمارے مذہب میں یہ دونوں اشیاء حرام ہیں ۔ مگر تم میری باتوں کو اگنور کر رہی ہو آنٹی !!

نہیں بچی ۔ میں نے تمہارا مرض سمجھ لیا ہے بلکہ سمجھ لو کہ ایک دم پکڑ لیا ہے ، میں تمہارے جسم سے تمہارا بچہ اس طرح خارج کر دوں گی جس طرح یہ اس میں داخل ہوا ہے ۔ تم ذرا فکر نہ کرو اور سب کچھ اپنی آنٹی پر چھوڑ دو ۔ میں تمہیں چند گولیاں دوں گی جنہیں تم ہر روز صبح و شام کھانے کے

بعد چپکے سے نگل لیا کرنا۔ تم دیکھو گی کہ چند روز میں ہی تمہارا یہ بچہ خون کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بن کر اپنے آپ خارج ہو جائے گا تمہارے پیٹ سے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی، نہ تمہارے امی ابو کو نہ تمہاری سعیدہ آنٹی کو ہی ——— تم بے فکر ہو کر گھر چلی جاؤ اور سنو جتنی جلدی ممکن ہو میری بہنی اور دوزی سے ملنا جلنا ترک کردو۔ یہ دوا سے بھی زیادہ ضروری ہے ان کو تو کسی صورت بھی نہ بتانا کہ تم کوئی دوا کھا رہی ہو۔

وعدہ ؟

وعدہ :

نجمہ کے سر سے جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔ دوا لے کر وہ گھر چلی گئی۔ پندرہ بیس روز بعد وہ آنٹی سے ملنے آئی تو بے حد مسرور تھی۔

تم ٹھیک کہتی تھیں آنٹی۔ بالکل ویسے ہی جیسا تم نے بتایا تھا، میرے اندر سے خون اپنے آپ پھوٹ پڑا ہے۔

نیلیما مسکرائی۔ مبارک ہو نجمہ تمہارا پیٹ اب ایک دو دن میں اپنے آپ صاف ہو جائے گا۔

دو چار روز بعد نئے کپڑے پہن کر نجمہ آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بہت بڑا ڈبہ تھا۔ آج وہ بہت مسرور تھی۔

آج میں کتنا ہلکا ہلکا محسوس کر رہی ہوں آنٹی۔ آج عید ہے نا، ابو نے بھیجی ہے یہ مٹھائی اور دیکھو۔

انگوٹھی ؟ ہیرے کی ہے غالباً ؟

خلیق بھائی نے دی ہے ———

اب تم سعیدہ آنٹی کے بیٹے کو بھائی نہ کہا کرو۔ وہ تمہارا منگیتر ہے۔

نجمہ شرما کر بھاگ گئی مگر پھر جلد لوٹ بھی آئی۔ وفور مسرت سے اس نے اپنی نیلیما آنٹی کو آغوش میں لے کر چوم لیا :

اور " تھینک یو آنٹی " کہہ کر ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی ہوئی بھاگ گئی۔

پریم ناتھ کی بہو کا گھرانا تھا کہ ماسٹر شادی لال کے دن پلٹنے لگے۔ پریم ناتھ ایم اے ہوتے ہوئے بھی ایک سرکاری دفتر میں معمولی کلرک تھا مگر شادی کیا ہوئی اس کی گویا بھاگیہ کے بند کواڑ کھل گئے اس کے اپنے ہی دفتر میں ایک اچھی اسامی نکل آئی کسی طرح اور وہ پروموشن پا گیا تنخواہ دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی پریم کے چھوٹے بھائی مہندر کی بھی نوکری لگ گئی اور ماسٹر شادی لال جو مقامی مڈل اسکول میں ریاضی کے معلم تھے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے اچانک وفات پا جانے کی وجہ سے اپنے ہی اسکول میں بیٹھے بٹھائے ہیڈ ماسٹر بنا دیئے گئے۔ گھر میں دو چار ہی مہینوں میں دو ڈھائی کی جگہ ایک دم ہی ہزار بارہ سو کی آمدنی شروع ہو گئی۔

رام دے اور بندہ لے، شادی لال تیرے بیٹے کی بہو ساکشات لکشمی ہے۔ دیکھنا تیرا لڑکا چند ہی سالوں میں بڑا افسر بن جائے گا۔ ٹھیک کہتے ہو گپتا جی۔ بہو آئی ہے تو جیسے بہار آگئی ہے میرے گھر میں۔ کہاں تو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا اور اب دن رات پراٹھے دودھ اور مکھن سے میری خاطر تواضع ہوتی ہے۔ نہ رہی بیچاری بھگوتی ورنہ چند اچھے دن وہ غریب بھی دیکھ لیتی۔ اپنا اپنا بھاگیہ ہوتا ہے بھیا۔ وہ غریب جب تک رہی جھوٹے برتن ہی مانجھتی رہی۔ کھانا بچا تو کھا لیا نہیں تو ویسے ہی سو گئی۔

ہاں بھئی اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ ادھر اپنی طرف دیکھو بہو چار بار بھاگی بنی اور چاروں ہی بار بیچاری کی اولاد جنتے ہی سورگ سدھار گئی۔ اب کے جو بچہ ہوگا اسے تیری پوتر آتما بہو کا آشیرواد دلواؤں گا تاکہ کوئی بیل تو پروان چڑھے۔

رادھے شیام گپتا کپڑے کی دکان کرتے تھے اور اچھا کھاتا پیتا گھر تھا ان کا۔ بیٹا مقامی اسکولوں کا انسپکٹر تھا۔ لائق اور کماؤ۔ بہو تو بیچاری بالکل گائے تھی مگر تقدیر کا کوئی کیا کرے۔ اچھی بھلی اولاد ہوتی مگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد ہی بھگوان کو پیاری ہو جاتی۔

بچے جن جن کر سیتا رانی بیچاری تھک گئی تھی مگر پانچواں بچہ پھر سے تیار تھا۔ پہلے والے تین لڑکے اور ایک لڑکی جیوت ہوتے سارے نہ سہی آدھے ہی تو کاہے کو یہ پانچواں بوجھ اٹھاتی بیچاری مگر بچہ تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ عورت کی کیا جون

تین مہینہ بعد سیتا نے ارملا کو جنم دیا تو گپتا جی نے بچی کو لا کر کملا کی گود میں ڈال دیا۔ یہ بچی تیری رہی بہو۔ بھگوان کرے تیری ہو کر ہی جیئے۔ سیتا اسے پالے پوسے گی مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔ تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھ دو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر۔

کملا نے جو خود ابھی پورے سولہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ ارملا کو گود میں لے لیا اور ماں بن گئی۔

بیٹی کی۔ بن جنے۔ مریم کی طرح۔

اب یہ روز کا معمول ہوگیا تھا گپتا پریوار کا۔ صبح صبح ہی نہلا دھلا کر اور اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر سیتا ارملا کو کملا کے پاس چھوڑ جاتی اور رات کو جب بچی سو جاتی تو اٹھا کر لے جاتی۔ اسے اپنے گھر بیچ بیچ دو چار بار مقررہ وقت پر آکر بچی کو دودھ پلا جاتی اور بس۔

"ماں تو تم ہو کملا رانی میں تو تمہاری بیٹی کی آیا ہوں"

ایسا کیوں کہتی ہو دیدی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔ میری تو یہ گڑیا ہے۔ سچ کہتی ہوں دیدی۔ میرے دودھ ہوتا تو رات کو بھی اسے اپنے ہی ساتھ سلاتی۔ تمہارے منہ میں دودھ ہو گا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے کھنوں سے بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو۔

سیتا نے یہ دعا پورے دل سے دی تھی۔ مگر وہ جو دعائیں سنتا ہے سب کی ساری دعائیں تھوڑے ہی مان لیتا ہے۔ اس کی بھی موڈ ہوتی ہے۔ اچھی موڈ ہوئی تو چنڈال کی بھی سن لی۔ اچھی موڈ نہ ہوئی تو بڑے سے بڑے بھگت کی بھی نہ سنی۔ کملا کو سارا محلہ سراہتا تھا ماسٹر شادی لال اور دیور مہندر تو اس پر جان چھڑکتے تھے کوئی اس سے ناخوش تھا تو پریم ناتھ۔ اس کا پتی پرمیشور۔

پریم ناتھ ایم اے پاس تھا اس کی بیوی کم از کم بی اے پاس تو ہونی ہی چاہیئے تھی بھلے ہی تھرڈ ڈویژن میں مگر کملا بیچاری میٹرک پاس بھی نہ تھی۔ پریم ناتھ گورا چٹا تھا اور کملا سانولی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کملا باقاعدہ پڑھی لکھی نہ ہوتے ہوئے بھی ساہتیہ کویتا ایسی بے تکی باتوں میں بڑے جی جان سے حصہ لیتی تھی۔ کہانی ناول، کویتا ایسی خرافات پریم ناتھ کو قطعی ناپسند تھیں۔ وہ ریاضی کا طالب علم تھا اور ریاضی کے علاوہ ہر دوسرے سبجیکٹ کو دماغ کا خلل مانتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ کملا کے دہلیز میں قدم رکھتے ہی ان کے گھر کا بھاگیہ چمک اٹھا تھا مگر کملا جہیز میں خود تو کچھ بھی نہ لائی تھی اور اس کے اپنی ہی قماش کے کچھ دوستوں نے پھبتی کسی تھی کہ وہ کہیں بھی شادی کرتا تو بہتر بیوی اور بہت بہتر جہیز پاتا۔ چار پیسے تو ضرور آنے لگے تھے مگر اب بھی ان کے گھر میں نہ صوفہ تھا نہ ریڈیو نہ کوئی ڈھنگ کا پلنگ ہی۔

رہ پیسہ جو آتا تھا خرچ ہو جاتا تھا۔ ماسٹر شادی لال کی دو لڑکیاں تھی۔ بڑی لڑکی انھوں نے اپنے ہی سکول کے ایک پرائمری ٹیچر سے بیاہ دی تھی اور چھوٹی ابھی کنواری بیٹھی تھی جس کا بیاہ کرنا تھا۔

ماسٹر جی بھی کبھی کبھی سوچتے کہ کملا کچھ جہیز لے آتی تو چھوٹی بیٹی بملا کے ہاتھ پیلے کرنے میں آسانی ہوتی مگر وہ ناشکرے انسان نہ تھے۔ بہو جہیز نہ لائی تھی مگر اچھی تقدیر تو لائی تھی۔ جس سے ایک ویران اجڑا اجڑا

گھر بس گیا تھا۔

بیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے پریم بیٹے ہماری کملا لکشمی کا اوتار ہے تو دیکھتے دیکھتے لاکھوں کا مالک بن جائے گا۔

پریم اپنے باپ کی بہت عزت کرتا تھا۔ ماسٹر شادی لال جی تھے ہی نیک سیرت انسان۔ انہوں نے بھوکے رہ کر۔ چار چار میل پیدل چل کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور بڑا لڑکا ہونے کے ناتے پریم نے وہ سب دیکھا تھا۔

بابوجی ٹھیک کہتے ہیں بھیا، ہندر بھی کبھی کبھی سمجھاتا اسے، بھابی ہم سب کیلئے بھگوان کا وردان بن کر آئی ہے، آپ کو بھابی کا انادر نہیں کرنا چاہیئے۔

بملا بھی بھابی کی پیاری نند تھی۔

کمبخت جادوگرنی ہے۔ سارے گھر کو جانے کیا کھلا دیا ہے اس نے جو اس گھر کا پرنس آف ویلز ہوتے ہوئے بھی میں کبھی دوسرے نمبر کی چیز بن کر رہ گیا ہوں۔

وقت گذرتا جا رہا تھا اور کملا اپنی گڑیا کو کھلاتی پلاتی ہنساتی بڑے مزے سے زندگی گذار رہی تھی وہ اپنے گھر میں ایسی مست تھی کہ میکے بھی مہینوں میں کبھی کبھار ہی چٹھی پڑھ لکھ پاتی تھی۔

اس کی ودھوا ماں کبھی کبھی بیٹی کی جدائی میں دکھی ہوتی تو اس کا بھائی یہ کہہ کر بڑھیا ماں کی تسلی کرا دیتا کہ لڑکیوں کے آئے دن چٹھی نہ لکھنے کی یہی تو وجہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں اور نئے ناتوں سے ایسی گھل مل گئی ہیں کہ انھیں میکے کی یاد ہی نہیں آتی۔

بڑھیا بیچاری خوش ہو جاتی۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ کملا اچانک بغیر اطلاع دیئے میکے میں آدھمکی۔ "انھوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ میں کالی ہوں۔ بی اے پاس نہیں ہوں۔ غریب کی بیٹی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے جہیز نہیں دیا۔"

گھر والوں نے جب سمجھایا کہ شادی کے بعد لڑکی کی جگہ اس کے اپنے پتی ہی کا گھر ہوتی ہے تو وہ میکے کا گھر چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہو گئی۔

آپ لوگ میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو نہ کیجیئے۔ مگر میں ایسے آدمی کے پاس خود سے نہیں جاؤں گی جو آتما کا نہیں چمڑے کا بیوپاری ہے۔ پڑھا لکھا ہو کر بھی جاہل ہے ایسا آدمی میرا اندر کیوں بنے۔

سب نے لاکھ سمجھایا مگر کملا ضد پر اڑی رہی۔

بال کرشن نے سنا تو بہت دکھی ہوا۔ ,,دیکھو کملا شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تمہارا شوہر کوئی

بڑا بزرگ نہیں۔ تمہارے دیوتا سمان سسر تیرتھ یاترا پر نہ گئے ہوتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ وہ چھچھورا اچھالا کو دیا تھا تو تم ہی چپ ہو جاتیں۔ خود بخود اس ابالا کر بیٹھ جاتا۔ مگر تم نے مقابلے کی ٹھان لی اور بھاگ آئیں۔ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔" مگر دادا یہ شکشا تمہاری ہی تو ہے کہ آدمی میں جہاں سب کچھ سہہ لینے کا دم ہونا چاہیئے ظلم اور ناانصافی کے سامنے تن کر کھڑے ہونے کی شکتی بھی۔ ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔"

"کہا تو تھا۔"

"تو پھر۔ اب بولو میں کیا کروں۔"

"سنا ہے تمہاری ایک لڑکی بھی ہے۔"

"کیا کہتے ہو دادا۔ ابھی تو چھ مہینہ بھی نہیں ہوا میری شادی کو" "میرا مطلب تمہاری گود میں لی ہوئی بچی سے تھا۔"

ادہو۔ وہ ــــــ اس بیچاری پر واقعی ظلم ہوا ہے۔ مگر معصوم بچہ ہے ایک دو دن بعد بھول جائے گی اپنی اس آیلی ماں کو۔

مگر اس بالا اپنی ماں کو نہیں بھولی۔ دوسرے ہی دن بیمار ہو گئی اور ایک دم ایسی بیمار ہوئی کہ بیچاری کے مرنے کی نوبت آگئی۔ ماسٹر شادی لال تیرتھ یاترا سے واپس آئے تو بہت سٹپٹائے۔ اسی شام دھندر نے اطلاع دی کہ اس کے دفتر میں چھانٹی ہو رہی ہے جس میں اس کا بھی نام آگیا ہے۔

چند روز بعد سکول میں چوری ہو گئی۔ طلبا کے مہینہ بھر کی فیس۔ ماسٹروں کی پوری تنخواہ اور سکول کی گرانٹ کا سارا روپیہ کوئی لے اڑا۔ ساتھ ہی پریم ناتھ نے انکشاف کیا کہ ایک معمولی سی غلطی ہو جانے کی وجہ سے اس کا بڑا افسر اس سے اسقدر خفا ہو گیا ہے کہ اس نے اس کی تنزلی کا حکم صادر کر دیا ہے۔

"مگر ہم سب کیا کملاہی کی تقدیر کا کھاتے ہیں۔ ہمارے حصہ میں بھگوان نے کچھ نہیں لکھا۔"

"ہر کوئی اپنی تقدیر کا کھاتا ہے بیٹے مگر گھر کی بہو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ جاتی رہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ تم جا کر بہو کو لوٹا لاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"اپنی خاطر نہیں تو اس معصوم بچی کی خاطر ہی لے آؤ بہو کو بیٹے۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ اوتار کے دادا تھے جو باپ بیٹے کی اونچی بحث سن کر اوپر چلے آئے تھے۔

"آپ سب مجھے نیچا دکھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر جب تک وہ معافی مانگ کر ناک نہ رگڑے

میں اسے لینے نہیں جاؤں گا۔"

"تم وہاں چلو تو۔ وہ تو ایک طرف میں خود تمہارے پاؤں پکڑنے کو تیار ہوں۔"

آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں تاؤ جی۔ آپ سب کی یہی ضد ہے تو میں ہارا اور آپ سب جیتے۔ میں آپ کی خاطر اسے لے تو آؤں گا مگر اسے اپناؤں گا نہیں۔

کملا لوٹ آئی۔ یہ ایک کرشمہ ہی تھا کہ دوسرے ہی دن سکول کا چور بمعہ رقم پکڑا گیا۔ مہندر نوکری پر بحال ہو گیا۔ پریم ناتھ کا افسر ترقی پا کر بڑے دفتر میں منتقل ہو گیا اور جاتے جاتے اپنی ترقی کی خوشی میں پریم ناتھ کا قصور بھی معاف کر گیا۔

ارملا ایک ہی ہفتہ میں چنگی بھلی ہو کر پھر سے کلیلیں کرنے لگی۔

زندگی پھر چلنے لگی اپنے پرانے ڈھنگ سے۔

"یہ دیوی نہیں۔ جادوگرنی ہے۔ جادوگرنی۔ مگر میں دیکھ لوں گا

پریم ناتھ نے ہار تو مان لی تھی مگر دل سے نہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح رہتے تھے، دو سال، تین سال، چار سال، پانچ سال بیت گئے۔

ارملا سکول جانے لگی۔ مگر اب تک بھی اس نے کملا کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

- "یہ کیا رشتہ ہے" "تم تو ماں بن گئی ہو مگر میں باپ نہیں بنا۔"

میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنوں گی کیونکہ تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔ میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی۔ میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔"

تیرے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"کون جانے نقص مجھ میں ہے یا تم میں۔"

"گالی دیتی ہے حرام زادی۔"

"گالی نہیں دیتی۔ تمہیں سچی بات بتا رہی ہوں۔"

"ملا نے بالکرشن کو لکھا۔

ہاں دادا میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ وہ تمہیں بھی اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ تم نے میرے لیے جو دوا بھیجی تھی وہ اس نے مجھے پینے نہیں دی۔ اٹھا کر باہر کوڑے میں پھینک دی۔ اچھا ہی ہوا۔

مجھے بچہ وچہ کچھ نہیں چاہیئے۔ میرے لیے ارملا ہی کافی ہے۔

یہ آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر مجھ سے کسی طرح نبھائے جا رہا ہے

مجھے ایک مشین کی طرح استعمال کرتا ہے وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔
کبھی کبھی میں سوچتی ہوں میں عورت ہوں کہ ویشیا میں تو ویشیا سے بھی بدتر ہوں۔ ویشیا کو چنا ؤ کا اختیار تو ہوتا ہے۔

ماسٹر شادی لال نے مرتے وقت پریم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کملا کو پھر کبھی برا بھلا نہ کہے گا۔ اس کی عزت کرے گا اور کبھی ممکن ہوا تو اس سے بھرپور پیار بھی کرے گا۔

"تم نے اس لڑکی کو نہیں پہچانا۔ جب تک جی جان سے خود کو تمہارے سپرد نہیں کر دیتی تمہارے خون کے بچے کو اپنے اندر پنپنے نہیں دے گی۔ تمہیں اس کا دل جیتنا ہوگا بیٹے!"

اور یاد رکھنا بیوی شوہر کی عزت تو ہوتی ہی ہے۔ ہمارے ساشتروں نے اسے رسوئی میں ماں۔ گھر میں بہن۔ بستر میں ویشیا اور باہر شوہر کی بہترین دوست مانا ہے۔

اس کا باپ بڑا شاندار آدمی تھا۔

اس نے کملا سے پہلے کی طرح لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا۔ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ میں تھمانی شروع کر دی اور ارملا سے بھی باپ کی طرح پیار کرنا شروع کر دیا۔

وہ ماں باپ کی طرح ارملا کا ہر جنم دن بڑی دھوم دھام سے مناتے۔ دو ماؤں کا اور دو پتاؤں کا پیار پاکر ارملا جو بڑھنا اور پھیلنا شروع ہوئی تو ایک دم بیل کی طرح بڑھتی چلی گئی۔

بڑی ذہین لڑکی تھی۔ پڑھائی کی ہر منزل اس نے بڑی شان سے طے کی اور آخر کار ڈاکٹر بن گئی۔

برسلز کے سینٹرلی ہیٹڈ فلیٹ میں وہ ایک ساتھ بستر میں لیٹے ہوئے تھے۔

زندگی کتنی عجیب ہے کملا۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں اب بھرپور سکھ دینا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو جیسے سوکھ کئی ہو اندر سے۔

کملا نے پریم کو چمٹا لیا اپنے ساتھ۔ وہ اس کا پتی تھا۔ اس کا خداوند۔ مان مریادہ۔ سب کچھ۔

"تم دکھی کیوں ہوتے ہو۔ تم چندر کی لڑکی گود میں لے لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے اپنی کوکھ کی اولاد کی طرح پالوں گی۔ وہ تو اپنا ہی خون ہے۔"

میں جانتا ہوں کہ وقت بہت گذر چکا ہے۔ بائیس سالوں میں ہر طرح کی ناراضگی کے باوجود میں نے تمہیں کبھی دو تین دن سے زیادہ نہیں چھوڑا مگر نتیجہ کبھی کچھ نہ نکلا۔

بابو جی نے کہا تھا کہ مجھے تمہارا دل جیتنا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں مگر پھر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے، اور تمہارے زخموں کے ٹانکے پھر ٹوٹنے لگتے ہیں۔

اپنی زندگی ہی کچھ ایسی رہی ہے۔ دیکھو نہ تم ایک معمولی کلرک تھے اور اب برسیلز میں ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکریٹری ہو۔ ہمارے پاس اب سب کچھ ہے۔ کار ہے، اگینے کپڑے ہیں نقد سرمایہ ہے۔ کہاں تم میرا گھر سے باہر جھانکنا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور کہاں اب مجھے اس نئی آزاد فضا میں تتلی بنا کر گھماتے پھرتے ہو۔

کوئی وقت تھا کہ ہم دونوں اتنے صوفی تھے کہ پیاز تک سے پرہیز کرتے تھے۔ کہاں آج سگریٹ اور شراب ہمارا معمول بن گیا ہے۔ تم اپنے بچی بچے کے لالسا چھوڑ دو تو ہم جیسا سُکھی اور مطمئن جوڑا دنیا میں مشکل سے ملے گا" تم جانتی ہو کملا یا بوجی نے ایک بار کہا تھا، بچہ عورت کے پیٹ میں نہیں، اس کی روح میں ہوتا ہے" میں بائیس سالوں سے تمہارا پیٹ کرید رہا ہوں مگر اس بیچ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پالینا چاہتا ہوں مگر تم نے تو جیسے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔

کملا رو رہی تھی۔ پریم بھی رو رہا تھا۔ اس رونے میں کتنا سکون ہوتا۔ جی ہلکا ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے۔

جانتی ہو جس روز مجھے کول صاحب نے بلا کر پوچھا تھا۔

"پریم تم یورپ جانا پسند کرو گے۔ میں برسلز کی اپنی ایمبسی میں منسٹری کی برانچ کھولنا چاہتا ہوں۔ چاہو تو میں تمہیں وہاں انچیج بنا کر بھیج سکتا ہوں" یہ خبر سن کر کچھ ایسی عجیب و غریب گدگدی ہوئی تھی مجھے کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی تھی۔ منسٹری میں ہر کوئی مجھے رشک و حسد سے دیکھتا تھا ان دنوں مگر میرے اپنے دل کے کسی گوشہ میں یہ بات رہ رہ کر کھٹکتی تھی کہ میری سیلیکشن کی وجہ میری نجی قابلیت نہ تھی تم تھیں اور قدرت کا ڈیزائن جو ہمیں ارملا کے پاس لئے جا رہا تھا۔ میں نے دل کو لاکھ سمجھایا کہ ارملا لندن میں ہے اور ہم برسلز میں ہوں گے۔ مگر دل نے کب مانی ہے عقل کی پاسبانی اور پھر میرا دل۔

تم بہت خوش تھیں۔ تم ارملا سے ملو گی۔ روز نہیں تو مہینہ دو مہینہ میں کبھی دن دو دن کے لیے ہی کہا تم ارملا کی بات کرتیں تو میں جل جاتا یہ لڑکی آسیب ہے۔ کسی پچھلے جنم کی تم سے بچھڑی ہوئی کوئی آتما۔ تم تو ماں بن گئی تھیں مگر میں باپ نہیں بنا تھا۔

"یہ ارملا تمہیں بھابی کیوں کہتی ہے"

"تمہیں جو بھائی صاحب کہتی ہے۔ تمہارے ناتے بھابی ہی تو ہوئی میں اس کی۔ ہماری عمروں میں سولہ سال ہی کا تو فرق ہے مجھے امی کہے تو کیسا عجیب لگے"

"سو تو ہے"

" یہ ارملا اتنی شراب کیوں پیتی ہے "

" یہ ارملا اتنے سگریٹ کیوں پیتی ہے "

" یہ ارملا عورت ہے کہ مشین۔ کبھی تھکتی ہی نہیں جب دیکھو کام، کام، کام۔ گویا سارے لندن کے بیمار اس کے بغیر مر ہی تو جائیں گے "

" یہ ارملا شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ ۵۰ سال کی ہونے کو آئی ہے۔ آخر کب شادی کرے گی "

کس سے کرے شادی۔

کسی سے بھی کرے۔

کوئی بھیڑ بکری تو نہیں۔

سارے لندن میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے کیا۔

تم شادی کر لو ارملا ـــ کس سے کروں بھابی۔

رکشت سے کر لو۔ تم پر جان چھڑکتا ہے

جان تو مجھ پر خان بھی چھڑکتا ہے اور مدھو سودن بھی اور جانی جارلی۔ مگر شادی کیا ان سب سے کر لوں

تمہاری اپنی پسند؟

میری پسند تو ایک ہی ہے

کون؟

ایک عورت

تو تم لیسز بین ہو گی ـــ کون ہے وہ کمبخت عورت

کمبخت نہ کہو اسے۔ وہ تو میری جان ہے۔

مجھ سے کیوں نہیں ملوایا۔

روز ہی تو ملتی ہیں اسے آپ۔

بڑی بدمعاش ہو۔ مجھ سے اب کیا تم آدمی کا کام لو گی۔

میں تم سے سارے کام لے سکتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں بھابی جب تم میرے ساتھ لپٹ کر سو جاتی پیار سے میرے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیوں سے کنگھی کرتی ہو تو میری ارمانی نیچر کی ساری ضروریات پوری ہو ہیں۔ یقین مانو بھابی میں نے جب بھی مرد کی ضرورت محسوس کی ہے مجھے بھائی صاحب یاد آجاتے ہیں اور ان سے وہ سلوک۔

اب تو ہم بڑے خوش ہیں۔

اب تم اکتالیس کی ہونے آئی ہو۔ جب میں چالیس کی ہو جاؤں گی تو شادی کر لوں گی۔ کسی سے بھی۔ چالیس کو پہنچتے پہنچتے سکھ دکھ کا معیار ہی کیا رہ جاتا ہے۔

شکر ہے اب مجھے کبھی بچہ نہ ہوگا۔

کیا مطلب ؟

میں ہر مہینہ کی اس تکلیف سے چھوٹ گئی ہوں۔

کب سے ؟

چھ مہینہ ہونے کو آئے۔

کیا کہا۔ ابھی چلو میرے ساتھ ہسپتال۔ میں تمہارا معائنہ کرواؤں گی۔

تم خود ڈاکٹر نہیں ہو کیا ؟

ہوں ؛ مگر آپ کے لیے نہیں۔

ڈاکٹر ایملی جارج جب ایک گھنٹہ کے معائنہ کے بعد آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی۔

پریم ناتھ کو دیکھکر بولی۔ مٹھائی کھلایئے۔

اور پھر اِرملا کی طرف دیکھکر بولی۔ تم بھی مٹھائی کھلاؤ۔ تمہاری بھابی کو تمہارا بدل مل گیا۔

"مسٹر پریم ناتھ آپ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ آپ کی بیوی کو ساتواں مہینہ ہے اور آپ کو خبر تک نہیں۔ بچہ کمزور ہے مگر ٹھیک ہے۔ بڑی حفاظت کرنی ہوگی۔ آپ [illegible] برداشت کر سکیں تو میرا مشورہ ہے کہ مسز پریم ناتھ کو یہیں رہنے دیں"

پریم برسلز لوٹ گیا۔ کوئی ڈرنے والی بات نہ تھی۔

لندن میں ارملا جو تھی۔

اپنے مرحوم والد کی تصویر کے سامنے جھکا جھکا پریم بھبھک بھبھک کر رونے لگا۔ ڈیڈی مجھے تمہاری آتما نے معاف کر دیا۔ میں باپ بننے والا ہوں ڈیڈی دعا دو ڈیڈی کہ میری اولاد کملا ایسی لکشمی ہو میرے جیسی راکشش نہیں۔ مجھے بیٹا نہیں بیٹی چاہیئے ڈیڈی۔ کملا کی تصویر۔ میں کملا کا بیاہ پا گیا ہوں ڈیڈی۔ کملا نے مجھے اپنی آتما میں اپنے دل میں کچھ جگہ دے ہی دی آخر۔

پریم ناتھ کو لگا۔ وہ اب ایک اچھا آدمی بن گیا ہے۔

وہ واقعی اچھا آدمی بن گیا تھا۔

" آٹھویں مہینہ کا درد اچھا نہیں ہوتا مگر یہ ہو گیا گیا ہے تمہاری بھابی کو جیسے اس میں زندہ رہنے یا بچہ کا بوجھ سہارے جانے کی سکت ہی نہ رہی ہو میں سمجھی تھی وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی مگر ہم نے اسے ایک بار بھی مسکراتے نہیں دیکھا پچھلے ایک مہینہ سے " ڈاکٹر جارج واقعی حیران تھی۔

بھابی آنکھیں کھولو۔ ڈاکٹر پوری تم سے ملنے آئے ہیں۔

بھابی نے آنکھیں کھولیں۔ اور رکشت کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

" آؤ جمائی بابو۔ خوش آمدید "

" جمائی بابو " ارملا خوش تھی کہ کملا نے بھی اس کی پسند پر اجازت کی مہر ثبت کر دی۔

رکشت نے شکرانہ کے طور پر کملا کے کمزور دلاغر ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

ارملا شادی کر رہی ہے۔ کملا نے پریم ناتھ کو بتایا۔

مجھے معلوم ہے۔ تاؤ جی کا خط آیا تھا۔ اس کی ممی اور بھیا اگلے مہینہ لندن پہنچ رہے ہیں۔

ارملا کی ممی۔

" ارملا کی ممی تو میں ہوں۔ ارملا کو میں نے پالا ہے۔ ارملا کی ممی میں ہوں۔ ارملا میری بیٹی ہے "

ہاں ہاں تم ہی ارملا کی ممی ہو۔ مگر ایک دوسری عورت بھی ہے جس نے اسے جنم دیا تھا اس کا بھی تو کچھ حق ہے اور پھر وہ خود سے تھوڑے ہی آ رہی ہے۔ خود ارملا نے یہاں سے ٹکٹ بھیجوائے ہیں ان لوگوں کے لیے۔

ارملا نے خود بلایا ہے سیتا کو ؟

یہ کیسی جلن ہے۔

" ارملا کو اب میری ضرورت نہیں رہی "

" اس حالت میں تمہارا اس طرح ایجی ٹیٹنڈ ہونا مناسب نہیں "

" یہ بچی تمہاری رہی ۔ بھگوان کرے تمہاری ہی ہو کر رہے۔

سیتا اسے پالے پوسے گی، مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔

" تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھ دو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر "

" ماں تو تم ہو کملا رانی۔ میں تو تیری بیٹی کی آیا ہوں۔

جھوٹ ہے جھوٹ۔ آیا مجھ سے میری بیٹی چھیننے آ رہی ہے۔

" تمہارے منوں دودھ ہوگا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے تھنوں سے۔ بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو "

مجھے دس بچے نہیں چاہئیں۔ میری ایک ہی بچی ہے یہی ٹھیک ہے۔
یہ کیسا رشتہ ہے۔ تم تو ماں بن گئی ہو مگر میں باپ نہیں بنا۔
میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنوں گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔
تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔
میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔
تمہارے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔
کون جانے نقص تم میں ہے یا مجھ میں۔
گالی دیتی ہے حرام زادی۔
جو آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا محض اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر۔
وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔
ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔
اب بولو میں کیا کروں۔ میں کیا کروں دادا۔ میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں۔
نرس نے آکر مارفیا کا انجکشن لگا دیا۔ آپ سو جائیے مسز پریم ناتھ اس حالت میں آپ کا یوں اس طرح پریشان رہنا اولاد اور ماں۔ دونوں کے لئے مضر ہے۔

اولاد!

میری اولاد!!
مگر وہ تو خوش و خرم ہے۔ ماں مر رہی ہے اور بیٹی بیاہ رچا رہی ہے۔ مگر میں نے خود ہی تو کہا کہ شادی کرلو رکشت سے کرلو وہ تم پر جان چھڑکتا ہے۔
میں بائیس سال سے تمہارا پیٹ کرید رہا ہوں۔ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پانا چاہتا ہوں۔ مگر تم نے تو جیسے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔
مگر وہ گھس آیا کسی طرح میرے من مندر میں۔
کیوں آنے دیا تم نے۔
ایک بیٹی کیا کم تھی تیرے لئے۔ لالچی کتیا۔
تمہاری بیوی اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ ساری رات بڑبڑاتی رہتی ہے۔ دیکھتی ہوں تم نے اس غریب سے اپنی ازدواجی زندگی کے اولین مراحل میں مناسب سلوک نہیں کیا۔ ڈاکٹر جارج نے پریم ناتھ کو ملامتا۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں ڈاکٹر مگر اب میں اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں خدا کے لئے اسے بچا لیجئے۔

آخر وہ وقت بھی آپہنچا۔

تمہیں ماں اور بچے میں سے ایک کو چننا ہے۔

آپ میری کملا کو بچا لیجئے۔

زندگی میں پہلی بار پریم ناتھ نے باپ کی طرح ارملا کے سر پہ ہاتھ رکھکر کہا۔ میں غلطی پر تھا۔ ہمارے لئے ایک ہی بیٹی کافی ہے۔

ارملا اور رکشت رو رہے تھے۔

یہ رشتے ناتے کیسے کیسے رشتے گھڑ دیتا ہے تو ایملی جارج اپنے یسوع مسیح سے پوچھ رہی تھی۔

سیزیرین اپریشن ہوا۔ چار پاؤنڈ کا مردہ مسلا ہوا انسانی جسم۔

ہوش آنے پر کملا نے بستر پر ہاتھ پھیرا مگر بچہ قریب نہ پاکر چلانے لگی۔

بچہ بہت کمزور ہے اس قابل نہیں کہ اٹھا کر یہاں لایا جائے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا تو تمہارے ہی پاس رہے گا۔

جب مریضہ نے بہت ضد کی تو ڈاکٹر جارج نے قریب کے کمرہ سے ایک ہندوستانی عورت کا نیا بچہ اسے ایک نظر دکھا دیا۔

دیکھا تم نے۔ تم کہتے تھے میں بچہ نہیں جن سکتی۔ تم مجھے پہلے ہی سے اسی طرح پیار کرتے تو آج تم دس بچوں کے باپ ہوتے۔

پریم ناتھ کی مسکراہٹ میں درد تھا، غم تھا مگر۔ بھگوان اب اور سزا مجھے نہ دینا میری کملا کو بچا لینا۔

اس رات جب سب چلے گئے اور کمرہ میں مریضہ کے علاوہ ارملا ہی رہ گئی تو عجیب اچنبا ہوا۔

ارملا نے دیکھا کہ بھابی نے اپنا دائیاں پستان چولی سے باہر نکال لیا ہے اور آنکھیں بند کئے کئے ہی بڑبڑا رہی ہے تم نے دودھ ہی تو نہ پیا تھا میرا۔ لو یہ بھی پی لو۔ دیکھو تو منوں دودھ امڈ رہا ہے میرے شریر سے۔ کامدھینو بن گئی ہوں۔

ارملا چپ چاپ کرسی سے اٹھی اور بھابی کے ساتھ لیٹ گئی۔ ماں کا دودھ اس نے منہ میں لے لیا۔ بچے کی طرح بھابی کے تھن چوسنے لگی۔

کملا کے منہ پر وہی آبھا تھی جو ہر ماں کے منہ پر نوزائیدہ بچے کو پہلی بار دودھ پلاتے ہوئے ہو آتی ہے۔

ساری رات ماں بیٹی اس طرح سوتی رہیں۔ پیار سے ماں کا ہاتھ بیٹی کے سر پر آشیرباد کی بام ملتا رہا۔ دودھ ختم ہوگیا۔

ارملا نہ روئی نہ چیخی چلائی چپکے سے اٹھ کر اس نے اپنی کملا بھابی کا منہ چادر سے ڈھک دیا۔

نوٹ :-

میں نے اس کہانی کا کوئی عنوان نہیں رکھا کیونکہ اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی کا تناظر کچھ کچھ دھندلا سا گیا ہے اور اس کی واردات اس کے کرداروں کے یورپ منتقل ہو جانے کے بعد میری گرفت سے ماورا ہوگئی لگتی ہے۔

کملا اور ارملا دونوں زندہ ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ دونوں لیزبین ہیں۔ پریم ناتھ بھی گرچہ زندہ ہے مگر ———————

مجھے یہ کہانی دوبارہ لکھنی پڑے گی۔

رام اور سیتا

یہ کلپنا کی دنیا بھی کیا دنیا ہے۔ ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا۔ ماسوا معصوم امید کے اور اپنی دھن میں آدمی گھنٹوں مست رہتا ہے۔ پیٹر ڈول کا سنڈے کالم اسے بے حد پسند تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے پیٹر اس کے مستقبل کے بارے میں بڑی پیاری پیاری پیشین گوئیاں کر رہا تھا۔ اس کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ جلد ہی زندگی کا رنگ روپ کچھ اس ڈھنگ سے بدلے گا کہ وہ خود تو کیا ساری دنیا دنگ رہ جائے گی۔

سیتا اس کی بیوی عجیب چڑیا تھی۔ ان کی شادی دو سال قبل ہی ہوئی تھی مگر جہاں اکثر شادیاں ایک ہی سال میں بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ رام اور سیتا اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بنائے رکھتے تھے۔

رام نے کبھی اپنی اس چہکتی مہکتی چڑیا کو اداس یا مغموم نہ دیکھا تھا۔ جوانی کی اولین مہک سے تازہ و معطر اس انوکھے پرند کو جو بھی دیکھتا مسرور ہوتا۔ رام تو بیوی پر جان چھڑکتا تھا۔

ابھی وہ اکیس ہی برس کا تھا کہ ماں باپ سے بیک وقت ہاتھ دھو بیٹھا۔ خبر آئی تھی کہ اس کا بڑا بھائی جو رڑکی انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا ایکا ایک بیمار پڑ گیا ہے۔ اماں اور بابو بیٹے کی تیمارداری کے لیے گئے تھے۔ موت کا بلاوا آتا ہے تو عجیب ڈھنگ سے اور کسی ایسی دشا سے جس کا آدمی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ جس بس میں وہ دلی سے رڑکی کا سفر کر رہے تھے سہارنپور اور رڑکی کے درمیان دوسری سمت سے آتی ہوئی اپنے ہی ایسی، ایک دوسری بس سے ٹکرا گئی۔ دونوں بسیں سامان اور یاتریوں سے بھری ہوئی تھیں اور غیر ضروری رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔ ٹکراؤ بڑا مہلک ثابت ہوا۔ بسیں تو برباد ہو ہی گئیں اکثر یاتری بھی اس تصادم سے

راہ ملک عدم ہوگئے۔ جو بچ گئے تھے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ خود سے ہل جُل سکتے۔ مقامی پولیس اور بس کمپنی کے منتظمین نے زخمیوں کی معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد انھیں رڑکی کے سول ہسپتال میں پہنچادیا۔ اسی ہسپتال میں رام کا بھائی بھی بیمار پڑا تھا۔ ماں باپ کے زخمی ہونے کی خبر اسے مل گئی تھی مگر وہ اس حالت میں نہ تھا کہ ان کے لیے کچھ کر سکتا۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ اس حادثہ کی خبر رام کو نہ ملے کیوں کہ وہ ایم اے کا فائنل امتحان دے رہا تھا اور دو چار دن میں ہی اس کا امتحان ختم ہونے والا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنا آخری پرچہ دے کر گھر لوٹا اسے اس ناگہانی مصیبت کی خبر مل گئی۔ وہ پہلی ہی بس سے بھاگ کر رڑکی پہنچا مگر اس کی والدہ اور بڑا بھائی دم توڑ چکے تھے۔ کسی طرح رو پیٹ کر اس نے ماں اور بھائی کا داہ سنکار کیا اور پورے تن من سے زخمی باپ کی تیمارداری میں جٹ گیا۔

یہیں سیتا سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ سیتا کی ماں ابھی وہ بچی ہی تھی کہ مرگئی تھی وہ آج کل اپنی بوا کے پاس رڑکی میں رہتی تھی۔ مہینہ میں ایک آدھ بار اس کا باپ اسے آکر دیکھ جاتا تھا۔ اس بار بھی وہ غریب اپنی بیٹی کو ہی دیکھنے آیا تھا کہ بس کے حادثے کا شکار ہوگیا۔

جس پیار اور ایثار سے یہ لڑکی اپنے دم توڑتے بوڑھے باپ کی دیکھ ریکھ کر رہی تھی وہ قابل دید تھا۔ رام کو جو حوصلہ اس بے ماں کی بچی کے بے پایاں ایثار و خلوص سے ملا وہ اسے اپنے دس رشتہ داروں کی چکنی چپڑی باتوں سے نہ ملا تھا۔

وہ جب بھی باپ کی تیمارداری میں مگن اس لڑکی کو دیکھتا۔ شردھا سے اس کا سر جھک جاتا اور من ہی من کہتا۔ "یہ لڑکی کسی بھی آدمی کے لیے خدا کا تحفہ ہوگی،،

ایک ہی کمرے میں دونوں بوڑھوں کے بیڈ لگے تھے۔ رام، سیتا ہر ضرورت میں ایک دوسرے کا سہارا بنتے۔ پورے تین ہفتوں کے بعد بوڑھوں کو ہوش آیا۔ تقریباً ایک ساتھ دونوں نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹروں نے امّید بندھائی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں مگر یہ کیفیت دیرپا نہ رہی۔ ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ دونوں پھر بے ہوش ہوگئے اور ایسے کہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔

اسی ایک ہفتہ میں سیتا کی بوا کے مشورہ پر دونوں بزرگوں نے رام اور سیتا کی جوڑی کو اپنا اپنا آخری آشیرباد دے دیا تھا۔

اس گھٹنا کے تین مہینے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ اس بیچ رام کو اپنے مرحوم والد کے دفتر

میں خاصی معقول ملازمت بھی مل گئی تھی اور ان کا گورنمنٹ فلیٹ بھی اس کے نام الاٹ ہو گیا تھا۔

اس کا باپ ایک معمولی کلرک تھا مگر اس کی ماں نے اپنی گھریلو اقتصادیات کو خاصے سگھڑ پن سے سنبھال رکھا تھا اور شوہر کی معمولی آمدنی کے باوجود گھر میں ہر وہ چیز جٹا رکھی تھی جس کی ضرورت کسی میاں بیوی کو ہو سکتی ہے۔

سیتا کے والد سرکاری ملازم نہ تھے۔ ایک فرم میں ہیڈ کلرک تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی چھوڑا تھا اس کی بوا نے بڑی ایمانداری اور نیک نیتی سے یکجا کر کے بیچ ڈالا تھا اور ساری رقم بھتیجی کے نام بنک میں جمع کرا دی تھی۔

ان کی شادی کو ابھی چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ نت نئے انکشافات رام کی زندگی میں زہر گھولنے لگے۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ زندگی پھول ہی پھول نہیں خار دار جھاڑ بھی ہے اور وہ سرتاپا قرض میں غرق ہے۔ اس کے ماں باپ نے اپنے بیٹوں کی تعلیم مکمل کرانے کی غرض سے جگہ جگہ قرض اٹھا رکھا تھا۔

اس کے بڑے بھائی کی انجینرنگ کی تعلیم تو ظاہر ہے کہ مہنگی تھی ہی اس کی اپنی تعلیم پر بھی کچھ کم خرچ نہ آیا تھا۔

سیتا نے صورت حال سمجھ کر شوہر کو مشورہ دیا کہ ان دونوں کے پاس جو رقم ہے اور خود اس کے پاس جو زیور وغیرہ ہیں سب کو بیچ کر سارے قرض سے ایکدم سبکدوش ہو لیا جائے انہوں نے یہی کیا اور اپنی ضرورت کی چند اشیاء کے علاوہ گھر کی ہر وہ چیز بھی فروخت کر دی جس کے بغیر، روزمرہ ممکن تھا، جان ہے تو جہان ہے۔ سب پھر سے بن جائے گا۔ معمولی سے فرنیچر اور کچن کے چند برتنوں کے علاوہ اگر کسی ایسی چیز کو جو آسانی سے بک سکتی تھی سیتا نے بچا کر رکھا تھا تو وہ تھی اس کی ساسو ماں کی سنگر مشین اور اون بُننے کا ایک ولایتی آلہ جو اس کی بوا نے اسے جہیز میں تحفہ کے طور پر دیا تھا۔

سارا بوجھ یوں ایک دم اتار کر وہ سرخرو ہو گئے اور زندگی نئے سرے سے شروع ہو گئی۔

جہاں پیار ہو اعتماد ہو، یقین ہو، بھروسہ ہو وہاں سب اپنے آپ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

رام دفتر جاتا تو سیتا سوئیٹر بننے کی مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ پڑوس کی ایک رحم دل بزرگ خاتون نے اس عجیب و غریب لڑکی کا حوصلہ دیکھ کر اس کی مدد کرنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ وہ اسے

باہر سے کام لاکر دیتی۔ چیزیں تیار ہو جاتیں تو واپس لوٹا بھی آتی۔ جتنے پیسے ملتے لاکر سیتا کے ہاتھ تھما دیتی۔ دھیرے دھیرے سیتا دس پندرہ روپیہ روز تک کا کام کرنے لگی۔ یہ رقم جٹ جٹا کر تقریباً اتنی ہو جاتی جتنی رام کی تنخواہ۔ یعنی گھر ایک کی بجائے دو تنخواہیں آنے لگیں۔

رام کو بیوی کی اس نئی مصروفیت کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔ سیتا نے خود بھی یہ سب بتانا ضروری نہ سمجھا کیوں کہ اس کا خیال کہ یہ جان کر رام کی مردانہ حس کو اذیت پہنچے گی۔

گھر کا خرچ مزے سے چل رہا تھا۔ کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی۔ رام سمجھتا تھا کہ اس کی بیوی بڑی سگھڑ عورت ہے جو اس کی اتنی قلیل آمدنی میں ہی گھر سنبھالے ہوئے ہے۔

اسے اپنی بیوی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی کہ جس سے معمولی سا بھی گھریلو لگاؤ ممکن نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنی آمدنی بڑھانے اور بیوی کے لیے نئی نئی خوشیاں بٹورنے کے منصوبے بناتا رہتا۔

اے کاش! اے کاش! ——— ممکن ہوتا تو چاند تارے توڑ کر بھی بیوی کے قدموں میں ڈال دیتا۔

شادی کے پورے ڈیڑھ سال بعد اس کی ترقی ہوگئی۔ چار سو ماہانہ سے ایک دم چھ سو ماہانہ۔ اس نئی خوش حالی سے سیتا کی مصروفیات میں البتہ کوئی کمی نہیں آئی۔ فیملی بجٹ میں اپنا حصہ وہ بدستور ڈالتی رہی۔

پچھلی سردیوں میں انھوں نے رام کے لیے ایک نئے اونی سوٹ اور سیتا کے لیے ایک بڑے اونی کوٹ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر اپنی ساری تدبیروں کے باوجود وہ اتنی رقم جٹا نہ پائے تھے کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ خرید سکتے۔ ایک وقت میں سوٹ خریدنے کو رام تیار نہ تھا اور ایک وقت میں کوٹ خریدنے کو سیتا تیار نہ تھی۔

رام اب سینئر ریسرچ اسسٹنٹ تھا اور ایک اچھے معقول سوٹ کی واقعی اسے ضرورت تھی۔ صاحب لوگ اپنے ماتحتوں کو اچھے کپڑوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ سیتا کو بھی ایک معقول قسم کے زنانہ سوٹ کی ضرورت تھی کیوں کہ سردیوں کی شاموں میں وہ لوگ اکثر سینما یا ادھر ادھر گھومنے پھرنے نکل جایا کرتے تھے۔ رام کو تھیٹر سے بڑا لگاؤ تھا۔ جہاں کہیں بھی معقول قسم کی سوشل یا کلچرل ایکٹیوٹی ہوتی وہ سیتا کو لے کر پہنچ جاتا۔ سیتا کے بے پناہ حسن کو یوں اس طرح اپنے ساتھیوں میں پیریڈ کر کے اسے سکون ملتا تھا۔ وہ چاہتا تھا

کہ اس کے جاننے والے اس کی بیوی کو دیکھیں اور اس کی تقدیر پر رشک کریں۔
اسے یقین تھا کہ اچھے دن آنے والے ہیں۔ بیٹر وڈول ہی نے نہیں دوسرے پرچوں اور رسالوں میں لکھنے والے جیوتشیوں نے بھی اس کے خوشگوار مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں کی تھیں۔
اگر مقدر اس کے لیے سیتا ایسی اپسرا جُن سکتا ہے تو یقینی تھا کہ اس اپسرا کے یوگیہ ہونے کی صلاحیت بھی اسے ضرور عطا کرے گا۔ اس کا ایمان تھا کہ اچھی زندگی سیتا ایسی خوب صورت اور نیک سیرت بیوی کا حق تھا۔ "خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔"
جب تک وہ اپنی پیاری بیوی کے آرام و آرائش کے وہ تمام لوازمات جن کی وہ ہر لحاظ سے حقدار تھی، مہیا نہیں کر لیتا اسے چین نہیں آئے گا۔
اس کے ذہن میں جس زندگی کا تصور تھا وہ پیسے کی دنیا میں ہی ممکن تھی۔ دفتر میں اچھا کام تو وہ کرتا ہی تھا تاکہ وہ ترقی کر سکے اور سیتا کے یوگیہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے اخباروں اور سائنسی جریدوں کے لیے بھی لکھتا رہتا تھا تاکہ جو رقم بھی آئے وہ سیتا کی زیبائش پر خرچ ہو سکے۔ اچھے دن چونکہ قریب ہی تھے وہ قدرت کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے ہر صوبہ کی لاٹری ہر مہینہ خریدتا تھا۔ پندرہ بیس روپیہ مہینے کے اس خرچ کو ضروری سمجھتا تھا۔ مقدروں کے دیوتا اس پر مہربان ہیں اور اسے مالا مال کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر بے چارے دیوتاؤں کی بھی سیمائیں نہیں ہوتی ہیں۔ میں انھیں روپیہ دینے کا راستہ ہی نہ دوں گا تو وہ بے چارے دیں کیسے ــــــــــ

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اور سیتا سے بڑھیا جوڑی اڑوس پڑوس میں کوئی دوسری نہ تھی۔ خوش خلق، خوش مزاج، اور خوش لباس مرد اور عورت کی یہ جوڑی "ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں" کا بڑا ہی عمدہ اشتہار تھی۔ لوگ کچھ کہیں مگر رام جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے جب تک وہ اپنی بیوی کے لیے کوئی ایسی بات نہیں کر دیتا جو شاہ جہاں نے اپنی ممتاز کے لیے کی تھی تب تک اسے سکون نہیں مل سکتا۔ شیشی میں بند پارے کی طرح بے قرار یہ جوان اڑ کر ستاروں کو چھو لینے کا دم خم رکھتا تھا۔ اسے اپنی ملازمت۔ زندگی میں اپنا نجی مقام، دو کمروں کا سرکاری کوارٹر، گھر کا فرنیچر، گھر کے پردے، اپنے پہننے کے پارچات ہر چیز معمولی بے حد معمولی دکھائی دیتی تھی جب کہ وہ غیر معمولی حقدار تھا۔ "میرے لیے نہ سہی مگر اسے خدا خود

اپنے ہاتھوں سے گھڑی ہوئی اس حسین مورت کے تحفظ و آرام کے لیے تو تمہیں کچھ کرنا ہی چاہیئے۔ یہ تیرا فرض ہے اور اس کا حق۔"

"تو نے مجھے اس عورت کا شوہر بننے کی عزت بخشی ہے تو اس کے لیے کچھ کرسکنے کی سکت بھی عنایت کر۔"

جین سنز کی دکان کے شوروم میں مہنگا ولایتی ٹوید کا وہ کوٹ۔ کیسے پھبا تھا سیتا کے جسم پر ——— ایسا لگا تھا مانو اس کی بیوی کے جسم کو پگھلا کر کوٹ کے اندر فٹ کر دیا گیا ہو۔

"محترمہ کو یہ کوٹ بہت بہت فٹ آیا ہے ینگ مین" دوکان کے مالک نے کہا تھا۔

"یہ ساڑھے چار سو روپے کی چیز ہے، میں تم سے چار سو ہی لے لوں گا، مگر یہ کوٹ انھیں ملنا ہی چاہیئے۔"

دکاندار کی بات اسے بے حد پسند آئی تھی۔ "یہ شخص حسن کا بچا پارکھی ہے" "آپ بھی بڑے وہ ہیں" سیتا نے جھوٹ موٹ ناراض ہوتے ہوئے کہا تھا "وہ دکاندار ہے، سیلز مین بھی ہے، ایسی باتیں یہ لوگ ہر کسی سے ہر روز کہتے ہیں۔۔"

مگر نہیں۔ وہ کوٹ سیتا کے لیے ہی بنا تھا ———

اکتوبر کی پہلی تاریخ تھی آج اسے تنخواہ کے علاوہ پورے چار سو روپے فالتو ملے تھے حال ہی میں اس کا پے اسکیل ریوائز ہوا تھا، یہ رقم اسی ری وِیژن کا ایریر تھی۔ وہ بے حد مسرور تھا، پورے ایک ہزار کی رقم تھی اس کی جیب میں۔ دفتر سے خراماں خراماں چلتا ہوا وہ بس اسٹینڈ پر پہنچ گیا تو اسے خیال آیا ——— مونسپل کمیٹی نے سڑک کے آر پار کنکریٹ کا یہ پل ہم لوگوں کی حفاظت اور سہولت کے لیے بنایا ہے مگر ہم کبھی اس کا استعمال نہیں کرتے ہمیشہ بھاگ کر سڑک کراس کرتے ہیں۔ سوک سینس کی یہ کمی نہ جانے ہم ہندوستانیوں کے کردار سے کب جائے گی۔ کتنا خوب صورت پل ہے۔ وہ دن میں دو بار اسی راستہ سے آتا جاتا تھا مگر پل کی اہمیت جو اسے آج دکھائی دی تھی پہلے کبھی اس کا معمولی سا آبھاس بھی اسے نہ ہوا تھا اسے محسوس ہوا کہ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا ہے ——— خوشگوار، سہاونا موسم، نہ گرمی نہ سردی سال بھر ایسا ہی موسم رہے تو زندگی کتنی خوشگوار بن جائے اور ملک کہاں کا کہاں پہنچ جائے پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی آب و ہوا اتنی دل کش سال بھر نہیں رہتی۔ انگلینڈ جو دھند میں لپٹا ایک حقیر جزیرہ ہے آدھی دنیا کا حکمراں رہ چکا ہے

اس نے سگریٹ سلگایا اور دھیمے دھیمے پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گھر جانے کے لیے اسے سڑک کے دوسری طرف سے بس پکڑنا ہوتی تھی مگر آج کی طرح پہلے کبھی وہ پل پر نہ چڑھا تھا۔ پل کے اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور آتی جاتی ٹریفک کا نظارہ کرنے لگا۔ انسانوں اور گاڑیوں کی لہریں تھیں جو ایک کے بعد ایک پل کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔ لہر در لہر اسے آدمیوں کی یہ چہل پہل بڑی دل چسپ لگی ــــــ کتنے لوگ رہتے ہیں اس شہر میں اس نے سوچا۔ لوگ جو اس وقت آجا رہے تھے عموماً قرب و جوار کے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کے ملازمین تھے۔ ہر کوئی جلدی میں تھا کوئی اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا تو کوئی اُدھر سے اِدھر آرہا تھا۔ وہ آرہے ہیں یا جا رہے ہیں۔ کس طرف زیادہ لوگ جا رہے اور کس طرف نسبتاً کم یہ اندازہ کرنا محال تھا بسیں، کاریں، اسکوٹر، تانگے اور سائیکل۔ تانگے اس شہر میں کتنے کم ہو گئے ہیں۔ لپکتے بھاگتے اس دور میں تانگہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ چند سال بعد بمبئی کی طرح یہاں بھی سائیکل چلانا بند کر دیا جائے گا۔ پیدل چلتی ہوئی جنتا بھی اتنی ہی تھی جتنی بسوں اور دوسری سواریوں میں سوار تھی۔ انسانیت کا بے پناہ ہجوم۔ وقت کا ریلا، آدمی عورتیں اور بچے، ہنستے مسکراتے چہرے، مغموم و بدحال چہرے، سمٹی ہوئی روشنی اور ابھرتی ہوئی تاریکی کے اس جھٹپٹے وقفہ میں ہر کوئی گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ اکثر چہرے پہلی تاریخ کی روایتی جگمگاہٹ سے قدرے روشن تھے اور کچھ پہلی تاریخ کی روایتی جگمگاہٹ کے باوجود پریشان، امید، ناامیدی، دور، اندر ان کے سینوں کے کسی گوشہ میں وہ ان مٹی جوت ٹمٹما رہی تھی جس کی حرارت سے زندگی حرکت اور تحریک لیتی ہے۔ وہ گنگنانے لگا ــــــ

سردی ابھی دور تھی مگر فضا میں جو خنکی اس وقت تحلیل ہوئی جا رہی تھی وہ موسم سرما کی آمد کا اعلانیہ تھی۔ ستمبر کا سارا مہینہ بارش ہوتی رہی تھی، جس کی وجہ سے دلی کا موسم خاصہ خوش گوار رہا تھا۔ آج ہوا بند تھی مگر حبس نہ تھی خنکی تھی مگر سردی نہ تھی، بڑی عجیب کیفیت تھی آدمی خوش ہو تو ہر موسم اچھا، ناخوش ہو تو واہیات۔

اس نے اس وقت ایک سوتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ نکٹائی بھی جما رکھی تھی۔ اسے ٹھیک ڈھنگ سے کپڑے پہننا اچھا لگتا تھا۔ آدمی کی شناخت ان کپڑوں ہی سے تو ہوتی ہے۔ اچھے کپڑوں کا سوچتے سوچتے اسے جین سنز کے شوروم میں لٹک رہا وہ کوٹ یاد آگیا جو ولایتی ٹویڈ کے نرم و لطیف کپڑے سے بنا تھا اور جو سیتا کے بدن پر اتنی اچھی طرح فٹ

بیٹھا تھا ـــــ اب وہ دوسری طرف کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کوٹ کی یاد نے اچک کر اس کے پاؤں روک لیے اور وہ ٹھٹھک گیا۔

سیتا کی طبیعت آج صبح اچھی نہ تھی، مجھے جلد گھر پہنچنا چاہئیے۔ جیب میں اتنے روپے رکھ کر بس میں سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ ہوگا۔ آج کے دن تو جیب کترے خاص طور پر تیار رہتے ہیں اسکوٹر پر بس کی نسبت دس گنا خرچ آئے گا، مگر مناسب یہی ہے کہ روپے لے کر صحیح سلامت گھر پہنچا جائے۔ سیتا اسے اور ان ڈھیر سے روپیوں کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ اسے لگا اس کی سوچ کے انداز میں کسی قدر کمینگی کی بو شامل ہو گئی تھی۔ پیسے سے سیتا خوش ہو جائے گی یہ سوچنا بھی ـــــ اسے اپنی حماقت پر غصہ آگیا اور سوچ کی دھار پھر جین سنز کے اسی کوٹ کی طرف لوٹ گئی۔ غنیمت ہے کہ سیتا اس وقت میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ ساتھ ہوتی ہے تو اپنے لیے کوئی غیر معمولی یا قیمتی چیز خریدنے نہیں دیتی۔ وہ اس کے لیے تو پوری تنخواہ خرچ کر دے گی مگر اپنے لیے کبھی کچھ نہ لے گی۔ وہ عورت بنی ہی کسی دوسری مٹی کی ہے۔

"میں کوئی باہر آنے جانے والی عورت تو ہوں نہیں ایک معمولی گھریلو عورت ہوں، میرے لیے اتنا قیمتی کوٹ کیوں خریدا جائے۔ میرے پاس درجنوں سوئٹر اور شال ہیں۔ لمبا کوٹ لے بھی لوں گی تو رکھوں گی کہاں۔ الماری میں چھوٹے کوٹ پتلون مشکل سے آتے ہیں۔ باہر ٹنگا ٹنگا کوٹ خراب نہیں ہو جائے گا؟۔ نہ بابا نہ۔ مجھے نہیں چاہیئے یہ کوٹ۔ ہم کون پہاڑ پر رہتے ہیں۔"

وہ عورت بنی ہی کسی دوسری مٹی کی ہے۔

آج وہ ساتھ نہیں ہے اچھا ہی ہے۔ کوٹ تو ہم لوگوں نے دیکھ ہی رکھا ہے پسند ناپسند کا کوئی جھمیلا نہیں۔ آج جیب میں پیسے بھی ہیں۔ آج بھی وہ کوٹ نہ خریدا گیا تو پھر کبھی نہ خریدا جا سکے گا۔ کیا ہوا جو یہ کوٹ اتنا مہنگا ہے۔ سستا دو دن، مہنگا سو دن۔ کون ہم روز اس قسم کی چیزیں خریدتے ہیں۔

آج وہ اس قابل تھا کہ کوٹ کے دام چکا سکے۔ وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھا۔ پل کے بیچ پر آکر جیسے خود اپنے آپ کو مرعوب کرنے کی غرض سے وہ بلند آواز چلایا۔ "وہ کوٹ میری سیتا کے لیے بنا ہے۔"

، ، ، ، ، ، ،

میں انبساط کی لہر دوڑادی اور وہ اسی خوابیدہ کیفیت میں پل کے پلیٹ فارم کے دوسری طرف پہنچ کر بس پکڑنے کی غرض سے دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

ارے یہ کیا ؟

اس نے آس پاس دیکھا۔ پل پر دوسرا کوئی نہ تھا۔ ایک بار پھر اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑا کر اس نے پھر پل کے فرش پر نظر لگائی۔

یہ کوئی وہم ، سراب یا نظر کا دھوکہ نہ تھا۔ حقیقت تھی۔ پل کے بیچوں بیچ چپ چاپ پڑے پڑے وہ مسکرا رہا تھا۔

کرنسی نوٹوں کا پلندہ

اس نے اپنے پاؤں سے نوٹوں کے اس پلندہ کو ڈھک دیا اور پھر آخری بار ادھر ادھر دیکھ کر سارے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔

روپیہ کتنی اطمینان بخش حقیقت ہے۔ روپیوں کو جیب میں رکھتے ہوئے اسے جو مسرت ہوئی اس کا قطرہ اس نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا۔ نوٹوں کے گننے کی ضرورت نہ تھی۔ کون سی یہ اس کی اپنی کمائی تھی۔ نوٹ سب کے سب نئے تھے۔ کچھ دس دس کے، کچھ سو سو کے۔ سات آٹھ سو سے کم تو کیا ہوں گے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔

مگر یہ ہیں کس کے۔ کس نے پھینکے۔ جس بیچارے کے یہ نوٹ ہیں وہ تو آج شاید کھانا بھی نہ کھا سکے گا۔ اس نے پہلے یہ پلندہ کیوں نہ دیکھا تھا۔ اس پل سے چند منٹ قبل گذرنے والا وہ واحد آدمی تھا۔ اس نے کسی دوسرے کو پل پر چڑھتے یا اترتے نہ دیکھا تھا۔ تب پھر.....

کوئی ایسا آدمی جو اسی کی طرح آج صبح یا دوپہر پل سے گزرا تھا۔ مگر وہ تھا کون۔ یقیناً کوئی حاتم تھا وہ۔ یا پھر میری ہی طرح۔ بیچارہ

"میں نے یہ نوٹ پہلے کیوں نہ دیکھے" میاں تم ایسے ہی ہو۔ دن رات خوابوں کے تانے بانے بنتے رہتے ہو۔ تم نے پہلے بھی نظر ادھر کی ہوتی تو یہ مل جاتے۔

یہ تمہارے ہی ہیں جبھی تو تمہارے لیے سارا دن یوں اسی طرح پڑے رہے ہیں۔ کوئی دھات کی چیز تو ہے نہیں۔ کاغذوں کا پلندہ ہے۔ ذرا سی ہوا سے بھی اڑ سکتا تھا۔ تمہاری ہی

تقدیر تھی جبھی آج گھنٹوں سے ہوا میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

کوٹ خریدنے کا اس کا ارادہ جو شاید سوچ کی کسی نئی لہر میں پھر ڈگمگا جاتا۔ اب قطعی پکا ہوگیا تھا۔ یہ روپے خدا نے بھیجے ہیں۔ میری سیتا کے لیے۔

یہ دیوتاؤں کا تحفہ ہے۔
دیوتاؤں کو محبت کرنے والے لوگ اچھے لگتے ہیں
سیتا خوشی سے جھوم جائے گی
آسمان سے برسی خدا کی اس رحمت پر میرا کوئی حق۔ ادھیکار نہیں۔

پیٹر نے پیشین گوئی کی تھی کہ جلد ہی کسی انجانی رشا سے اسے کچھ روپوں کا تحفہ ملنے والا ہے جو اس کی گھریلو زندگی کو جگمگا دے گا۔ پیٹر بڑی باکمال شے ہے۔

پل کو عبور کرکے وہ پہلی والی پٹڑی پر لوٹ آیا۔ کچھ دیر یوں ہی ان منے انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی دھن گونج رہی تھی۔

——سیتا کے لیے وہ کوٹ ——

ٹیکسی والے کو جین سنز کناٹ پلیس کا پتہ دے کر وہ اطمینان سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر نئے کوٹ میں ملبوس سیتا کو دیکھنے لگا۔ اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ بڑا رحیم، بڑا——

ٹیکسی رکی۔ بل چار روپے بیس پیسے کا تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پانچ کا نوٹ تھما دیا اور اس کے شکریہ کا انتظار کیے بغیر کناٹ پلیس کے کاری ڈار کی جانب لپکا۔ کوٹ دکان کے شو ونڈو میں پلاسٹک کی مغربی حسینہ کے بدن پر پہلے ہی کی طرح جمار کھا تھا۔

شام کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا جب وہ کوٹ لے کر گھر پہنچا۔ سیتا گھر کی بالکنی میں کھڑی پچھلے دو گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گھر ہمیشہ وقت پر آتا تھا۔ آج ہی جانے کیا بات ہوگئی!۔

ایک بار اسی طرح دیر سے گھر لوٹنے پر اس نے کہا تھا۔ "اتنی دیر سے نہ آیا کرو جی"۔ ڈر لگتا ہے۔

ڈر کس بات کا؟
یہ دلی ہے۔ جہاں ہر روز ہر قسم کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔
تمہیں کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کبھی کچھ ہوا تو مجھے ہی ہو گا
سیتا جی ہونا۔
اس نے بڑے ابھیمان سے جواب دیا تھا۔ "اس میں کیا شک ہے"
سیتا کی یہ ادا اسے اکثر یاد آیا کرتی کتنی ہی بار وہ بھیانک حادثوں سے بال بال بچ گیا تھا۔
اس روز چنتا کی کوئی ہلکی سی شیڈ اگر کہیں سیتا کے چہرے پر آ گئی تھی تو شوہر کو دیکھتے ہی کافور ہو گئی
تم اتنی دیر کہاں تھے؟
جواب میں اس نے کوٹ کا پیکٹ سیتا کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"ہائے کتنا پیارا ہے۔ یہ وہی ہے نا!"
تمہیں پسند ہے؟
تم لائے ہو پسند کیوں نہ ہو گا۔
دٹ آر دی ڈیمیجز
نن
ڈونٹ ٹیل می۔ یو ڈڈ ناٹ فائنڈ اٹ آن دی روڈ؟
یس آئی ڈڈ!
کچھ ایسی ہی بات ہو گئی آج۔ اس نے ساری کہانی سیتا کو سنا دی
بیچارہ!
کون؟
جس کے روپیوں سے تم میرے لیے اتنا قیمتی تحفہ لائے ہو۔ جانے وہ کیا اور کیسا ہو گا اور جانے ـــــــــ
وہ کوئی ـــــ آدمی نہ تھا سیتے۔ یہ کسی آدمی کا نہیں دیوتاؤں کا وردان ہے۔

کتنی ہی دیر تک نئے کوٹ میں ملبوس وہ شوہر کی گود میں بیٹھی اس کی نکٹائی ۔
رہی اور وہ اسے چومتا چاٹتا رہا ۔ دونوں بے حد خوش تھے ۔

تمہارے ہونٹوں کی چاٹ سے دل و دماغ تو کسی قدر بھر گئے ہیں مگر پیٹ خالی ہے
اب ذرا کھانا بھی ہو جائے ۔ اس بیچ میں ذرا نہا بھی لوں گا ۔

وہ غسل خانے میں تھا جب اس نے مسز شرما کی آواز سنی ۔

یہ لو اپنے روپے اور یہ لو چار کلو روئی اور نئے سوئٹروں کا ناپ ۔ گن لو کل چار سو ساٹھ ہیں ۔ دکاندار کو تمہارا ہاتھ بہت اچھا لگتا ہے ، کتنی ہی عورتیں سوئٹر بنتی ہیں اس کے لیے مگر کہہ رہا تھا کہ دوسری کسی کے ہاتھ میں اتنی صفائی نہیں ۔

غسل خانے کے دروازے کی اوٹ سے وہ دیکھ رہا تھا ۔ اس نے دیکھا کہ سیتا مسز شرما کو اس کی موجودگی سے آگاہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے ، مگر بڑھیا اس کا اشارہ سمجھے بغیر اپنی ہی دھن میں کہے جا رہی ہے ۔

سچ کہتی ہوں سیتا بیٹی ۔ تو لکشمی اور سرسوتی دونوں کی بیٹی ہے ۔ لبھو رام کے نالایق بیٹے پچھلے دو سال سے چوتھی تک کسی طرح پہنچ کر کچھ ایسے اٹک گئے تھے گویا چوتھی جماعت ان کی پڑھائی کی آخری حد ہو اور اب پاس ہوئے ہیں تو اتنے اچھے نمبر لے کر ــــــــــــ

لبھو رام اور اس کی بیوی تمہارے ٹیوشن کے پیسے اور مٹھائی لے کر ایک دو دن میں خود حاضر ہوں گے ۔

تو سیتا گھر بیٹھے بیٹھے لوگوں کے بچوں کو پڑھاتی ہے اور دوسروں کے سوئٹر بھی بنتی ہے اب اس کی سمجھ میں آیا کہ گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے ۔ میں بھی کہوں آخر ایسا کون سا جادو جانتی ہے سیتا جو میری تنخواہ کے اتنے کم روپوں میں اتنے شاندار ڈھنگ سے گرہستی چلا رہی ہے ۔

مسز شرما لوٹ گئیں تو وہ غسل خانے سے باہر نکلا ۔ سیتا نے اسے آتے دیکھا مگر منہ موڑ کر رسوئی میں مشغول ہو گئی ۔ جیسے اس نئے انکشاف نے اس کی چوری شوہر پر ظاہر کر دی ہو ۔

کپڑے بدل کر وہ کھانے کے لیے رسوئی میں ہی آ بیٹھا ۔

چھ سو روپیوں میں میری ٹرانسپورٹ بھی شامل ہے اور میرے سگریٹ، کافی اور دوسرے نجی قسم کے اخراجات بھی۔ بمشکل چار سو گھر کے خرچ کے لیے بچتے ہوں گے مگر پھر بھی ہم دیسی گھی کا بنا کھانا کھاتے ہیں

سیتا چپ تھی۔ ایسے بیٹھی تھی جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہو۔

نوالہ اس کے منہ میں تھا اور پانی اس کی آنکھوں میں۔ میں نے سوچا تمہیں میرا کام کرنا اچھا نہیں لگے گا مگر گھر بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارتے رہنا بھی تو مناسب نہیں۔ دن کا خالی وقت کھانے کو آتا ہے۔ پھر میں خود تو کام لینے باہر جاتی نہیں، نہ پڑھانے ہی کسی دوسرے کے گھر جاتی ہوں۔ تین گھنٹے بچوں کو پڑھا لیتی ہوں اور تین گھنٹے سوئٹر وغیرہ بن لیتی ہوں۔ چھ گھنٹے کے کام سے کوئی مر تھوڑے ہی جاتا ہے

ہمارے دفتروں میں چھ گھنٹے جم کر کام کرنے والا ایک بھی آدمی نہیں۔ غالباً ملک بھر میں بھی نہیں، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے خود بھی دن بھر میں پورے چھ گھنٹے کام کبھی نہیں کیا۔

میرے کام میں دماغ تھوڑے ہی لگتا ہے۔

میرے کام میں ایسا کون سا دماغ خرچ ہوتا ہے۔

تم ناراض ہو؟

نہیں کسی قدر شرمندہ البتہ میں ضرور ہوں کہ یہ اوپر کا کام تمہیں میری وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔ میرے گنے چنے روپیوں میں تو شاید ہم دو وقت کا کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھا سکتے۔

دیکھو جی میں تمہاری اردھانگنی ہوں۔ تمہارا نصف! میرا بیٹر ہاف

وہ صبح اٹھا تو دیکھا کہ سیتا ہاتھ میں چائے کا پیالہ لیے مسکرا رہی ہے۔

بڑے بدمعاش ہو۔ ساری تنخواہ میرے کوٹ پر لٹا دی اور مجھے دلاسہ دینے کے لیے ایک فرضی کہانی بنا کر سنا دی۔

کیا بکتی ہو!

بناوٹی غصہ جتاتے ہوئے سیتا بولی۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ کہاں ہیں وہ

روپے جو تمہیں پل پر پڑے ملے تھے۔

کیا کہہ رہی ہو جان میری۔ سب کچھ میرے کوٹ میں تو ہے۔

وہ تو یہ ہے۔ تمہارے دفتر کے خزانچی کی بنائی ہوئی تمہاری تنخواہ اور ایریرز کی تفصیل:
تنخواہ ۶۵۰ روپے + ایریرز ۴۰۰ روپے۔ اور یہ رہا کوٹ کا کیش میمو۔ اندر کی جیب بھٹی ہوئی تھی تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ ہمیشہ اسی باہر کی جیب میں پیسے رکھتے ہو کیا؟

وہ ایک دم جیسے سکتے میں آگیا۔ اس کی زبان گنگ ہے۔ پچھلے دن کی ساری واردات اس کے ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ چائے کے پیالہ کو لاشعوری طور پر پکڑے پکڑے وہ گزرے کل کی یادوں کو کتنی ہی دیر ذہن کے ناخنوں سے کریدتا رہا ـــــ پھر یکلخت عجیب و غریب آوازوں میں قہقہے اس کے شعور کے چشموں سے جھرنوں کی طرح پھوٹ پڑے ـــــ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور پیالی کی چائے چھلچھلا کر بستر پر بکھر گئی ـــــ کیسا مذاق کیا تھا قدرت نے ـــــ

بے بسی کا قہقہہ آدمی کے قد کو کس بیدردی سے بونا دیتا ہے۔

ظاہر تھا کہ جو روپے اس نے پل پر پڑے پائے تھے اس کے اپنے ہی روپے تھے۔ جنہیں اس نے پل پر سے پہلی بار گزرتے ہوئے کسی طرح غالباً رومال نکالتے ہوئے گرادیا تھا وہ خوش نصیب تھا کہ روپے اسے واپس مل گئے اور ایک اچھے کام لگے۔ اس نے کوٹ کے بارے میں اتنی شدت سے نہ سوچا ہوتا تو وہ پل کو دوسری بار گراس نہ کرتا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو . وہ ایک دم کسی انجانے خوف سے لرز گیا۔

کافی دیر گنگ رہنے کے بعد اس نے سیتا کو پیار سے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

بتو بھی، رات بھر سوئے نہیں ہو۔

تم جانتی ہو سیتا۔ تمہارا یہ کوٹ حاصل کرنا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا میں سوچتا ہوں خدا بھی میرے اس غریب سے جذبہ کو بھانپ گیا تھا۔ کس انوکھی اور معصومانہ عیاری سے مجھے اس کو خریدنے کا مشورہ دیا یوں نہ ہوتا تو شاید چار سو روپے کے اس ایریر کے باوجود میں تمہارے لیے یہ کوٹ ابھی نہ خریدتا

میں خوش ہوں کہ ایسا ہوا۔ کل شام میں نے تمہیں اس کوٹ میں دیکھا تھا۔

یہ کس انوکھی پھبن سے تمہارے بدن پر کھلا تھا۔

یہ تمہارے ہی لیے بنا تھا۔

سیتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ خوشی کے یہ آنسو کتنے بھلے ہوتے ہیں۔

دونوں خاصی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے میں سمٹے روتے روتے ایک بار پھر سو گئے۔

ہوگئی تھی ــــ"

(بقیہ صنـ۸)

"جیل ۔!"

"جی ۔" اس نے آواز دبا کر کہا ۔ ۔۔ بری صحبت کا برا نتیجہ ہی ہوتا ہے ، اسمگلنگ کے چکر میں پڑ گیا تھا ، پولس مقابلے میں پکڑا گیا ، جیل سے بھاگا تو گولی ماردی گئی ۔"

"برجو اور سرجو !"

"وہ بھی بیمار ہو کر چل بسا تھا ــــ"

"اور تلسی ۔!"

"اس کا تو پتہ نہیں ــــ خیر چھوڑیئے ، میں آپ کی سیوا میں حاضر ہوا تھا کہ ــ" اس نے ایک پل میری طرف دیکھا اور جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میز پر رکھ دیا "یہ کچھ سیوا کے تِل پھول لایا ہوں ، ــــ وہ بات یہ ہے کہ ہم جنگل کی چرائی ہوئی لکڑی نہیں لیتے ، ہمارے پاس سب بل وغیرہ موجود ہیں ، دراصل وہ ٹھیکیدار کرتار سنگھ ہے نا ، وہ یہ کالا دھندہ کرتا ہے ــــ"

"آپ مندر کے سکریٹری ہیں ۔؟"

"آپ کو تو سب معلوم ہے ۔" وہ ہنس دیا ۔

"آپ یہ لفافہ اٹھالیں اور جاکر چین سے سوئیں ، آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا"

وہ ایک منٹ تک خاموش بیٹھا میری طرف دیکھتا رہا جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آرہا ہو ۔ پھر اس نے لفافہ اٹھایا اور چلا گیا ۔

ایک پیگ اور لے کر میں نے کھانا کھایا اور سگریٹ سلگا کر باہر لان میں آگیا ہوں مجھے نیند نہیں آرہی ، ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی ہے ۔ لان میں پھولوں کی پتیاں بکھری ہیں اور ایک تتلی مری پڑی ہے ، میں نے تتلی اٹھالی ہے اور درخت کے تلے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا ہوں ، اندھیرے میں ۔

کافی وقت گزر گیا ، درشن سنگھ ساتھ والے کمرے سے نکل کر باہر گیا تھا ، کمرے میں روشنی ہو رہی ہے اور اندر وہ مرد کوئی فلمی گیت گنگنا رہا ہے ، اس کی بھدّی آواز میرے دماغ پر ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح متواتر پڑ رہی ہے ۔

درشن سنگھ لوٹ آیا ہے ، اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے ، چادر سے سر ڈھکنے

میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پاتا۔ درشن سنگھ کے پیچھے چلتی ہوئی وہ پچھلی طرف چلی جاتی ہے، میں نہ جانے کیوں ان کے پیچھے آ گیا ہوں۔

وہ میرے برابر والے کمرے کے باہر کھڑی ہے، پول سے لٹکے بلب کی تیز روشنی اس کے سراپا پر پڑ رہی ہے۔ اندر سے درشن سنگھ کی آواز آتی ہے —— آجا ——" وہ دوبارہ چادر لپیٹ لیتی ہے۔ اس کی کلائی نظر آتی ہے، روشنی میں ہری چوڑیاں بج اٹھتی ہیں۔ میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔

اندر اس مرد نے فلمی گیت گنگنانا بند کر دیا ہے۔ میں خالی اور اداس سا اپنے کمرے میں کھڑا ہوں۔

میرے ہاتھ میں وہ مری ہوئی تتلی ہے۔



اپنے اپنے گھاؤ

امرتا پریتم



کوئی نہیں جانتا ـــــ صرف خدا اور ڈاکٹر جانتے ہیں کہ شنیاں نے اپنے سینے میں ایک گھاؤ چھپا رکھا ہے۔

جس روز ڈاکٹر راؤ نے ویریندر کے ایکسرے کا معائنہ کرتے ہوئے، اس کی بیوی کو تنہائی میں بلا کر کہا تھا، "میں کہہ نہیں سکتا کہ ویریندر کی زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں، ہو سکتا ہے کچھ مہینے بیت جائیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ صرف چند روز ہی بیت سکیں...... دل کے چاروں طرف جو 'کنکٹنگ والوز' ہوتے ہیں ان میں سے ایک 'والو' میں ایک سوراخ ہے، جو کچھ دن پہلے لئے گئے ایکسرے میں کسی دھول جیسا مدھم تھا لیکن اس بار کے ایکسرے میں یقین جیسا فراخ ہے۔ اور ڈاکٹر راؤ نے سرد کاروباری لہجے میں کہا، "اگر یہ سوراخ بدستور مدھم رہتا تو اسے تھکن کا عارضہ مسلسل لاحق رہتا۔ لیکن ممکن تھا کہ وہ کئی برس تک زندہ رہتا، لیکن

ڈاکٹر کو اس 'لیکن' سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شنیاں نے جان لیا تھا کہ سوراخ فراخ تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس سوراخ میں سے ویریندر کی سانسیں رس کر بہہ رہی ہیں اور اس نے ڈاکٹر سے جب کہا کہ "اگر تقدیر نے ہارنا ہی ہے تو ایک کام کیجئے۔ آپ مجھے یوں ہی گنگ رہنے دیجئے جیسے میں کئی مہینوں سے ہوں، آپ ویریندر کو کچھ نہ بتائیے گا۔ اب خواہ اس کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں یا کچھ مہینے، میں اس کی آخری سانس تک اس کے ساتھ یوں جینا چاہتی ہوں۔ جیسے ہم نے حشر تک جینا ہو......"

یہ سن کر ڈاکٹر نے یہ جان لیا کہ شیناں نے اپنے سینے میں وہ سوراخ چھپا لیا ہے، جسے دنیا کا کوئی ایکسرے دریافت نہیں کر سکتا۔

شیناں نے یہ تو جان لیا کہ موت اس کے گھر کا پتا پوچھتی پھرتی ہے۔ لیکن سوچا۔ ابھی جتنے دن تک اسے گھر نہیں ملتا، اور جب تک وہ گھر کے دروازے پر دستک نہیں دیتی، اس وقت تک وہ اپنے گھر کی رونقوں کو بحال رکھنا اور ویریندر کے ساتھ اس طرح جینا چاہتی ہے جیسے ایک مرد ایک عورت نے دنیا میں پہلا گھر آباد کیا ہو....."

ویریندر کو علم ہی نہیں تھا کہ موت بڑی عجلت میں ہے۔ پھر بھی جانے اس کے جی میں کیا آئی، اس نے بڑی کوششوں سے اوپر تلے کر کے میرے لئے یہ گھر خرید لیا شیناں سوچتی رہی" بہ مشکل پانچ برسوں کی ملازمت کی بچت تھی، اس نے کچھ اپنے ماں باپ کی مدد سے اور کچھ دفتر کے تعاون سے یہ چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ اور شیناں کو چھوٹی چھوٹی بات بھی یاد آنے لگی۔" ویریندر کو ٹسری رنگ کے پردے پسند تھے، لیکن ان کے لئے پیسے نہیں بچے تھے، گھر خواہ صرف دو ہی کمروں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ۲۰ × ۲۰ فٹ کا جو باغیچہ ہے، اُس میں وہ کلکتوی گھاس لگوانا چاہتا تھا، اُس میں وہ دو رنگوں والے عشق پیچاں کے پھولوں کی بیل لگوانا چاہتا تھا، ایک گوشے میں رات کی رانی اور دوسرے گوشے میں چمپا، چنبیلی اور سورج مکھی کے پھول بھی..."

اور شیناں نے ٹرنک میں رکھی سونے کی چوڑیاں فروخت کر کے ٹسری ریشم کے پردے خرید لئے، ویریندر کے استفسار پر شیناں نے بتایا کہ مکان کی رسم مبارک باد کے موقع پر ماں نے کچھ نہیں بھجوایا تھا، اس لئے اُس نے کسی آتے جاتے کے ہاتھ پانچ سو روپے بھجوائے ہیں۔

شیناں سچ مچ من کی اس شہ نشین پر ایستادہ تھی۔ جہاں کئی جھوٹ بھی سچ جیسے پاکیزہ ہوتے ہیں.......

پانچ مہینے پہلے ویریندر کو بیڈمنٹن کھیلتے ہوتے اچانک اپنی سانس اکھڑی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور اس کے بعد سے وہ سرِشام عجیب سی تھکن محسوس کرنے لگتا۔ نہ کہیں کوئی ٹیس تھی نہ درد لیکن جیسے ہڈیوں میں سے ہر روز کچھ گھلتا جا رہا ہو۔ اور

اب پچھلے مہینے سے ویریندر نے دفتر سے رخصت لے لی تھی۔

شیناں نرسری میں سے ایک پودا روز خرید کر لاتی اور ہر صبح اپنے مختصر سے باغیچے میں وہ ویریندر کے ہاتھ سے یوں لگواتی جیسے وہ ویریندر کو ذرہ ذرہ کرکے ہر روز زمین میں بو رہی ہو۔

شیناں کا بہت جی چاہا ——— کہ وہ ویریندر کا ایک ذرہ اپنے بطن میں بھی بولے ..... لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی، اب تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ویریندر نے شادی ہی نہ کی ہوتی۔ اس قسم کے مریض کے لئے جسم کی تلخی موت کا جھٹکا بھی ثابت ہو سکتی ہے، "اگر پتہ ہوتا ..... ، شیناں کو ایک حسرت نے آیا لیکن اب کسی حسرت میں گنوانے کے لئے وقت نہیں بچا تھا۔ اب صرف ویریندر کے چہرے کو جی بھر کر تکتے رہنے کا وقت تھا ..... شیناں بیدار ویریندر کو تکتی رہتی تھی اور خوابیدہ ویریندر کو بھی۔

شیناں کے گھر سے متصل گھر مدتوں سے خالی تھا جس کی ویرانی کبھی کبھی راتوں کو شیناں پر ہراس طاری کر دیتی تھی۔ وہ انہی دنوں آباد ہو گیا تھا ——— اس گھر کی آبادی ایک عورت ایک مرد اور دو بچوں پر مشتمل تھی .... دیوار کے اس پار سے آتی آوازیں شیناں کو بہت اچھی لگتیں، جن میں بچوں کی کلکاریاں بھی تھیں اور مند بھری چیخیں بھی، مرد اور عورت کی ایک دوسرے کے لئے پکاریں بھی اور گھڑکیاں بھی اور شیناں آبادی کی علامتوں کو محسوس کر کے بہ مشکل مسکرا سکی تھی، اُسے لگا تھا ——— اُس گھر کی ویرانی اب رینگتے رینگتے، دیوار کے اوپر سے گھسٹتی پھسلتی ——— اِس طرف ——— اس گھر کی طرف ——— اس گھر کی طرف آرہی ہے۔

پھر شام بھیگ رہی تھی، جب شیناں کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شیناں نے اپنے باپ اور بھائی تک کو اپنے حالات تک کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اسے کسی کا تیمارداری کے لئے آنا بھی قبول نہیں تھا، وہ نہیں چاہتی تھی ——— کوئی مرنے سے پہلے ویریندر کو موت کی آغوش میں سسکتے دیکھے، اس لئے اس وقت ڈاکٹر راؤ کے علاوہ کوئی نہیں آسکتا تھا۔ جو پچھلے دنوں ایک بار ویریندر کو اسی طرح دیکھنے آگیا تھا۔

لیکن اُس کا دوسری بار آنا ویریندر کو شبہات میں مبتلا کر سکتا تھا، اس لئے شنیاں کو دروازے کی دستک اچھی نہ لگی لیکن جھجک کر دروازہ کھولتے ہوئے اس نے دیکھا، "آنے والا ڈاکٹر راؤ نہیں، حال ہی آباد ہونے والے گھر کی عورت تھی۔

عورت کسی پریشانی میں تھی، کہنے لگی "آپ کے گھر میں فون ہے، میں ایک فون کرنا چاہتی ہوں، میں آپ کی ہمسایہ ہوں مسز کپور......

شنیاں نے ویریندر کے کمرے والا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا، وہ سو رہے ہیں آپ فون کریں۔ مسز کپور، لیکن ذرا آہستہ بولئے گا۔"

عام سا فون تھا، عورت نے اپنے شوہر کے دفتر کا نمبر ملایا اور پوچھا کہ وہ دفتر میں ہیں یا چلے گئے ہیں لیکن فون کر کے وہ یوں حواس باختہ ہوگئی کہ شنیاں نے اسے کرسی پیش کرتے ہوئے پانی کے لئے پوچھ لیا، اور یہ بھی کہ شاید اس کے گھر میں کوئی پریشان کن بات ہو گئی ہے اور یہ کہ اگر وہ کوئی مدد کر سکے......

عورت کی عمر اگرچہ ڈھل نہیں رہی تھی لیکن وہ پژمردہ سی تھی۔ رکھ رکھاؤ بہت سلیقے کا تھا مگر اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی میں دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی، نہیں، یونہی دیر ہوگئی ہے ابھی وہ گھر نہیں لوٹے، سوچا دفتر سے معلوم کروں......

عورت کے سادہ سے الفاظ کے درمیانی وقفوں میں جو پریشانی پوشیدہ تھی اس میں عمومیت نہیں تھی، لیکن شنیاں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا، بلکہ پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

عورت چلی گئی لیکن رات کے تیسرے پہر اس کے گھر سے پہلے مرد کے اونچی آواز میں بولنے اور پھر عورت کے سسک سسک کر رونے کی آواز آئی تو شنیاں کو اپنے شام کے اندازے درست لگے، عورت کی اداسی شاید ایک دن کی نہیں تھی— اس کے پیچھے شاید بہت سارے دن تھے۔

ویریندر کی کمزوری بڑھتی گئی، وہ ذرا سا اٹھتا، باغیچے تک جاتا یا صرف غسل خانے تک جانے کی زحمت اٹھاتا تو اس کے ماتھے پر پسینے کے سرد قطرے امڈ آتے اور وہ نڈھال سا ہو کر یوں چارپائی پر لیٹ جاتا کہ اس کی مندی آنکھوں سے یہ بھی پتہ نہ چل پاتا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اور شنیاں گھر کا سارا کام دبے پاؤں انجام دیتی

رہتی کہ کہیں وہ آواز سے جاگ نہ جائے۔

تیسری دوپہر کو ـــــ شیناں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ مسز کپور کچھ سبزی وغیرہ خرید کر باہر سے آرہی ہیں، انھوں نے سبزی اپنے گھر میں لیجا کر رکھی اور پھر شیناں کے گھر کا رخ کیا......

شیناں نے دروازے پر دستک ہونے سے پہلے ہی اسے کھول دیا۔ مسز کپور نے جھجکتے ہوں فون کرنے کی اجازت مانگی اور پھر وہی نمبر، وہی دفتر، وہی استفسار اور فون بند کر کے خوفزدہ آنکھوں سے، بے بس سی ہو کر کرسی میں ڈھ گئی۔

شیناں نے اتفاق سے اپنے لئے چار بنائی تھی، جسے اس نے دو پیالیوں میں انڈیلا اور ایک پیالی ان کے آگے رکھ دی۔

مسز کپور نے رسمی طور پر انکار کیا لیکن شاید ایک گرم گھونٹ کی اسے سچ مچ ضرورت تھی۔

گرم گھونٹ کی بھی اور شاید ہمدردی کے بول کی بھی.......

کہنے لگی، شیناں بہن! میں تمہیں بے وقت تکلیف دیتی ہوں ـــــ

اور شیناں کے مانوس سے چہرے کے آگے اس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔

"میرے شوہر کی زندگی میں جانے کتنی عورتیں ہیں...... آج جب میں سبزی خریدنے گئی تو دور سے کار نظر آئی، لگا وہ بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ہمراہ ایک عورت ہے...... یہ بھی سوچا کہ یہ سب میرا وہم ہو، وہ تو اپنے دفتر میں ہوں گے۔ اسی لئے فون کیا..... وہ سچ مچ اپنے دفتر میں نہیں ہیں...... تو وہی تھے۔ اور ساتھ جانے کون تھی..... اور مسز کپور نے بتایا کہ جس علاقے میں وہ پہلے رہتے تھے، اس گھر کی ہمسایہ عورت کے ساتھ مسٹر کپور نے ~~اپنے~~ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ اور میں نے سوچا تھا، گھر بدل لیں گے تو وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا...... لیکن یہاں بھی...... نہ جانے یہ کون تھی..... کوئی نئی لگتی تھی......

اور مسز کپور نے آبدیدہ ہو کر کہا "جب شام ہوتی ہے...... میرا شوہر گھر نہیں آتا..... سوچتی ہوں ـــــ خدا جانے، اس وقت وہ کس کے ساتھ ہوگا، اس کا انتظار کرتے ہوئے بھی روتی ہوں...... اور جب گھر آتا ہے تو دیکھ کر بھی روتی ہوں.......

شیناں نے سوچا "اس کا شوہر ہے، جو نہ جانے کس کس کے پاس جاتا ہے۔ لیکن رات گئے گھر لوٹ آتا ہے ــــ اپنی بیوی کے پاس ..... لیکن میرا شوہر جلد بہت جلد ــــ وہاں چلا جائے گا، جہاں سے وہ کبھی نہیں آسکے گا اور میرے پاس انتظار کرنے کا بھی کوئی بہانہ نہیں ہوگا......

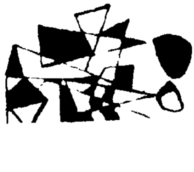
اور جب شیناں کے چہرے پر اداسی کی زردی اور گہری ہوگئی تو مسز کپور نے درد بھرے لہجے میں پوچھا "شیناں بہن! آپ کے شوہر بیمار ہیں کیا؟ میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں ..... وہ دفتر نہیں جاتے، کہیں بھی باہر نہیں جاتے .....؟" اور شیناں کا دل بھر آیا اور من کا جو سوراخ اس نے کسی کو نہیں دکھایا تھا ــــ مسز کپور کو دکھا دیا۔

مسز کپور نے کہا کچھ نہیں لیکن اس کے من میں ایک رشک نے انگڑائی لی "یہ کتنی خوش بخت ہے، کہ اس کا شوہر آخری دم تک اس کا شوہر ہے، وہ مر کے بھی اس کے لئے زندہ رہے گا، یہ اس کی ایک ایک یاد میں جیئے گی، ..... اس کے لگائے ہوئے پودے جب پھل دیں گے اسے ہر پتی میں سے اور ہر رنگ میں سے اس کی مہک آئے گی۔"

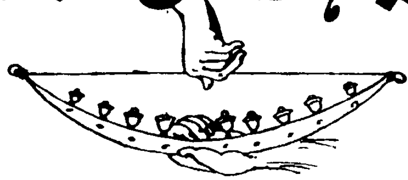
اور شیناں آب دیدہ ہو کر اٹھی اور جاتی ہوئی مسز کپور کی پیٹھ کو تکتی رہی، "مجھ سے تو اس کے نصیب اچھے ہیں، جب اس کا شوہر آتا ہے، یہ اس سے لڑ سکتی ہے، اس کے آگے رو سکتی ہے، لیکن میں کس سے لڑوں گی ..... میں کس کے آگے روؤں گی....."

اور شیناں کے کانوں میں اپنی اور ویریندر کی وہ آواز ابھر آئی۔ جب ویریندر باہر سے آتے ہوئے اس کے لئے پھول لاتا اور کہتا تھا "اے میری اکلوتی بیوی! دیکھو" اور شیناں اس کے شانوں پر اپنا سر رکھ کر کہتی "میرے اکلوتے شوہر! اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں میں لگا دو۔"

اور آج ــــ باغیچے میں نیا اگا ہوا ایک پھول توڑ کر ویریندر کے کمرے میں رکھتی شیناں کو لگا ــــ" اس کی چھاتی میں لگا ہوا گھاؤ بہت فراخ ہو گیا ہے۔"



یہ کہانی نہیں



امرتا پریتم

پتھر اور چونے کی فراوانی تھی لیکن اگر اسے تھوڑی سی جگہ پر استوار کیا جا سکتا تو ایک گھر کی دیواریں جنم لے سکتی تھیں۔ لیکن گھر تعمیر نہ ہو سکا۔ وہ دھرتی پر پھیلتا چلا گیا سڑکوں کی طرح، اور وہ دونوں عمر بھر انھیں سڑکوں پر گردش کرتے رہتے......

سڑکیں ایک دوسری کی پسلی سے طلوع بھی ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے بدن کو چیر کر گزرتی بھی ہیں اور ایک دوسرے سے گلے ملتی ایک دوسری میں مدغم ہو جاتی ہیں..... وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے، لیکن صرف اس وقت جب کبھی ان کے پاؤں تلے، بھی سڑکیں ایک دوسرے سے آملتیں۔

گھڑی بھر کے لیے سڑکیں بھی ہڑبڑا کر ساکت ہو جاتیں اور ان کے پاؤں بھی .....اور شاید ان دونوں کو کبھی اس گھر کا خیال آجاتا جو تعمیر ہی نہیں ہوا تھا۔ بن سکتا تھا، مگر کیوں نہ بنا؟ وہ دونوں حیرت زدہ سے، پاؤں تلے کی زمین کو یوں دیکھنے لگ جاتے، جیسے وہ اس سوال کا جواب زمین ہی سے طلب کر رہے ہوں.......

اور پھر وہ تا دیر یوں سوئے زمین دیکھتے جیسے وہ اپنی پلکوں سے زمین میں اس گھر کی بنیادیں کھود سکتے ہوں........

اور کئی بار سچ مچ وہاں ایک طلسمی مکان وجود میں آجاتا اور دونوں کا دل ہلکا ہو جاتا جیسے وہ برسوں سے اس مکان کے مکیں ہوں....... یہ ان کی سلگتی جوانیوں کے موسم کا تذکرہ نہیں ہے، حال ہی کا سانحہ ہے، ٹھنڈی رت کا حصہ کہ 'الف'

ایک سرکاری اجلاس میں شرکت کے لئے 'سین' کے شہر گئی۔ 'الف' کو بھی وقت نے 'سین' کے ہم منصب سرکاری عہدہ دے رکھا ہے۔ یہ برابر کی حیثیت کے لوگ جب اجلاس سے فارغ ہوئے، تو دفتر کی طرف سے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے، واپسی ٹکٹ تیار تھے "سین" نے آگے بڑھ کر 'الف' کا ٹکٹ لے لیا اور باہر آکر 'الف' کو گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔

پوچھا..... "سامان کہاں ہے؟"

"ہوٹل میں۔"

سین نے ڈرائیور کو پہلے ہوٹل اور پھر گھر چلنے کی ہدایت کی۔

"الف" نے کوئی عذر پیش نہیں کیا لیکن دلائل دے کر کہا۔ طیارے کی روانگی میں دو گھنٹے باقی ہیں۔ ہوٹل تک پہنچنے کے بعد ایئر پورٹ جانے کا وقت بھی مشکل ہی سے میسر آئے گا۔

طیارہ کل بھی اڑے گا، پرسوں بھی، ہر روز پرواز جاتی ہے۔ "سین" نے صرف اتنا کہا، پھر راستے بھر خاموشی چھائی رہی۔

ہوٹل میں سے سوٹ کیس لے کر گاڑی میں رکھ لیا گیا تو ایک بار "الف" نے پھر کہا ــــــ

"وقت مختصر ہے، طیارہ چھوٹ جائے گا۔"

"سین" نے جواب میں صرف اتنا کہا، "گھر میں ماں انتظار کرتی ہو گی۔"

"الف" سوچتی رہی کہ سین نے شاید ماں سے اس اجلاس کے بارے میں پہلے سے کہہ رکھا تھا لیکن وہ بات کو پوری طرح نہ سمجھ سکی، ــــــ کہ کیا بتایا ہو گا۔

"الف" کبھی کبھی من سے 'کیوں' کا جواب مانگ لیتی تھی لیکن اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی شیشے میں سے شہر کی عمارتوں کو دیکھتی رہی........

کچھ دیر بعد عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شہر سے دور سفید زمین دکھائی دینے لگی تھی اور پام کے کشیدہ قامت درختوں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں.....سمندر شاید بہت قریب تھا، 'الف' کی سانسیں نمکین سی ہو گئی تھیں اور لگا ــــــ کہ پام کے پتوں کی طرح کپکپاہٹ اس کے ہاتھوں میں بھی سرایت کر گئی ہے، شاید 'سین' کا گھر

بھی قریب آگیا تھا۔

درختوں کے پتوں میں ملفوف ایک کاٹیج کے قریب پہنچ کر گاڑی رک گئی ہے 'الف' اتری لیکن کاٹیج کے اندر داخل ہونے سے پہلے پل بھر کے لئے کیلے کے پیڑ کے پاس رک گئی۔ جی چاہا ___ کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو کپکپاتے ہوئے پتوں کے پاس یہیں چھوڑ جائے۔ وہ 'سین' کے ہمراہ کاٹیج میں جا سکتی تھی لیکن وہاں پر ہاتھوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی ___ ان ہاتھوں سے نہ تو اب وہ 'سین' کو ہی کچھ دے سکتی تھی اور نہ ہی 'سین' سے کچھ لے سکتی تھی......

ماں نے شاید گاڑی کی آواز سن لی تھی، وہ باہر آگئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح 'الف' کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا اور کہا "آؤ بیٹی"۔

اس بار الف کئی سال بعد ماں سے ملی تھی لیکن ماں نے اس کے سر پر ہاتھ کی ہتھیلی پھیرتے، جیسے اس کے سر سے برسوں کی بوجھ کے گرد بھی پونچھ ڈالی تھی اور اسے اندر لے جا کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی ___ کیا پیو گی بیٹی؟

"سین" بھی اب تک اندر آگیا تھا، ماں سے کہنے لگا، "پہلے چائے، پھر کھانا۔"

'الف' نے دیکھا ___ ڈرائیور گاڑی میں سے اس کا سوٹ کیس اندر لا رہا تھا۔ اس نے 'سین' کی طرف دیکھا، کہا ___ بہت کم وقت ہے، بمشکل ہوائی اڈے تک پہنچ پاؤں گی۔

'سین' نے اس سے نہیں ڈرائیور سے کہا، "کل صبح جا کر پرسوں کے لئے ٹکٹ لے آنا۔" اور ماں سے کہا، "تم کہتی تھیں، تمہارے کچھ دوستوں کو کھانے پر بلانا ہے، کل بلا لینا۔" 'الف' نے 'سین' کی جیب کی طرف دیکھا، جس میں اس کا واپسی ٹکٹ تھا اور کہا ___ لیکن یہ ٹکٹ ضائع ہو جائے گا.......

ماں رسوئی کی طرف جاتے جاتے رک گئی اور الف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ "ٹکٹ کا کیا ہے بیٹی، وہ تم سے اتنا اصرار کر رہا ہے، سو رک ہی جاؤ۔"

"لیکن کیوں؟" الف کے دل میں ایک سوال نے آنکھ کھولی، لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے سے ملحقہ برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ سامنے دور تک پام کے اونچے اونچے پیڑ تھے۔ اُن سے آگے سمندر نظر آ رہا تھا جس کی لہروں کی آواز

سنائی دے رہی تھی الف کو لگا۔ صرف ایک ہی سوال نہیں بلکہ کتنے ہی سوالات اس کے من سمندر میں ان پیڑوں کی طرح اُگے ہیں اور ان کے پتے کتنے ہی برسوں سے ہوا میں کھڑے کپکپا رہے ہیں۔ "الف" نے گھر کی مہمان کی طرح چائے پی، رات کو کھانا کھایا اور غسل خانے کا پتہ پوچھ کر شب خوابی کا لباس پہن لیا۔ گھر میں ایک مستطیل ملاقاتی کمرہ تھا، ڈرائنگ، ڈائننگ اور دو خواب گاہیں، ایک "سین" کے لئے ایک ماں کے لئے ماں نے اصرار کر کے اپنا کمرہ 'الف' کو دے دیا اور خود رات کو ڈرائنگ روم میں سوئی۔

الف اپنی خواب گاہ میں چلی گئی لیکن کتنی دیر تذبذب کے عالم میں ایستادہ رہی وہ سوچ رہی تھی ـــــ میں ڈرائنگ روم میں ایک دو راتیں مسافروں کی طرح ہی کاٹ لیتی ـــــ یہ کمرہ ماں کا تھا، ماں کے لئے ہی رہنا چاہیے تھا....

خواب گاہ کی مسہری پر، پردوں کے درمیان اور الماری میں اک خانگی سی باس ہوا کرتی ہے۔ 'الف' نے اس باس کا ایک گھونٹ لیا لیکن پھر اپنی سانسوں سے خوفزدہ ہو کر سانس روک لی......

ملحقہ کمرہ 'سین' کا تھا، جہاں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، گھڑی بھر پہلے "سین" نے سر درد کی شکایت کی تھی۔ خواب آور گولی کھائی تھی اور اب تک شاید سو گیا تھا لیکن ملحقہ کمروں کی بھی ایک باس ہوتی ہے۔ 'الف' نے اس کا ایک گھونٹ سا حلق میں انڈیلنا چاہا لیکن سانس رکی رہی۔

پھر الف کی نگاہ الماری کے پاس فرش پر پڑے اپنے سوٹ کیس پر گئی۔ اور اسے ہنسی آ گئی ـــــ یہ رہا میرا سوٹ کیس، مجھے رات بھر اپنے مسافر ہونے کا احساس دلاتا رہے گا۔

اور پھر سوٹ کیس کی طرف دیکھتی، تھکی تھکی سی، سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ سو کر بیدار ہوئی تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں رات کی ضیافت کا اہتمام ہو رہا تھا۔

ایک بار تو 'الف' اپنی پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ ڈرائنگ روم میں سامنے ہی سین کھڑا تھا۔ کمر میں نیلے چارخانوں کا تہمد تھا۔ 'الف' نے اسے کبھی شب خوابی کے لباس میں نہیں

دیکھا تھا، ہمیشہ دن کے وقت ہی دیکھا تھا — کسی سڑک پر، سر راہے، کسی کیفے میں، ہوٹل میں، یا سرکاری تقریبات میں — اس کا یہ روپ بہت نویلا تھا جو 'الف' کو بہت بھایا اور یادوں میں الجھ سا گیا۔

'الف' خود بھی اس وقت جامۂ شب خوابی میں تھی لیکن 'الف' نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت اس کا احساس نہیں کیا تھا، اب خیال آیا تو اپنا آپ بھی اجنبی لگا — جو دھیرے دھیرے معمول کی بات لگنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں کھڑا 'سین' 'الف' کو آتے دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ دو صوفے ہیں۔ انھیں ایک ہی قطار میں رکھ دیتے ہیں؛ وسط میں گنجائش نکل آئے گی۔

'الف' نے صوفوں کو آراستہ کرنے میں ہاتھ بٹایا، چھوٹی میز کو اٹھا کر کرسیوں کے وسط میں رکھا، تب ماں نے رسوئی گھر میں سے آواز دی اور 'الف' نے چائے لاکر میز پر رکھ دی۔

چائے پی کر 'سین' نے اس سے کہا چلو، جن لوگوں کو مدعو کرنا ہے ان کے گھروں پر جاکر بلاوا دے آئیں اور ساتھ ہی لوٹتے وقت کچھ پھل لے آئیں گے۔

دونوں نے پرانے شناساؤں کے دروازوں پر دستک دی، پیغامات دیئے، راستے میں خریداری کی اور واپس آکر دوپہر کا کھانا کھایا اور ڈرائنگ روم کو پھولوں سے آراستہ کرنے لگے۔

دونوں نے راستے میں بہت عام سی باتیں کی تھیں۔ کون سے پھل خریدنے ہیں؟ فلاں شخص کا گھر راستے میں پڑتا ہے، اُسے بھی بُلا لیں گے اور یہ ساری باتیں وہ نہیں تھیں — جو کوئی سات برس کے بعد ملنے پر کیا کرتا ہے۔

'الف' کو صبح کے وقت دوستوں کے گھر پر پہلی اور دوسری دستک دیتے ہوئے تھوڑی سی پریشانی کا احساس ہوا تھا، گو وہ دوست 'سین' ہی کے تھے لیکن مدتوں سے 'الف' کو بھی جانتے تھے۔ دروازہ کھول کر جب اسے 'سین' کے ہمراہ دیکھتے تو متحیر ہو کر کہہ اٹھتے، "آپ؟"

لیکن جب وہ اپنی گاڑی میں واپس آکر بیٹھتے تو 'سین' ہنس پڑتا — "دیکھا! کتنا حیران رہ گیا ہے، اُس کے منہ سے تو بات ہی نہیں نکل رہی تھی — ..." اور پھر

ایک دو بار کے بعد دوستوں کی حیرانی بھی ان کی معمول کی باتوں میں شامل ہو گئی 'سین' کی طرح 'الف' بھی ایک اطمنان کی ہنسی ہنسنے لگی۔

غروب کے ہنگام 'سین' نے سینے میں درد کی شکایت کی۔ ماں نے ایک کٹوری میں برانڈی انڈیلی اور 'الف' سے کہا ــــ "لے بیٹی! یہ برانڈی اس کے سینے پر مل دو۔"

اس وقت تک شاید یہ سب کچھ معمول میں شامل ہو گیا تھا، "الف" نے "سین" کی قمیض کے اوپر والے بٹن کھولے اور ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کے سینے پر برانڈی کی مالش کرنے لگی۔

باہر بام کے درختوں کے پتے اور کیلوں کے پات شاید ابھی تک کانپ رہے تھے لیکن 'الف' کے ہاتھ میں لرزش نہیں تھی۔ ایک دوست وقت سے پہلے ہی آگیا تھا۔ "الف" نے برانڈی میں بھیگے ہاتھوں سے اس کو خیر مقدمی سلام بھی کہا اور پھر کٹوری میں ہاتھ ڈبو کر باقی ماندہ برانڈی 'سین' کی گردن پر مل دی۔ شانوں تک۔

آہستہ آہستہ کمرہ مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ 'الف' فریج میں سے برف نکالتی رہی اور سادہ پانی بھر بھر کر فریج کے اندر رکھتی رہی۔ بیچ بیچ میں رسوئی کی طرف جاتی اور ٹھنڈے کبابوں کو پھر سے گرم کر لاتی، صرف ایک بار جب 'سین' نے اس کے کان کے قریب ہو کر کہا ــــ تین چار تو بن بلائے مہمان بھی وارد ہو گئے ہیں، ضرور کسی دوست نے ان سے کہا ہو گا، تمہیں دیکھنے کے لئے آگئے ہیں تو دم بھر کے لئے 'الف' کی طبیعت ماند سی پڑ گئی اور پھر جب 'سین' نے اس سے کچھ گلاس دھونے کے لئے کہا تو پھر اس کی طبیعت دوبارہ بحال ہو گئی۔

محفل میں گرمی آگئی، رات خنک ہو گئی اور جب نصف شب کے قریب سب چلے گئے تو الف کو خواب گاہ میں جا کر شب خواب کا لباس نکال کر پہنتے ہوئے محسوس ہوا کہ سڑکوں پر تعمیر شدہ جادو کا گھر، اب کہیں نہیں ہے......

یہ طلسمی گھر اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ تعمیر ہوتے ہوئے بھی، مٹتے ہوئے بھی اس لئے وہ حیران نہیں تھی، صرف تھکی تھکی سی سرہانے پر سر رکھ کر سوچنے لگی۔ کب کی بات ہے، شاید پچیس برس ہو چکے ہیں، نہیں تیس برس، جب وہ پہلی بار زندگی

کی سڑکوں پر ملے تھے...... الف کس سڑک سے آئی تھی اور سین کس سڑک سے، دونوں ایک دوسرے سے پوچھنا بھی بھول گئے تھے اور بتانا بھی۔ وہ نگاہیں جھکائے زمین میں بنیادیں کھودتے رہتے اور پھر وہاں جادو کا ایک گھر بن گیا۔ اور وہ بہت مطمئن دل سے گھر میں آباد ہو گئے۔

پھر جب دونوں کی سڑکوں نے انھیں آوازیں دیں تو وہ اپنی اپنی سڑک کی طرف جاتے ہوئے خوف زدہ ہو کر رک گئے تھے۔ دیکھا ــــ دونوں سڑکوں کے وسط میں ایک گہری کھائی تھی۔ "سین" دیر تک اس کھائی کی طرف دیکھتا رہا، جیسے الف سے پوچھ رہا ہو کہ تم اس کھائی کو کس طرح پھاند سکو گی؟ الف نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن سین کے ہاتھ کی طرف دیکھا تھا، جیسے کہہ رہی ہو ــــ تم ہاتھ تھام کر مجھے اس پار لے جاؤ، میں مذہب کی اس کھائی کو عبور کر لوں گی۔

تب سین نے اوپر کی طرف نگاہ اٹھائی اور الف کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جس کی ایک انگلی میں ہیرے کی انگشتری جگمگا رہی تھی، سین بہت دیر تک ایک ٹک دیکھتا رہا ــــ تمہاری انگلی کے گرد قانون نے جو بند باندھ رکھا ہے، میں اس کا کیا کروں گا؟ الف نے اپنی انگلی کی طرف دیکھا تھا اور آہستہ سے ہنس دی تھی جیسے کہہ رہی ہو ــــ تم اک بار کہو تو، میں قانون کا یہ بندھن اپنے ناخنوں سے توڑ دوں گی۔ ناخنوں سے نہ ٹوٹ سکا تو دانتوں کی آزمائش سے شکست کھا جائے گا۔

لیکن سین خاموش رہا تھا اور الف بھی خاموش کھڑی رہی تھی لیکن جیسے سڑکیں ایک جگہ رک کر بھی مسافر رہتی ہیں، وہ بھی ایک ہی جگہ پر کھڑے چلتے رہتے ــــ

تب ایک دن سین کے شہر سے آنے والی سڑک الف کے شہر آ گئی تھی۔ اور الف نے سین کی آواز سن کر اپنے ایک برس کے بچے کو اٹھا لیا تھا اور باہر سڑک پر اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ سین نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھا کر سوئے ہوئے بچے کو تھام کر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا اور پھر وہ دن بھر اس شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہتے ......

وہ ان کی سلگتی جوانی کے دن تھے، ــــ نہ دھوپ کی شدت ہی کھلتی تھی اور نہ ہی سرما کی سختی۔ اور جب چائے پینے کے لئے وہ ایک کیفے میں گئے تھے تو بیرے نے ایک مرد ایک عورت اور ایک بچے کو دیکھ کر فیملی کیبن کی کرسیاں پونچھ

کرماف کی تھیں اور کیفے کے اس مخصوص کیبن میں یہ جادو کا گھر تعمیر ہو گیا تھا۔
اور ایک بار ــــ اچانک، چلتی ہوئی گاڑی میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سین بھی تھا، ماں بھی اور سین کا ایک دوست بھی۔ الف کی نشست بہت دور تھی لیکن الف کے دوست نے اپنی نشست اس سے بدل لی تھی، اس کا سوٹ کیس بدل کر سین کے پاس رکھ دیا تھا، گاڑی کا دن خنک نہیں تھا لیکن رات خنک تھی، ماں نے دونوں کو ایک کمبل دے دیا تھا، آدھا سین کے لئے تھا اور آدھا الف کے لئے۔ اور اس چلتی گاڑی میں مشترکہ کمبل کے پلو اس طلسمی گھر کی دیواروں میں بدل گئے تھے.......

جادو کی دیواریں تعمیر ہوتی تھیں، مٹتی تھیں اور آخر ان کے اندر کھنڈروں کی خاموشی کا ایک انبار لگ جاتا تھا۔
سین کے لئے کوئی پابندی نہ تھی لیکن الف کے لئے زندگی ایک قانون کی پابند تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ وہ دونوں عمر بھر زندگی کی شاہراہوں پر بھٹکتے ہی رہے تھے........

اب تو زندگی بیت چکی، الف نے عمر کے سلگتے دنوں کی بابت بھی سوچا اور اب کے خنک دنوں کے بارے میں بھی' لگا ــــ سارے ہی دن، سارے ہی برس پام کے پتوں کی طرح، ہوا میں آویزاں، کپکپا رہے تھے۔ بہت دیر ہوئی، ایک بار الف نے برسوں کی خاموشی کو توڑ کر پوچھا تھا ــــ تم بولتے کیوں نہیں؟ کچھ بھی کہتے، کچھ تو کہو لیکن سین ہنس دیا تھا، کہنے لگا ــــ یہاں روشنی بہت ہے، ہر جگہ روشنی ہوتی ہے، مجھ سے روشنی میں بات نہیں ہو سکتی اور الف کے جی میں آئی ــــ کہ وہ ایک بار سورج کو پھونک مار کر بجھا دے......
سڑکوں پر صرف دن طلوع ہوتے ہیں۔ راتیں تو گھر میں آتی ہیں لیکن گھر کوئی نہیں تھا، اس لئے رات کوئی نہیں تھی..... ان کے پاس صرف سڑکیں تھیں اور سورج تھا اور سین سورج کی روشنی میں بولتا نہیں تھا........ ایک بار بولا تھا۔
خاموش بیٹھے ہوئے سین سے الف نے پوچھا ــــ کیا سوچ رہے ہو؟ تو وہ بولا تھا ــــ سوچ رہا ہوں ــ" لڑکیوں سے فلرٹ کروں اور تمہیں دکھ پہنچاؤں۔"

لیکن یوں شاید الف دکھی نہیں سکھی ہو سکتی تھی۔ اس لئے الف بھی ہنس دی تھی اور سین بھی۔

اور پھر ایک طویل خاموشی......

کئی بار الف کے جی میں آئی ــــ ہاتھ بڑھا کر سین کو اس کی چپ میں سے باہر نکال لائے، وہاں تک ــــ جہاں تک دل کا درد ہے، لیکن وہ صرف اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی تھی، اس نے ہاتھوں سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا.........

پھر ایک بار سین نے کہا تھا ــ

"چلو، چین چلیں۔"

.....چین؟

..... جائیں گے لیکن لوٹ کے نہیں آئیں گے۔

لیکن چین ہی کیوں؟

یہ کیوں بھی شاید پام کے پیڑ جیسا تھا جس کے پتے پھر ہوا میں کپکپا رہے تھے......

اس وقت الف نے سر سرہانے پر رکھا تھا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ سین برابر والے کمرے میں سو رہا تھا، شاید خواب آور گولی کھا کر۔ الف کو نہ اپنی اس بیداری پر غصہ آیا نہ 'سین' کی نیند پر، وہ صرف یہ سوچ رہی تھی ــــ کہ دو سڑکوں پر چلتے جب کبھی مل جاتے ہیں تو وہاں گھڑی بھر کے لئے ایک طلسمی گھر کیوں تعمیر ہو جاتا ہے؟

الف کو ہنسی آ گئی ــــ کاش سلگتی جوانی کے ہنگام کبھی یوں ہوتا، اب کیوں ہوا آج کیوں ہوا؟

جانے کیا بات تھی جو عمر کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

باقی ماندہ رات جانے کس وقت بیتی، دروازے کو دستک دیتے ہوئے ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ ایئرپورٹ پر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

'الف' نے ساڑھی پہنی، سوٹ کیس اٹھایا، سین بھی بیدار ہو کر اپنے کمرے میں سے ادھر آ گیا تھا اور وہ دونوں اس دروازے کی طرف بڑھے جو باہر جانے والی سڑک کی جانب کھلتا تھا۔

ڈرائیور نے الف کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا تھا، الف کو اپنے ہاتھ اور خالی

لگے۔ وہ دہلیز کے پاس آکر رک گئی، پھر تیزی سے اندر گئی اور ڈرائنگ روم میں سوتی ماں کو خالی ہاتھوں سے پرنام ساکر کے باہر نکل آئی......

تب ایئرپورٹ والی سڑک شروع ہوئی اور ختم پر آگئی لیکن سین بھی چپ تھا اور الف بھی۔

اچانک سین نے کہا — تم کچھ کہنا چاہ رہی تھیں؟

— نہیں۔ الف نے کہا۔

اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔

پھر الف کو لگا اور شاید سین کو بھی کہ بہت کچھ کہنا تھا بہت کچھ سننا تھا لیکن بہت دیر ہو گئی تھی اور اب یہ سبھی الفاظ زمین میں گڑ گئے تھے، بام کے پیڑ بن گئے تھے اور رمن کے سمندر کے پاس اُگے ان پیڑوں کے پات شاید اس وقت تک لرزتے رہیں گے جب تک ہوا بہ رہی ہے۔

ایئرپورٹ آگیا تھا اور پاؤں تلے سین کے شہر کی سڑک ٹوٹ کر رہ گئی۔

اب سامنے ایک نئی سڑک تھی جو ہواؤں سے گذر کر 'الف' کے شہر کی ایک سڑک سے جا ملتی تھی......

اور وہاں، جہاں دو سڑکیں ایک دوسری کی پسلی سے طلوع ہونے لگیں، سین نے بہت ہی آہستگی سے الف کو اپنے شانے سے لگالیا اور پھر وہ دونوں کانپ کر پاؤں تلے کی زمین کو یوں دیکھنے لگے جیسے انھیں وہ گھر یاد آگیا ہو، جو تعمیر نہیں ہو سکا تھا۔

●●





خوشونت سنگھ

وشنو کا نشان

"یہ سیاہ ناگ کے لیے ہے" گنگارام نے طشتری میں دودھ انڈیلتے ہوئے کہا" میں ہر رات اسے دیوار کے قریب واقع بل کے پاس رکھ دیتا ہوں اور صبح تک یہ باقی نہیں رہتا"

"شاید کوئی بلی لپٹر جاتی ہو" ہم کم عمروں نے رائے دی

"بلی!" گنگارام نفرت سے تلملایا" کوئی بلی اس بل کے قریب تک نہیں پھٹکتی، میں اسے دودھ دیتا ہوں، وہ اس گھر کے کسی فرد کو نہیں ڈستا۔ تم ننگے پاؤں گھومو پھرو، جہاں چاہے جاؤ اور کھیلو"

ہمیں گنگارام کی بات سے دانش مندی کی مہک نہیں آرہی تھی۔

"تم ایک کہن سال سادہ لوح برہمن ہو" میں نے کہا، "تم یہ بھی نہیں جانتے کہ سانپ دودھ نہیں پیتے؟" کم از کم ایک سانپ ایک ہی بار میں بھری طشتری تو نہیں پی سکے گا۔ ہمیں ہمارے ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ سانپ لمبے وقفوں کے بعد ہی ڈستے ہیں۔ ہم نے ایک "گیاہی" سانپ دیکھا تھا جو ایک مینڈک کو نگل رہا تھا۔ اس کا حلق ایک گومڑ سا پھول گیا تھا اور اس بلبلے کو گھلنے اور دم تک تحلیل ہونے میں کئی دن لگے تھے۔ اس قسم کے سانپ درجنوں کی تعداد میں ہمارے تجربہ گاہ میں بھرے پڑے ہیں جنھیں میتھیلیٹڈ سپرٹ کے سیال میں رکھا گیا ہے۔ کیا؟ پچھلے مہینے ہمارے ماسٹر صاحب نے سپیرے سے ایک ایسا سانپ نہیں خریدا تھا جو آگے پیچھے دونوں سمت دوڑ سکتا تھا، جس کی دم پر بھی دو آنکھوں سمیت ایک سر موجود تھا، آپ اس وقت کا ہنگامہ دیکھ کر ضرور لطف اندوز ہوتے، جب اسے بلور کے جار میں ڈالا جا رہا تھا، تجربہ گاہ کا کوئی جار اب خالی نہیں رہا تھا چناں چہ اسے رسلز نامی سانپ کے ہمراہ ہی رکھنا پڑا۔ سانپ کے دونوں سروں کو ایک چمٹے سے پکڑا گیا اور جار میں ڈال کر جلدی

سے ڈھکنا اس پر رکھ دیا گیا۔ اس نے جار کے اندر طوفان برپا کر دیا تھا اور غریب سانپ کے پرزے اڑا دیئے تھے اور جار کے اندر مچلتے بدن پٹکتا رہا تھا۔"

گنگارام نے ایک مقدس دہشت کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں

گنگارام سے بحث میں الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بھی، تمام، خوش اعتقاد ہندوؤں کی طرح برہما، وشنو اور شیو کی تثلیث میں یقین رکھتا تھا، جو خالق نگہبان اور قہار ہے۔ وہ ان تینوں میں سے وشنو کا سب سے زیادہ معتقد تھا۔ ہر صبح وہ اپنی پیشانی پر صندل گھس کر وی کا نشان بناتا اور اپنے معبود کو تعظیم پیش کرتا۔ اگرچہ وہ ذات کا برہمن تھا لیکن بالکل ان پڑھ اور ضعیف الاعتقاد تھا۔ اس کے لیے اس زندگی کا ہر روپ متبرک تھا، خواہ یہ سانپ ہو، بچھو ہو یا ہزار پا۔ جب بھی اسے ان میں سے کوئی کیڑا نظر آتا وہ اسے ہماری نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا کہ ہم اسے مار نہ سکیں۔ جن بھڑوں کو ہم اپنی بیڈمنٹن کی ریکیٹوں سے زخمی کر کے گراتے، وہ انھیں پکڑ کر ان کے پَر سہلاتا اور کئی بار ڈنک کھا بیٹھتا۔

یہ کرم جتنا زیادہ موذی ہوتا، گنگارام کی عقیدت اتنی ہی زیادہ ہوتی۔ چناں چہ وہ سانپوں کو سب سے متبرک خیال کرتا اور ان میں بھی پہلا نمبر پھن دار سیاہ ناگ کو حاصل تھا۔

"اگر ہمیں تمہارا کالا ناگ نظر آ گیا تو ہم نہیں چھوڑیں گے اسے"

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا، اس کے ایک سو انڈے ہوتے ہیں اگر تم اسے مار دو گے تو پورا گھر سانپوں سے بھر جائے گا۔ پھر کیا کرو گے تم؟"

"ہم انھیں زندہ پکڑ کر بمبئی بھجوا دیں گے۔ جہاں ان کو دوہ کر زہر کا تریاق نکالا جائے گا۔ وہ ایک زندہ سانپ کے دو روپے دیتے ہیں۔ سیدھے سیدھے دو سو روپے ہو جائیں گے۔"

تمہارے ان ڈاکٹروں کے تھن ہوتے ہوں گے مگر میں نے سانپ کا تھن نہیں دیکھا، جس سے اسے دوہا جا سکے۔ مگر تم اسے چھونے کی کوشش نہ کرنا، یہ شیش ناگ ہے۔ اس کے سر پر اتنا بڑا تاج ہے، میں نے دیکھا ہے، اس کی لمبائی تین ہاتھ ہے اور اس کا تاج"—

گنگارام نے اپنے ہاتھ کو بالشت بھر پھیلایا اور کہا "اس کی چوڑائی کے برابر، تم اسے لان میں دھوپ سینکتے ہوئے دیکھنا کبھی۔"

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم کتنے جھوٹے ہو، پھن دار سانپ نر ہوتا ہے اور وہ ایک سو انڈے کبھی نہیں دے سکتا، انڈے خود تم نے دیئے ہوں گے۔"

پورا جھرمٹ ہنسی کے سرگم میں بھیگ گیا۔

"یہ گنگارام کے انڈے ہوں گے، اور اب ان میں سے جلد ہی ایک سو گنگارام نکلیں گے۔"

گنگارام خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ملازمین کے اس طبقے میں سے تھا جو خفیف ہونا جانتے ہیں، لیکن گھر کے بچوں کے ہاتھوں اپنی بھد اڑوانا گنگارام کے حق میں بڑی زیادتی تھی۔ بچے اسے مسلسل نئے نئے ڈھنگ سے ستاتے اور اس کا مضحکہ اڑاتے رہتے۔ وہ کبھی اپنے شاستر نہیں پڑھتے اور نہ ہی عدم تشدد کے بارے میں وہ مہاتما جی کے فرمودات کا احترام روا رکھتے ہیں۔ وہ اپنی شاٹ گنوں سے پرندوں کا نشانہ بناتے رہتے اور میتھلیٹڈ سپرٹ میں سانپوں کو غوطے دیتے رہتے۔ گنگارام زندگی کے تقدس کے ضمن میں اپنے اعتقاد پر قائم رہتا۔ وہ سانپوں کو دودھ پلاتا، ان کی حفاظت کرتا کیوں کہ سانپ زمین پر خدا کی مخلوق میں سب سے ادنیٰ ترین ذی روح ہیں۔ اگر آپ ان کو قتل کرنے کے بجائے ان سے محبت کرتے ہیں تو راستی پر ہیں اور برحق ہیں۔

مگر یہ راستی اور حق کیا ہے، گنگارام کبھی اس کی وضاحت نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا ہی ثابت کر سکا تھا کہ اگر دودھ کی بھری طشتری بھر کر بل کے پاس رات کو رکھو تو صبح کو صاف ہو جاتی ہے۔

ایک دن ہم نے سیاہ ناگ دیکھ لیا۔ مون سون اپنی پوری تندی سے چل رہی تھی اور رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ زمین جو حدتِ گرما سے سوکھ کر تڑخ گئی تھی اب زندگی کی لے میں گنگنانے لگی تھی۔ کیچڑ بھرے میدان میں رینگنے والے کیڑوں نے کلبلاہٹ برپا کر دی تھی اور کیچوے، بیر بہوٹیاں اور کنکھجورے نظر آنے لگے تھے۔ ہریالی نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور کیلوں کے پتوں پر چمک اور بلو بس زمردیت کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ بارش نے سیاہ ناگ کے بل میں سیلاب کی یورش کر دی تھی۔ وہ لان میں ایک کھلے قطعہ پر بیٹھا تھا اور اس کا چمکدار سیاہ پھن دھوپ میں شعاعیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ بہت بڑا تھا۔ تقریباً چھ فٹ لمبا، گول مٹول اور پر گوشت میری کلائی جیسا۔

"یہ تو سانپوں کا شہنشاہ لگتا ہے، آؤ اسے پکڑیں"

کالے ناگ کے پاس پہنچنے کا کوئی موقع نہیں تھا، زمین پر پھسلن تھی اور تمام بل اور گڑھے پانی سے بھرے تھے اور گنگارام اس کی مدد کے لیے گھر پر موجود نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ خطرے کو بھانپ سکتا ہم نے بانس کی لمبی لاٹھیوں سے مسلح ہو کر

اس کا محاصرہ کرلیا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اس کی آنکھیں لال بھبھول ہوگئیں وہ پھنکارا اور چاروں طرف سر پٹکنے لگا اور پھر بجلی کی چمک کی طرح کیلوں کے جھنڈ کی طرف لپکا۔

زمین پر کیچڑ ہی کیچڑ تھی اور وہ پھسلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ مشکل سے پانچ گز گیا ہوگا کہ ایک لاٹھی اس کی پشت پر پڑی اور وہ وسط میں سے ٹوٹ گیا ضربات کے تسلسل نے اس کو سیاہ اور سفید لجلجے مادے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جو خون اور کیچڑ میں لت پت تھا لیکن، اس کا سر ابھی تک سلامت تھا۔

"اس کے پھن کو مت خراب کرنا"، ہم میں سے ایک نے کہا: "ہم سیاہ ناگ کو سکول لے جائیں گے"

چناں چہ ہم نے ایک بانس کی انی سانپ کے نیچے دی اور اسے اوپر اٹھا لیا اور لاکر بسکٹوں کے خالی ڈبے میں ڈالا اور ڈھکنا بند کر دیا۔ یہ ڈبہ ایک پلنگ کے نیچے چھپا دیا گیا۔

رات کے وقت میں گنگارام کی دودھ کی طشتری اٹھانے کے لیے اس کے گرد منڈلاتا رہا۔

"کیا تم سیاہ ناگ کے لیے دودھ نہیں رکھ رہے ہو آج"

"ہاں" گنگارام نے زچ ہو کر کہا۔ "آپ جا کر سو جایئے"۔

وہ اس موضوع پر مزید کوئی استدلال نہیں چاہتا تھا۔

"اب اس کو دودھ کی ضرورت نہیں رہی"۔

گنگارام نے توقف کیا

"کیوں؟"

"اوہ، کچھ نہیں، یہاں آس پاس مینڈک بہت ہیں۔ وہ تمہارے دودھ سے زیادہ مزیدار ہیں، تم تو اپنے دودھ میں کبھی چینی ہی نہیں ڈالتے"،

اگلی صبح گنگارام دودھ کی طشتری بھری ہوئی واپس لایا تھا۔ وہ شدید کشمکش و پیچ میں پڑا ہوا تھا۔

"میں نے بتایا تھا کہ تمہارا سانپ دودھ سے زیادہ مینڈک پسند کرتا ہے"۔

جب ہم کپڑے بدل رہے تھے اور ناشتہ کر رہے تھے تو گنگارام ہمارے ارد گرد منڈلا رہا تھا سکول بس آئی تو ہم ڈبہ لے کر اس میں سوار ہو گئے۔ جب بس روانہ ہوئی تو ہم نے ڈبہ گنگارام کی طرف لہرایا۔

یہ رہا تمہارا کالا ناگ - اس ڈبے میں محفوظ ہے، ہم اسے سپرٹ میں ڈالیں گے۔"
ہم اسے ششدر اور ساکت چھوڑ آئے تھے اور بس چل پڑی تھی۔

اسکول میں بڑا ہنگامہ رہا۔ ہم چار بھائی تھے جو اپنی بہادری کی وجہ سے بہت مشہور تھے اور ایک بار پھر ہم نے اپنی ہمت اور جرأت کا پرچم نصب کر دیا تھا۔

"ایک شیش ناگ"

"چھ فٹ لمبا"

"پھن دار"

یہ ڈبہ سائنس کے معلم کو دے دیا گیا جو ان کی میز پر رکھا تھا۔ ہم منتظر تھے کہ وہ اس ڈبے کو کھولیں اور پھر ہماری جرأت کی داد دیں۔ ماسٹر صاحب بظاہر غیر جانبدار نظر آتے تھے۔ انھوں نے ہمیں حل کرنے کے لیے چند سوالات دے دیئے۔ انھوں نے بڑی واقفیت کے ساتھ اپنا جراحی کا چمٹا نکالا اور ایک جار جس میں گدے میتھیلیٹیڈ سپرٹ میں لپٹی ہوئی پٹیاں رکھی تھیں۔ وہ گنگناتے اور بکس کے گرد لپٹی رسی کھول رہے تھے۔

جوں ہی رسی ڈھیلی ہوئی، تو ڈھکنا ہوا میں پرواز کر گیا۔ خیر گزری کہ ماسٹر صاحب کی ناک بچ گئی۔ اندر ایک کالا ناگ تھا جس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور جس کا پھن پھیلا ہوا اور برقرار تھا۔ ایک تیز پھنکار کے ساتھ وہ ماسٹر صاحب کی طرف لپکا۔ ماسٹر صاحب پیچھے کی طرف کھسکے اور کرسی سمیت الٹ گئے۔ وہ فرش پر چیت پڑے سانپ کو دہشت سے دیکھ رہے تھے، لڑکے اپنے ڈیسکوں پر کھڑے ہو گئے اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگے۔

سیاہ ناگ نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کی زبان بڑی سرعت سے متحرک تھی۔ اس نے غصے میں آگ برسائی اور پھر رہائی کے لیے کوشش کی، وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹن سے اچھل کر فرش پر آ گرا۔ اس کی کمر جگہ جگہ سے زخمی تھی اور وہ بڑے درد بھرے انداز میں دروازے کی طرف گھسٹ رہا تھا۔ جب وہ دہلیز پر پہنچا تو ایک بار پھر اپنا پھن پھیلا کر کسی دوسرے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے مستعد نظر آیا۔

کلاس روم کے باہر گنگارام کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں دودھ کا جگ اور طشتری تھی۔ جوں ہی اس نے کالے ناگ کو دیکھا، آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس نے طشتری میں دودھ ڈالا اور چوکھٹ کے قریب رکھ دیا۔ اس نے پوجا کے لیے ہاتھ جوڑ کر سر زمین پر ٹکایا اور معافی مانگنے لگا۔ حد درجہ

غیض میں بھرے سانپ نے پھنکاریں ماریں، آگ برسائی اور گنگارام کے سر پر کئی بار کاٹا، اور پھر بڑی مشکل کے ساتھ خود کو گھسیٹتا ایک گڑھے میں اوجھل ہو گیا۔

گنگارام اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے ڈھیر ہو گیا۔ زہر نے اس کو اندھا کر دیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ نیلا اور زرد پڑ گیا تھا اور منہ سے جھاگ چھوڑنے لگا۔ اس کی پیشانی پر خون کے قطرے نمودار ہوئے جسے ماسٹر صاحب نے اپنے رومال سے پونچھ دیا۔ اس کے نیچے وی کا نشان تھا، جسے ناگ کے دانتوں نے ثبت کیا تھا۔



ساھتیہ اکادمی (قومی مجلس برائے علم و ادب)

اشاعتی سرگرمیاں۔ ا۔بشمول انگریزی' ۲۲ زبانوں میں مختلف اصنافِ ادب پر اشاعتِ کتب۔
۲۔ کسی ہندوستانی زبان کے کلاسیکی ادب کے تراجم دیگر ہندوستانی نیز غیر ملکی ادب کے تراجم ہندوستانی زبانوں میں۔ ۳۔ ہندوستانی مشاہیر ادب کی کتابیات، مختصر سوانح نیز لغات جیسی حوالجاتی کتب ۴۔ ہندوستانی زبانوں کی ادبیات کی تواریخ۔ ۵۔ قدیم اور عصری ہندوستانی ادب کے معماروں کی سوانح۔ ۶۔ ہندوستانی شاعری، افسانہ، مقالہ، یک بابی ڈرامہ، عوامی قصوں نیز گیتوں کی بیاضیں۔ ۷۔ چیدہ چیدہ ادبی دستاویزات کی خصوصی اشاعت، مثلاً سنسکرت کی کلاسیکی دستاویزات کے تنقیدی جائزے، مولانا آزاد کی اردو تصانیف کے ذخائر وغیرہ وغیرہ۔

۸۔ رسائل :۔ انگریزی (انڈین لٹریچر)، سنسکرت (سمسکرتا پرتیبھا) اور ہندی (سمکالین بھارتیہ ساہتیہ) میں

دیگر پروگرام اور منصوبے :۔

۱۔ سیمناروں، رائٹرز ورکشاپوں، ادبی اجتماعوں نیز نمائش ہائے کتب کا انعقاد

۲۔ مصنفین کو ان کے نمایاں ادبی شہ پاروں پر انعامات و اعزازات

۳۔ ملک کے ممتاز ادبا، علما اور شعرا کی اکادمی کی فیلو شپ کی تفویض کی شکل میں عزت افزائی۔

۴۔ مصنفین کو سیر و سیاحت کے اخراجات کے عطیات۔

۵۔ ہندوستانی ادب کی قاموس نگاری۔

محولہ بالا پروگراموں کے ضمن میں بالتفصیل معلومات حاصل کرنے کے لیے۔

پتہ :۔ ساہتیہ اکادمی، رابندرا بھون، ۳۵ فیروزشاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ سے رجوع فرمائیں۔

شاخیں : مدراس ۱۸، کلکتہ ۲۹ اور بمبئی ۱۴

SAHITYA AKADEMI
RABINDRA BHAVAN
35, FEROZESHAH ROAD
NEW DELHI-110001

چترا مُدگل



بات کچھ اور بڑھے گی آگے

گیٹ سے منسلک چوبی سائبان کے اندر زنگ خوردہ کرسی سے لاٹھی ٹکائے، خاکی وردی میں اونگھتے تاوڑے چوکیدار کو دشنام بھرے شور نے اچانک ہڑبڑا دیا۔ کان پڑی آواز پر یقین کرنے کے لیے اُس نے اپنے اونگھتے جسم کو بالارادہ سمیٹا اور نیند سے بوجھل پلکوں کو پٹپٹایا اور شور کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اونگھ ابھی اس کی رانوں اور جوتوں میں قید پنجوں میں دبکی ہوئی تھی۔

شور واضح ہو گیا۔ گالیوں کے کچھ چھینٹے ہوا کا رُخ چوبی سائبان کی سمت ہونے کے باعث اس طرح آ گرے۔ ساتھ ہی تال دیتی ہوئی تیکھی سی تھپیڑوں کی آواز کسی ٹین کو پیٹنے کا سا احساس پیدا کر رہی تھی۔ دماغ ایک سنسناہٹ کے ساتھ چونک گیا۔ کرسی پیچھے کھینچ کر وہ پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور پھر آپ ہی آپ بُدبُدایا۔ "اپناج کالونی میں .... باپ رے،،، سستی کو جھٹک کر وہ سائبان سے باہر نکلا۔ ناگہاں خیال آیا کہ ذرا وقت معلوم کرے۔ بائیں کلائی پر بندھی دھندلے ڈائل والی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ ڈیڑھ بجنے کو تھا۔ "اتنی رات گئے یہ شور؟"

حواس کو مجتمع کر کے اس نے شور کی سمت معلوم کرنے کی کوشش کی اسے تین نمبر کی عمارت کے تہ خانے سے یہ شور آتا محسوس ہوا۔ گیٹ سے اس عمارت کا پیدل فاصلہ بمشکل تین چار منٹ کا تھا۔ وہ ایک دم سرپٹ بھاگا۔ شور

نیچے والے گھروں میں بھی پہنچ چکا تھا۔ کچھ فلیٹوں میں لوگ جاگ چکے تھے۔ کئی بالکنیوں کی روشنیاں اس کے دوڑتے ہی دوڑتے جل اٹھیں۔ کچھ سوالات اس کی سمت بڑھے، "گورکھا! کیا ہوا،،،؟ کون گالیاں بک رہا ہے؟..... .....کیا ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے؟"

اس نے رک کر کسی کو جواب نہیں دیا لیکن جیسے ہی تیسرے نمبر کی عمارت کے تہ خانے میں داخل ہوا، منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

وہ موٹیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک لمبا سریا تھا، جس سے وہ سکینہ صاحب کی سفید ٹویوٹا پر ہاتھ چلا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ گالیاں، بے تکی اور ننگی۔ پہلے سے ہی سہمے کھڑے چار پانچ لوگوں کی موجودگی سے عاری موٹیا کی نظریں جونہی اس پر پڑیں تو اس نے پلٹ کر سریا اس پر تان دیا۔

"آگے نئیں بڑھنا ہو،، کھوپڑی تکڑے تکڑے کر کے چھوڑ دوں گا،،، بوہت اچھا گھر میں نوکری لگا ہے نا،،،! سالا حرام خور، بول؛ بول اُس کو ابھی نیچو اُتر کے آنے کوُ؟ کر۔ ے کا اولاد ہوؤں اگر، مادر،،، کو خلاص نہیں کیا،،، دھکا دے کے نکال نا میرے کوُ دروازے سے؛ کائے کو؟ پورا پیسہ مانگا نا اسی واسطے؛،،، کاٹ، بولنا۔ ابھی اچھا طریقے سے کھاڑا کلٹ دیکھتا،،،میں،،،، برو بر دیکھتا،،، بوہت دھاندلین کیا،،، ابھی سِدھا ہوئیں گا وہ،،، پھیر،،،"

وہ جھک کر گھوما اور پوری طاقت سے لپک کر سریا کار کی ونڈ سکرین پر دے مارا۔ چھن کا شور اٹھا، ریزے کرکرا کر دور دور تک بکھر گئے۔ وہاں کھڑی گاڑیوں کے سہارے کھڑے لوگ خوفزدہ ہو کر آڑ میں دبک گئے۔

وہ اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر چیخا، "موٹیا!" اُس کے دانت تناؤ سے بھنچ گئے، جن کے سوراخوں سے گذرتی آواز نے موٹیا کو خبردار کیا، "سریا پھینک دے، میں بولتا، سریا پھینک دے، نئیں تو سکینہ صاب تیرا تکڑا تکڑا کر کے چھوڑے گا، جیا ستی مغز مت پھرا۔" "چپ بے پیچ!" موٹیا نے ہونٹوں پر تیرتے لعاب کو تیچ سے پہلو میں کھڑی گاڑی پر تھوکا، پھر گردن کو جھٹکا

کر آنکھوں پر اُمڈ آئے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی، "میں دھونس نہیں کھانے کا،،، کھاڑا کاٹانا وہ میرا؛ بوہت چمکایا، اس سالی کے پترے کو، ابھی دیکھ حال! بولی تیرے سیٹھ کو نیچو اُترکر آنے کو، ڈر کے مارے اَجُن تلک اُپرچ بیٹھا ہے۔ آنے تو دے نیچو، کھوپڑی نہیں توڑا اُس کا کوئی پن آگے آیا، اس کو پن دیکھے گا، وہ جاڑیا میم صاب پن آئے گی تو میں اس کو بھی نہیں سوڑے گا، نئیں سوڑے گا، صاب کا سامنے کیسی بھیگی بلّی سرخی بیٹھی ہوتی، بولنے کی نئیں سکتی تھی کیا تاپ میں ہوتا میں، پتہ تھا نا اس کو۔" موٹیا گاڑی کے ایک ایک حصے پر ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ جیسے ہی موٹیا کو دبوچنے کی غرض سے آگے بڑھتا نہ جانے کس طرح موٹیا کو اس کا اندازہ ہو جاتا اور وہ پلٹ کر اس کے سامنے سریا تان دیتا۔ وہ سرے پاؤں تک سوائے کپکپانے کے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کتنے نوکر کام کرتے ہیں اس سوسائٹی میں، روز نکالے جاتے ہیں، روز رکھے جاتے ہیں، اکثر یہاں کام کرنے والے لوگوں سے ہی نئے ملازم ڈھونڈ کر لانے کے لئے کہا جاتا ہے، اس سے بھی کہا جاتا ہے۔ نہ جانے کتنی ہی خواتین اور لڑکوں کو اُس نے ملازمت دلوائی ہے لیکن ایسا معاندانہ وطیرہ!

پچھلے چار سالوں سے تو وہ خود یہاں چوکیداری کر رہا ہے۔ اُس نے نہیں دیکھا ایسا منہ زور اور بدتمیز لڑکا۔ اُس پر یا تو کسی جن کا سایہ ہے یا اس نے صاحب لوگوں کا غصّہ نہیں دیکھا۔ گاڑی کی حالت دیکھ کر سکینہ صاحب کسی یادے بیل کی طرح بلبلا اُٹھیں گے۔ ناہنجار!" وہ موٹیا کے خوف ناک انجام کی بابت سوچ کر سوکھے پتے کی طرح لرز اُٹھا۔ لگا جیسے اُس کے دُبلے پتلے بدن پر یکایک جنون طاری ہو گیا ہو، کیسے روکے اسے؟

موٹیا کے بوڑھے نانا کا پچی آنکھوں والا جھریوں بھرا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے کوند گیا۔ بوڑھا کفش ساز ہے۔ پیری کراس روڈ کے فٹ پاتھ پر

ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے شکستہ چھتری تانے ، بھاری پتھر کے سہارے اٹکا کر ٹاٹ کے مٹیالے ٹکڑے پر چمڑے کی کترنوں کا ڈھیر سامنے پھیلائے ، زنگ لگے ڈبے میں کیل کانٹے بھرے ، وہ راہ گیروں کی چپلیں اور جوتے مرمت کرتا رہتا ہے ۔ اُس دن اس کی ایک برس پرانی کولہاپوری چپل کا انگوٹھا اکھڑ گیا تھا ، اور اُس کی نگاہ اس بوڑھے موچی یعنی موٹیا کے نانا پر پڑی تھی ، وہ پاؤں گھسیٹتا گھسیٹتا اسی کے پاس چپل بنوانے پہنچ گیا ۔ بوڑھے نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا ، سلائی ماروں کہ کیل جڑ دوں ۔

"سلائی مارنا ." اُس نے مضبوطی کے خیال سے اسے ہدایت دی تھی ۔ بوڑھے نے ڈورا کھینچتے ہوئے کہا تھا ، "ملٹری میں کام کرتے ہو ؟"

'واچ مین ہوں' اُس نے بڑے افتخار سے اپنی وردی کو اپنی نظر سے چھوا ، سراہا اور بغیر بوڑھے کے کچھ پوچھے ہی اپنے بارے میں بتانے لگا تھا کہ وہ پچیس پچیس منزلہ عمارتوں کی کالونی میں واچ مین ہے ، بوڑھا اُس کی باتو سے متاثر تھا ۔ اس کا اندازہ اُسے اس بات سے ہوا کہ بوڑھے نے انگوٹھے کی مضبوط سلائی کے بعد اُس چپل کی ساری تنیوں کو پوری طاقت سے کھینچ کھینچ کر اُن کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور بغیر اُس کی اجازت کے ان تینوں پر بھی ٹانکے لگا دیئے جو اسے کچھ کمزور لگیں ۔

"کتنا کما لیتے ہو دن میں ؟" اس نے لہجے میں امارت کا رنگ بھر کر بوڑھے سے پوچھا ۔

"کمائی کدھر ؟" بوڑھے نے یاس بھرے لہجے میں اپنی مچمچی آنکھیں اس کی طرف پل بھر کے لئے اٹھائیں اور جوابی سوال داغ دیا ۔

"بہت مشکل سے دو دن دھائی روپیہ کلا کانٹا کا خرچا نکال کے ملتا ہے ۔ ایریا چ ایسا ہے ۔ صاب لوگ چپل جوتے کدھر بنواتے ہیں ، ڈائرکٹ نیا خریدتے ہیں ۔ طاقت ہوتی تبھی میں فیری لگاتا ۔ جونا پرانا چپل جوتا خرید کر میں اس کا مرمت ورمت کر کے سیشن روڈ کا فٹ پاتھ پر بیچ لیتا ہوتا ۔ کمائی تو تبھی ہوتی ۔ ابھی تو کھانے کا بھی نہیں پڑتا ۔" بوڑھے نے ٹھنڈا

سانس بھر کر اپنے پھپھولے پھوڑے، چپل اس کی طرف بڑھائی اور پھر بولنے لگا، "جیاستی چلنے پھرنے کو نہیں سکتا نا۔ اسی کے واسطے اِدھر جِ بیٹھتا۔ یہ بوہت پوش ایریا ہے نا۔ اِیدر کا لوگ پیدل کم، گاڑی باڑی میں جیاستی چلتا ہے۔ گراہک کیدر سے ملیں گے۔

بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ گذارہ ہوتا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ گھر پر میری بیٹی کا لڑکا ہے۔ پندرہ کا ہو رہا ہے وہ اور کام دام کچھ کرتا نہیں۔ لڑکی تھی، اُس کی ماں۔ اُس کے ہوتے ہی اُس کے باپ نے اسے چھوڑ کر دوسری شادی رچالی۔ جوان لڑکی کب تک سر پر بٹھائے رکھتا۔ ایک مطلقہ لڑکے کے ساتھ اسے گھر بٹھا دیا۔ مطلقہ بس لڑکا رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ سو اسے اپنے پاس ہی رکھنا پڑا۔ نام ہے موٹیا۔ اُس نے بڑی کوشش سے اسے میونسپلٹی کے سکول میں چھٹی جماعت تک پڑھایا۔ آگے وہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ سکول سے بھاگ بھاگ جاتا۔ ایک آدھ گھر میں برتن مانجھنے کے کام پر رکھوایا مگر وہ ہر بار کام چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے عورتوں والے کام وہ نہیں کرے گا۔ کفش دوزی بھی وہ کرنا نہیں چاہتا۔ اسے یہ دنیا کا سب سے گھٹیا کام لگتا ہے، بوڑھے نے بڑی کوشش کی کہ کباڑ کا دھندا کرکے اور ڈبے اور بوتلیں خریدنے اور بیچنے میں ہی لگ جائے لیکن وہ بھی ایک آدھ دن بھٹک کر چھوڑ بیٹھا۔ یہ کہہ کر کہ ڈبے بوتلوں کا کام بہت مندا ہے۔ لوگ ڈبے بوتل والے کو بیئر وسکی کی بوتلیں نہیں بیچتے۔ چار پانچ مہینے کا ذخیرہ جمع کرکے سیدھا دکان پر لے جا کر بیچتے ہیں۔ اُدھر زیادہ منافع ملتا ہے۔ دس پیسہ بھی کس لئے چھوڑیں؛ پٹرول مانگتا ہے تو پھونکنے دونا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس چھوکرے کے نصیب میں کیا ہے۔" بوڑھے نے اس سے پیسے لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ اس کے پاؤں میں چپل پہنواتے ہوئے وہ گڑگڑا کر بولا تھا۔

"اس کو کدھر کام کو لگاؤں نا" اور بوڑھے کی التجا کے ساتھ اسے ایکاایک سکینہ صاحب کی فرمائش یاد آگئی تھی۔ جیسے وہ گیٹ سے نکلتے وقت اس کا سلیوٹ قبول کرتے ہوئے پچھلے پانچ چھ روز سے دوہرا رہے تھے کہ انھیں ایک گاڑی دھونے والے لڑکے کی سخت ضرورت ہے، جو وقت کا پابند ہو یعنی ان کے نکلنے کے وقت سے پہلے ہی دونوں گاڑیاں دھلی دھلائی ملیں جس میں سے سفید ٹویوٹا ان کی ہے اور اس کا استعمال وہ روز کرتے ہیں۔ پریمیئر پدمنی کو انھوں نے اپنی میم صاحب کے استعمال کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس میں وہ سفر تو تبھی کرتے ہیں جب ٹویوٹا گیراج میں ہوتی ہے۔

گاڑی دھونے والوں کی ویسے تو کالونی میں کمی نہیں ہے لیکن صبح ہر ایک کو اپنی گاڑی دھلی ہوئی چاہئے اور یہ کام زیادہ تر اسی طرح کے لڑکے اور عورتیں کرتی ہیں۔ ایک ساتھ کئی کئی گھروں کی گاڑیاں دھونے کا کام پکڑ لینے کی وجہ سے اکثر گاڑیاں وقت پر نہیں دھل پاتیں۔ پچھلے لڑکے کو سکینہ صاحب نے کام پر سے نکالا اسی وجہ سے تھا کہ ان کے نکلنے کا ہو جاتا اور لڑکا بالٹی اور پونچھا لئے گاڑی پونچھ رہا ہوتا۔ بغیر دھلی گاڑی میں وہ سفر نہیں کر پاتے۔ گاڑی کے معاملے میں وہ بڑے مشوش تھے۔ بغیر دھلی گاڑی میں جس دن بھی فیکٹری پہنچے کوئی نہ کوئی تنازعہ وہاں موجود پایا۔

اس نے بوڑھے سے کہہ دیا تھا کہ کل صبح ٹھیک نو بجے وہ اسے موٹیا کے ساتھ اسی جگہ انتظار کرتا ملے۔ بوڑھے نے بہت سی دعاؤں سے لاد دیا تھا۔

موٹیا سے مل کر سکینہ صاحب کافی خوش ہوئے۔ تاوڑے اور موٹیا دونوں کو ہی انھوں نے اطمینان دلایا تھا کہ عام طور پر کار دھونے کے لئے جتنی اجرت دوسروں کو ملتی ہے وہ اس سے بیس روپے موٹیا کو زیادہ دیں گے لیکن اس شرط پر کہ دوسروں کا کام وہ چوری چھپے نہیں کرے گا ہاں گیارہ بجے کے بعد وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ساتھ انھوں نے یہ لالچ بھی

دیا تھا کہ موٹیا اگر ان کے یہاں ایمانداری سے کام کرتا رہا اور جمارہا تو وہ اسے سال ڈیڑھ سال بعد، بہرصورت اپنی فیکٹری میں رکھوادیں گے۔ تب اُسے اڑھائی سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگے گی۔ موٹیا بھی اس مردوں والے کام سے خوش تھا۔ بوڑھا اس کے احسان کی تشہیر کرتا نہ تھکتا اور جب بھی تاوڑے اس سے اپنی گھسی چپل یا ٹوٹے پھوٹے جوتے کی مرمت کے لیے پہنچتا تو لاکھ منت کرنے کے باوجود بھی وہ اس سے اجرت کے طور پر کچھ بھی نہ لینے کی ضد پر اڑا رہتا۔

"تم میرا چھوکرا سرکھا ہے...... بوہت بوہت اُپکار کیا اپنے پر...... موٹیا کام سے بوہت خوش ہے۔"

وہ صاف دیکھتا کہ بوڑھے کی میلی چکٹ دھوتی کا ایک پلو نادانستہ اس کی کیچڑی آنکھوں کی نمی پونچھنے لگتا۔ اس کا جی بھی بھر آتا۔

اُس دن اُس کی دن کی ڈیوٹی تھی۔ بارہ ساڑھے بارہ کا سمے تھا کہ اچانک اس کی نظر گیٹ سے باہر نکلتے موٹیا پر پڑی تھی۔ اس نے سائبان کے اندر سے ہی آواز لگائی تھی،،،

"کہاں لپکا جارہا ہے، ہاں، دِکھتا نہیں ہے آج کل۔" وہ پلٹا اور اُس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"اِدھر چ، بوڑھا بابا کیسا ہے؟"

"مست"

"تو؟"

"میں پن مست"

وہ مڑکر چلنے لگا تو لگا کہ اُسے کہیں جانے کی جلدی ہے لیکن وہ اس سے باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔ شاید اس سے وہ اُس کے صاحب اور ان کی میم صاحب کی باہمی رنجش کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کالونی میں افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ آج کل سکینہ صاحب کسی شاعرہ کے چکر میں ہیں اور میم صاحب سے الگ ہونا چاہتے ہیں لیکن میم صاحب انھیں

طلاق دینے پر تیار نہیں ہیں۔

"چلتا میں، ذرا دعائی میں ہے "، موٹیا نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"ٹھیرنا، کاہے کو دعائی؟" اُس نے موٹیا کے کندھے سے لٹکا ایئر بیگ پکڑ کر اسے روکا۔

"یہ بیگ لے کے؟"

"میم صاحب نے آرام وائن شاپ سے ایک کریٹ چلد بیئر کا لانے کو بولا ہے۔" ڈکی چ اس میں بھر کے۔ آج کٹی پارٹی ہے۔ سارا میم صاحب لوگ آ گئیلا ہے۔ میرے کو دیر ہوئے گا نا تو بہت وانداہو گا میم صاحب بہت واندا ہوئے گا۔ "میم صاحب" کہتا ہوا وہ تیر کی طرح گیٹ سے باہر چلا گیا۔

وہ ایکا ایکی اپنے چہرے پر پھیلتی معنی خیز مسکراہٹ کو بہت دیر تک محسوس کرتا رہا۔ بڑی دیر بعد پارٹی کی مصروفیات سے نجات پا کر جب موٹیا اسے ملنے آیا تھا تو بہت مطمئن اور خوش تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ دوپہر میں وہ پورا وقت میم صاحب کے کام میں لگا رہتا ہے جیسا سگریٹ ختم ہو گئی ہے تو لا دینا۔ بیئر کے کریٹ لانا اور فوری طور پر بوتلوں کو ٹھکانے لگانا "نیلم" سے سیخ کباب یا فش رول لے آنا یا لنکنگ روڈ جا کر بیوٹی آرٹس میں میم صاحب کے کپڑے ڈال آنا یا لے آنا۔ میم صاحب دوپہر کا کھانا تو اسے کھلاتی ہی ہیں۔ ٹپ بھی خاصا تھماتی رہتی ہیں۔ پیسے وہ ایمانداری سے بابا کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ ہاں میم صاحب نے اسے ہدایت دے رکھی ہے کہ یہ سب ان کا انفرادی معاملہ ہے، کسی کو اس کا پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔

"پھر اپنے کو کیا، اپنے کو فقط اپنے کام سے مطلب؟......." موٹیا نے بڑے سیانے پن میں ڈوب کر کہا تھا اُس سے، حالاں کہ وہ اس سے وہ گھر میں چلنے والے سارے معاملے کی ایک ایک بات پہنچا دیتا تھا۔ میم صاحب کی حالت سے موٹیا اس وقت بڑا دکھی لگا تھا اُسے۔ موٹیا کی باتوں سے یہ

بھی ظاہر ہوا کہ اس کے دل میں میم صاحب کے لیے صرف احترام ہی نہیں لگاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے اور اس کے لہجے میں صاحب کے لیے ایک عجیب سی تلخی..........

اُس نے اُسے بڑی تجربہ کاری سے استادانہ گُر بتایا تھا کہ "تو ٹھیک کہتا ہے، تیرے کو کیا، ہاں فقط کام سے مطلب...... پگار سے مطلب، کسی کے لفڑے میں نہیں پڑنے کا۔ یہ بلڈنگ میں رہنے والے میاں بیوی جو ہوتے نا ایکیج ہوتے ہیں...... ان کا کوئی کام ایک دوسرے کی معلومات میں نہیں ہوتا ہے۔ فقط اتنا جی کہ وہ میاں بیوی ہیں اور ایکج گھر میں رہتے ہیں۔

آٹھ دس دن مشکل سے ہوئے ہوں گے ...... وہ گیٹ پر مستعد کھڑا ہوا تھا کہ سکینہ صاحب نے بغیر اس کے سلیوٹ پر دھیان دیئے، سخت آواز میں پوچھا تھا،

"موٹیا کہاں ہے؟" وہ کار کی کھڑکی سے جھانکتی ان کی گردن کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کام پر نہیں آیا کیا، صاحب؟"

"دو روز سے باسٹرڈ نے شکل نہیں دکھائی ہے، لگتا ہے حرامزادے کو میم صاحب سے ٹپ زیادہ ملنے لگی ہے۔ بھول ہی گیا کہ میں بغیر دُھلی گاڑی کے ساتھ باہر نہیں نکل سکتا۔ کل بھی میں نے آیا سے گاڑی دھلوائی، آج بھی۔ وہ ان کے ابلے ہوئے غیض سے کانپ گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

"چھوکرا، سدعا ہے صاحب، مزدور بیمار پڑا ہوئے گا۔ پتہ کرتا میں۔"

"پتا کرو"

اُن کا پاؤں ایکا ایکی ایکسیلیٹر پر دبا اور گاڑی ایک دم گیٹ سے باہر نکل گئی۔ وہ جی ہی جی میں جھنجلایا "عجیب ہے یہ صاحب لوگ، ایک تو نوکر کھوٹ کردو، اوپر سے اس کا اتہ پتہ بھی رکھو، کچھ ہو گیا تو سارا غصہ اسی پر۔"

موٹیا کے نہ آنے کی وجہ اُسے سراسر بوڑھے بابا کی طبیعت کی علالت لگی۔ وہ خدشات سے بھر گیا۔ ضرور بابا مرنے لگا ہوگا۔ نہیں تو موٹیا غفلت کرنے والوں میں سے نہیں ہے، کم از کم وہ آکر میم صاحب سے تو ضرور مل جاتا۔ کوئی اطلاع نہیں ہے، اس کا مطلب ہے کہ......... اور اگر بوڑھے کو سچ مچ کچھ ہوگیا تو موٹیا.....

وہ ایکا ایکی موٹیا کے اس طرح یتیم ہو جانے کے خیال سے مغموم ہوگیا۔ ماں ہے اس کی تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ دوسرے مرد سے اس کے دو بچے ہوگئے ہیں۔ بچے ہونے سے پہلے جب کبھی وہ ملنے آتی مرد سے چرا کر کچھ کپڑے لتے اور کچھ روپے بوڑھے بابا کو دے جاتی۔ موٹیا نے ایک بار اسے اپنی ماں کے بارے میں پوچھنے پر بتایا تھا کہ اس کو لگتا ہے کہ وہ جنم جنم کا بدنصیب ہے۔ بھلا مانس تو وہ بننے سے رہا، البتہ جھونپڑپٹی کا غنڈہ ضرور بن جائے گا۔ اس کے بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں ساتھ لے کر نہیں آئی...... سوچتی ہوگی کہ اس کے ساتھ کوئی گندے اطوار اپنا لیں گے۔؟"

مشکل سے اس کا گھر تلاش کر سکا تھا۔ لیکن جس بات کا ڈر تھا۔ موٹیا چار پائی سے لگا بخار میں پھنک رہا تھا۔ بابا دھندا چھوڑ کر اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر موٹیا اور بابا کے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔

"میم صاحب بوہت حیران ہوگی نا..... بابا سے میں بولا کہ تم سے خبر دیتے سے میم صاب کو پتہ پڑ جائے گا کہ میں تاپ سے ہوں....." پتہ پڑے گا تو نکیچ دیکھنے کو آتیں..... لئی پریالو ہے وہ۔ پن بابا... میرے کو سوڑ کے ہٹتا چ نئیں....."

وہ سکتے میں آگیا، میم صاحب کے لیے موٹیا کی محبت دیکھ کر بڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کی بیماری اور دوا دارو کے بارے میں بابا سے بات چیت کرتا رہا۔ ہمت ہی نہیں پڑی ہے کہ سکینہ صاحب کے چڑھے تیوروں کے بارے میں کچھ کہے اور یہ بھی کہ جس میم صاحب کی یاد میں وہ مرا جا رہا

ہے وہ ایک بار نہیں کئی کئی بار اس کے سامنے سے تیزی سے گذر جاتی ہیں کسی نے پوچھا بھی تو وہ ہیں سکینہ صاحب کیوں کہ وہ بغیر دھلی گاڑی کے گھر سے باہر نہیں نکل سکتے۔ گاڑی کے نہ دُھل پانے کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ اُسے سکینہ صاحب کے موٹیا سے کچھ زیادہ ناراض ہونے کی وجہ ایک اور بھی لگی جو ان کے غیض آلود لہجے سے صاف ظاہر تھی۔ کہ موٹیا کا میم صاب سے لگاؤ انھیں پسند نہیں ہے۔

موٹیا ابھی بچہ ہے، بڑے لوگوں کے چونچلوں سے ناواقف۔ اس عمر میں تو کئی چھوکرے پکی مٹی سے پک جاتے ہیں لیکن وہ دس گھروں کا کام چھوڑ کر اور پکڑ کر ہی یہ دنیاداری سیکھ سکے ہیں۔ موٹیا کا یہ تو بمشکل دوسرا گھر ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ ان عمارتوں میں رہنے والے کے گھر کو کبھی اپنا گھر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ موٹیا کا میم صاحب کے ساتھ یہ لگاؤ! اسے موٹیا کے نرم دل کا یہ احساس توڑنا ضروری لگا۔ صبح سکینہ صاحب سے ہوئی ملاقات کا حال اس نے جوں کا توں بیان کر دیا۔ سُن کر موٹیا پریشان ہو گیا۔

"صاحب تو ایسا ہے اپچ پن میم صاحب!"

وہ بڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے چھت کے ٹین کو تکتا رہا۔ میم صاحب نے اس کے بارے میں استفسار نہ کر کے اسے بڑا دکھ دیا تھا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ انھیں گھر کا پتہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ گھر تو کسی حالت میں اسے دیکھنے آ نہیں سکیں۔ لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ تاڈرے سے اس کے بارے میں یقیناً پوچھیں گی میم صاحب اُسے اپنی زندگی میں دیکھی ان تمام عورتوں سے الگ لگی تھی، لیکن۔

میم صاحب کی باتیں اس گھڑی اسے یاد آ گئی تھیں۔

"مجھے تو بس کہنے کو ہی گھر ملا ہے، یہ ساری موج مستی تو وقت کاٹنے کی ہے۔ صاحب کہنے کو شوہر ہیں اور میں کہلانے کو بیوی۔ کبھی کبھی جو گھر نہیں آتے نا..... اسی کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ نئی گاڑی خرید کے دی ہے اسے۔ گرین رنگ کی فیئٹ آتی ہے نا اکثر انھیں لینے۔

"کسی دن ڈرائیور کی آنکھ بچا کر میں کیلو بھر شکر پٹرول کی ٹنکی میں ڈال

دوں گا۔ بس گاڑی کی چھٹی۔"

میم صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔" تو اتنا خیال رکھتا ہے میرا۔ تجھے تو میں متبنیٰ بنا لوں گی۔"

وہ ان کے اس اپنے پَن پر خوش ہو اٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ انھیں میم صاحب کے بجائے ممی جی کہ کر پکار لیتا تھا۔ حالاں کہ میم صاحب کے بچے نہیں تھے۔ شادی کو ہی بمشکل چار پانچ سال ہوئے ہوں گے لیکن وہ اس کے ممی جی کہنے سے خوش ہی دکھائی دیتیں ورنہ وہ کبھی ان کو اس طرح پکارنے کی ہمت نہ کرتا۔

چلتے وقت دکھی لہجے میں موٹیا نے کہا تھا کہ وہ صاحب اور میم صاحب کو اس کے بستر سے لگے ہونے کی خبر کر دے اور اطلاع نہ دے سکنے کی مجبوری بھی واضح کر دے۔

اس نے دونوں کو ہی الگ الگ اطلاع بھجوا دی تھی۔ صاحب نے بے یقینی سے 'ہوں' کر دی تھی۔ میم صاحب اس کے بخار کی خبر سن کر سچ مچ دکھی ہوئی تھیں۔

"اُس سے کہنا کہ جب بالکل ٹھیک ہو جائے، تبھی کام پر آئے۔" پھر بہت آہستہ لہجے میں انھوں نے پوچھا تھا، "پیسے روپے کی ضرورت پڑے موٹیا کو تو لے جانا مجھ سے۔"

دے دینے اور لے لینے میں بڑا فرق ہے نیت کا۔ اسے کچھ دیر پہلے کی ہمدردی مگرمچھ کے آنسو لگے تھے مگر موٹیا سے کہ میم صاحب پر بے اعتمادی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پانچویں روز موٹیا حسب معمول اپنے کام پر پہنچا تو واپسی میں اُس سے ملتا ہوا گیا۔ اس نے مل کر جانے کو کہا بھی تھا کیوں کہ پچھلے دنوں اُس نے دوسرے واچ مین سے سُنا تھا کہ صاحب کو گاڑی دھونے کے لئے دوسرا

چھوکرا چاہیئے۔ اسے اندیشہ تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ موٹیا کام پر پہنچے اور سکینہ صاحب اسے کام سے برخاست کر دیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس سکینہ صاحب نے اسے تاکید کر دی کہ اگر آئندہ وہ بیمار پڑے تو نہ آسکنے کی پیشگی اطلاع بھجوا دے تاکہ وہ کوئی دوسرا انتظام کر لیں۔ موٹیا کا کام حسب معمول ہمیشہ کی طرح چل رہا تھا لیکن پہلی کو تنخواہ کے دن اچانک وہ غصے میں بھرتا ہوا اس کی کھولی پر پہنچا تھا۔

کچھ نہ کر پانے کی بے بسی غیض و غضب کی آگ میں تمتاتی اس کی آنکھوں سے بہ رہی تھی: "میری چار دن کا کھاڑا کاٹ لیا۔ فریب کر کے میں تھوڑا گھر پر مستی مارتا ہوتا۔ کھاڑا کے واسطے میں لڑائی کیا تو میرے کو تھپڑ چڑھا کے دفع ہو جانے کو بولا۔ دھکا مار کے گھر سے باہر کر دیا۔ سب سمجھتا میں۔ حرام خور نے کاہے کا واسطے ہکلا میرے کو۔ اس کا مرضی تھا۔ میں اس کا رکھیل کا گھر میں چوبیس گھنٹے کا واسطے کام کو جاؤں۔ میں نے صاف نہ پاڑی۔ فقط گاڑی کو دھوئے گا۔ کھانا پینا نئیں پکائے گا اور جبھی تھپڑ مارا۔ میم صاحب پاس منج کھڑی ہوتی..... دھکا دے کے باہر کیا..... پاس منج کھڑی ہوتی..... صاحب کا ہاتھ نہیں پکڑنے کو سکتی تھی۔ نئیں بولنے کو سکتی تھی کہ کاہے کو کھاڑا کاٹنے کا۔ کتنا کام بھوکٹ میں کرتا تھا۔"

"چھوڑنا۔ جو ہوا سو ہوا، یہ صاحب لوگوں سے جھگڑا بگڑا کر کے فائدہ نہیں۔"

"میں دیکھے گا ہلکٹ کو، دوسرا چھوکرا کیسا گاڑی دھوئے گا۔ وہ پن دیکھتا۔ ہاتھ تو لگانا..... دو..... میں.......!"

وہ انتقام کی آگ میں بھن کر دانت پیستا اور روتا رہا۔ بڑی اپنائیت سے تسلی دیتے ہوئے اس نے سمجھایا تھا..... "ایک کام چھوڑ دو ہزار ملتا ادھر کائے کو مغز خراب کرتا۔ میں ایک آدھ دن میں تیرے کو نئے کام پر لگوا دوں گا۔ ایماندار نوکر کی بہت ضرورت ہے۔ یہ صاحب لوگ سے الجھ کر فائدہ نہیں..... پھر میم صاحب کا کیا ہے تو وہ ان کا بیوپچ..... کیسا بولے گی صاحب

کے خلاف ..... انکاچ بیسہ پرستی مارتی نا..... اتناچ تکلیف ہے تو صاحب کو چھوڑ کر کاہے کو نہیں چلی جاتی۔ وہ سب سمجھ رہا تھا..... صاحب کے ظالمانہ رویہ سے موٹیا کو جتنا دکھ پہنچا تھا اس سے کہیں زیادہ ٹھیس میم صاحب کی خاموشی سے لگی تھی۔ اس کا معصوم دل کبھی کبھی میم صاحب کو ممی کہہ کر پکارنے کی چاہت سے محرومی پر اتنا دکھی تھا کہ اجرت کٹنے اور چانٹا کھانے کا ملال اسے ناقابلِ برداشت لگنے لگا۔"

میم صاحب کے رویہ پر اس نے جو تنقید کی۔ موٹیا نے اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر چلنے کو تیار ہو گیا ...... "چلتا میں۔"

اس نے تو نہیں لیکن اس کی بیوی نے موٹیا سے کچھ دیر اور رکنے کا اصرار کیا اور کچھ ضد سی بھی کی کہ وہ کھانا کھا کر جائے لیکن موٹیا تھا کہ بالکل نہیں رکا۔ اور کھویا کھویا سا وہ کھولی سے باہر نکل گیا۔

پچھلی باتوں اور واقعات کا سلسلہ ایک دم اس واردات سے جڑ گیا تھا۔ وہ چونک اٹھا تھا۔

اس کے اردگرد آوازوں کا اژدہام تھا۔ وہ آوازیں اسے للکار رہی تھیں۔ "واچ مین رکھا کس لیے ہے، ایک ادنیٰ سا چھوکرا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی گاڑی کو دنادن تباہ کیے جا رہا ہے۔" اور وہ ہے کہ اپنی ذمہ داری کو نظر انداز کر کے آرام سے سائبان تلے خراٹے لے رہا تھا ——— ارے سب ان کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ اتنی زور زور سے گاڑی پر ضربیں لگا رہا ہے۔ بھرتا بنا کر رکھ دیا..... سب کو سنائی دیا۔ اس کو کیسے نہیں سنائی دیا ڈس مس کرنے کو مانگتا سوسائٹی کو، اتنا پگار ہم گورکھا لوگوں کو کاہے کے واسطے دیتے ہیں۔ اس واسطے کہ غنڈہ لوگ باپ کا مال سمجھ کر گھس آئیں اور لوٹ لے جائیں۔"

اسے حیرانی ہوئی۔ موٹیا کے ہاتھوں میں لہراتے سریے نے، موجود لوگوں

کی حرکات کو حنوط کر دیا تھا۔ لیکن زبانیں بند نہیں ہو رہی تھیں..... کوئی نہیں تھا کہ لپک کر موتیا پر قابو پالے۔ پکڑ دھکڑ کا کام ان کا نہیں ہے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔" واچ مین کاہے کو واسطے رکھا ہے۔"

سالے سب ماں......... ! اُس نے من ہی من میں سب کی طرف ایک کراری گالی اُچھالی اور موتا کو ذرا غافل دیکھ کر اس کی پھرتی اس کی طرف پلٹے ہوئے سریے کی وجہ سے ٹھٹھک کر رہ گئی۔ وہ منہ سے موتیا کو بے اثر سی وارننگ دیتا رہا۔

تبھی اس نے سُنا کہ سکینہ صاحب ادھر نہیں تھے۔ میم صاحب اکیلی تھیں اوپر۔ میم صاحب کو اس واقعہ کی خبر دی گئی تو سکتے میں آگئیں۔ وہ اکیلی نیچے نہیں اتریں۔ انھوں نے پہلے سکینہ صاحب کو فون پر اس واردات کی اطلاع دی۔ سکینہ صاحب نے اس طرف آنے سے پہلے پولیس کو فون کیا اور میم صاحب کو دلاسا دیا کہ وہ فوراً پہنچ رہے ہیں لیکن ان کے اور پولیس کے پہنچنے اور میم صاحب کے نیچے اترنے تک تو گاڑی پچک کر ڈبہ ہوگئی تھی۔ میم صاحب پولیس اور سکینہ صاحب کے پہنچنے سے دم بھر پہلے ہی نیچے اتریں۔ لباسِ شب خوابی میں بدحواس سی۔ سرخ آنکھوں اور متورم پپوٹوں میں !

"موتیا ! وہ لگ بھگ چیخی تھیں۔"

گاڑی کی حالت اور موتیا کی خونخواری سے ان کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ اوپر بیٹھے ہوئے شاید وہ موتیا کی کارگذاری کا اندازہ لگا سکتی تھیں کہ اس حد تک...... مگر پل بھر میں ہی وہ جیسے سب کچھ بھانپ گئیں اور ہوشیار ہوگئیں اور سب کے منع کرنے کے باوجود سریا تانے ہوئے موتیا کی طرف بڑی بے خوفی سے بڑھیں۔ لوگوں کے ساتھ وہ بھی مشکوک ہوگیا۔ موتیا کا یہ غضبناک طوفان آج میم صاحب کا ماتھے پھوڑے بغیر سرد نہیں ہوگا۔ اس نے صاف طور پر اپنا سریے والا ہاتھ حملہ کے انداز میں تولا۔ اس کا چہرا پسینہ سے شرابور۔ تھرتھرا رہا تھا بلکہ پورا وجود ہی پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ مگر

سارے لوگ یہ دیکھ کر دنگ ہو اٹھے۔ میم صاحب نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اس کے تنے ہوئے ہاتھ سے سریا لے لیا۔ موٹیا نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لٹکی ہوئی باہوں اور جھکی گردن سے پاؤں کے نیچے بکھرے ریزوں کو کھودنے لگا۔

"اتنی ہمت کہاں سے آئی رے تجھ میں۔" انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں بدبدا کر پوچھا۔ موٹیا ایکا ایک زار زار روتا گھٹنوں میں منھ دے کر بیٹھ گیا.... تم نے کھاڑا کٹوا دیا نا میم صاحب.....! میم..... اپنے سامنے چانٹا مارنے کو دیا نا، میں........."

اُسے ہتھیار پھینکتا دیکھ بھیڑ دوڑ پڑی۔



تناظر کی قیمت میں اضافہ

کاغذ، کتابت اور طباعت کے اخراجات میں اضافہ کے پیش نظر تناظر کی قیمت میں اضافہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ لہذا تناظر کے عام شمارے کی قیمت زیرِ نظر شمارے سے بجائے ۱۲ روپے کے ۱۵ روپے فی کاپی ہو گی۔ سالانہ چندہ بھی ۴۰ روپے کی بجائے اب پچاس روپے ہو گا۔

اس شمارے کی قیمت ۳۰ روپے ہے کیوں کہ یہ دو عام شماروں کو یکجا کر کے چھاپا گیا ہے۔ امید ہے ہمارے قارئین حسبِ سابق ہم سے تعاون فرمائیں گے

انتظامیہ

عمیق حنفی

موسیقی میں گھرانے داری اور خیال

تاریخی تناظر میں

سنگیت میں بھی استاد کی عظمت، بھگتی مارگ اور تصوف میں مرشد کی اہمیت کے مقابلے میں کم نہیں ہے:

گرو گوند دوؤ کھڑے کاکے لاگوں پائے

بل ہاری گرو آپ کی جو گوند دیو بتائے

تصور کیجئے عہدِ وسطیٰ کے سماج اور معاشرت کا۔ مراسلتِ عامہ کے بہت ہی محدود وسیلے، وہ بھی بہت ہی سست رفتار۔ طباعت کا کوئی سوال نہیں، کتابوں کا ملنا بہت دشوار۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام بہت کم موسیقی پیشہ ذاتوں میں یوں بھی پڑھنے لکھنے کا چلن نہیں۔ سنگیت کا رشتہ گرنتھوں سے ٹوٹ کر عوام کے دل و دماغ، عوامی روایت، موروثی روایت سے جڑا ہوا۔ اس عہد میں موسیقی علم سے زیادہ ہنر اور فن بن گیا ہے۔

ان حالات میں گرو کا مقام گوند سے بڑا ہونا عین فطرت ہے۔ یوں بھی سنگیت میں مہارت حاصل کرنا گرنتھوں کے سہارے نہایت مشکل ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے سنگیت میں پوتھی کے اثرات کمزور اور ترک ایرانی اور لوک سنگیت کے اثرات طاقتور اور غالب نظر آتے ہیں۔ مورچھنا کا نظام، جاتی گان اور پربندھ گان کی دقیق اور بلیغ عبقریت اور اصول پرستی کی جگہ رنگینی، جذبے کا غلبہ، سُر اور لے کے چمتکار اور تخیل کا بول بالا نظر آتا ہے۔

ایسی فضا میں گلے، جبڑے، ہاتھ، انگلیوں کے ہنرمندانہ اور ماہرانہ استعمال اور سُر اور لے پر قادر استاد کی ضرورت پوتھی سے زیادہ تھی۔ عہدِ وسطیٰ کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ یہ بات کہ اپنے ہنر اور علم کو عام نہ کیا جائے۔ اور روایت اور مہارت کو سینہ بہ سینہ جاری رکھا جائے۔ اپنے کنبے والوں اور اہل اور قابل شاگردوں کو بھی تیار کیا جائے۔ خون کا رشتہ اور گنڈے (ناڑے یا کلاوے) کا ناطہ بھی کسی علم یا ہنر تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔ سنگیت سمراٹ استاد اللہ دیا خاں کی مراٹھی سوانح میں شری گوند راؤ ٹیمبے نے ایک موقع پر لکھا ہے:

"مہاراشٹر کے معزز، باوقار اور اولین گائک بال کرشن بوا، بھاسکر راؤ بکھلے، رام کرشن بوا جھے وغیرہ کے بارے میں ہم جتنا جانتے ہیں اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹی عمر میں اور کٹھن حالات میں گرو کی سیوا کر کے ان لوگوں نے گائن ودیا سیکھی تھی۔ شمالی ہند میں خوانندگان و سازندگان کے موروثی گھرانے پہلے سے چلے آرہے تھے۔ انھیں گھرانوں میں سے ایک میں خاں صاحب کا جنم ہونے کے باعث انھیں گائن ودیا سیکھنے کے لئے گھر چھوڑ کر کہیں بھٹکتے پھرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ باپ دادا، چاچا ماموں، سبھی پشتینی گائک جس سے چاہو جتنا لو، پھر بھی تھوڑا۔"

ہندوستانی سنگیت میں گھرانے داری کے ثواب وعذاب کی بحث اتنی بروقت نہیں رہ گئی جتنی تیس چالیس برس پہلے تھی۔ پھر بھی اس بحث پر ذرا اونچی آواز میں سوچ بچار کر لیا جائے تو کیا بُرا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے مرکزی اقتدار اور قوت کا زوال محمد شاہ رنگیلے (۴۸-۱۷۱۹) کے بعد بہت تیز ہوگیا چھوٹی موٹی اکائیاں سامنے آنے لگیں۔ ۱۸۵۸ سے برطانیہ کے تاج کے زیرِ سایہ راجہ اور نواب بھی آگئے۔ اور اب انھیں عسکری اور فوجی مسائل سے بھی فرصت مل گئی۔ ناچ گانا، شراب ساقی، اکھاڑے بازی شکار کرتب کھیل کود ان کے شوق کے مرکزی نقطے بن گئے۔ کچھ نے سچی لگن اور آدرشوں سے ان سب کی حوصلہ افزائی کی۔ اور کچھ نے کھیل، مشاغل اور تفریح سمجھ کر انھیں اپنایا۔

جے پور، جودھ پور، الور، رام پور، لکھنؤ، گوالیار، اندور، دیواس، ریوا، رائے گڈھ، بڑودہ، کولہاپور، میسور، حیدرآباد وغیرہ ریاستوں میں سنگیت کے دربار ہونے لگے۔ اور سنگیت کاروں کی بڑی آؤ بھگت ہونے لگی۔

ان ریاستوں میں آسرا پانے والے فنکاروں نے اپنی موروثی ودیا کی حفاظت میں ڈھیل نہ آنے دی۔ اسی طرح لکھنؤ کے ٹپہ خیال گھرانے سے گوالیار اور جے پور گھرانوں کا آغاز ہوا۔ اور دلّی کے بین خیال گھرانے سے پنجاب، کرانہ اور بھنڈی بازار گھرانے نکل آئے۔ کچھ اسی طرح آگرہ اور میواتی گھرانہ بن گیا۔

کسی گھرانے کے بانی مبانی اور بزرگوں کی تقلید ہی گھرانے داری ہے۔ کتاب اور پوتھی کی بنیاد تو تھی نہیں۔ اس تقلید کے کبھی کبھی بہت مضحکہ خیز انجام نکلے۔ استاد کی خوبیوں ہی کی نہیں، اس کی مجبوریوں اور عیبوں کی بھی تقلید کرنا سعادت مندی میں شمار ہوا۔ اگر ضعیفی، نقاہت یا کسی مرض کے باعث استاد کی آواز یا ادائیگی میں کوئی خرابی آگئی (دانی دوش یا ادار دوش پیدا ہوگیا) تو اس کی تقلید بھی عقیدت مند شاگردوں نے اپنے اوپر فرض قرار دے ڈالی۔

مورچھنا کی جگہ مقام (سُرمیل) نے لے لی۔ ترک، ایرانی سرگموں کا امتزاج ہندوستانی سرگم کے ساتھ، ناگزیر تھا۔ اس سے راگ راگنیاں سامنے آئیں، ہر چند کہ ان کی کوئی شکل متعین نہ ہو سکی گھرانے داری نے یہاں بھی اختلافِ رائے کا عمل جاری رکھا۔ استاد عبدالکریم خاں نے راگ میں وادی سموادی کا ذکر نہیں کیا نہ انھوں نے اصول ہی تسلیم کیا۔ ان کے لئے مکالمہ اسوار (سُرسمواد) بنیادی اہمیت رکھتا تھا بہت بڑی تعداد میں استادوں نے مرکب راگوں میں (مشر راگ) آروہ اور وہ کی کے سے متعین سنگیتوں یا چالوں کو قبول نہ کیا۔ خیال پروازِ تخیل کا نام ہے۔ راگ کی شکل بتاؤ۔ بڑھت کرو، پھر وادی سُر لگانے اور تیرو بھاؤ کرنے کا ہنر دکھاؤ اور استاد کا عیب درجہ ل جائے ..." میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر۔"

پوتھی اور اصول استاد کے فعل وعمل پر ترجیح نہیں پاسکتے۔ کتاب ضربوں، کنوں اور سُر لگانے کے مختلف درجوں کو خاک میں سکھائے گی؛ پھرت اور گمک کے انداز کیسے بتائے گی؛ ہوا میں گرہ لگانے کا فن پوتھی سے کون سیکھ سکتا ہے؛

ایک حد تک گھرانے دار استادوں کی دلیل ماننی ہی پڑے گی، لیکن اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ گرنتھوں کو ناقابلِ توجہ سمجھنے اور کتاب سے مرعوب اور خوف زدہ رہنے کا سبب کہیں لاشعور میں ذاتی کاروباری مفادات کو لاحق خطرے کا اندیشہ تو نہ تھا۔

جو بھی ہو اس کے عہد میں گھرانے داری ایک حقیقت تھی اور موسیقی کی روایات کی حفاظت اور رواج میں اس کا نہایت اہم حصہ تھا۔

آج ہمارے مفکرین کلاسیکیت کو عہدِ وسطیٰ کی ثقافتی تبدیلیوں کو تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت کا احساس نہیں ہوتا۔ استعمال اور عدم استعمال *Theory of use and disuse* کا اطلاق تاریخ پر بھی ہوتا ہے حملہ آور قومیں سیاسی اور فوجی فتوحات تو حاصل کر لیتی ہیں، لیکن مفتوحہ اقوام کے فنون اور ثقافت ان پر غالب آجاتے ہیں پچھڑے ہوئے، غیر ترقی یافتہ، مظلوم، نیچ سمجھے جانے والے لوگ مذہب تو بدل لیتے ہیں، لیکن ان کے رسم و رواج اور ان کی ریت رسم میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ان کی موروثی مسلمات عادات، طرزِ حیات، ہنر اور فن بہت کم بدلتے ہیں۔ وسط ایشیا سے بھارت میں آنے والی جاتیاں بھی اپنی اپنی علاقائی ثقافت اور معاشرت اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ ان سبھی قوموں کو اسلامی یا مسلم نام دینا یا اس تعریف کے تحت رکھنا مناسب نہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے ہمارے ہندوستانی مصنف اور مفکر انھیں گندھار، ترشک، پٹھان جیسے ناموں سے پکار کر ہم سے زیادہ حقیقت پسند ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ عربوں کی فنی معاشرت میں قول،

قلبانہ، ترانہ، نقش وگل نہیں پائے جاتے۔ یہ سبھی وسط ایشیائی اصناف ہیں، جن کو ہندیا لیا گیا ہے۔

سنگیت کے پنپنے کی جگہیں ہمیشہ سے مٹھ، مندر، دربار اور طوائفوں کے کوٹھے رہے ہیں۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں قوال گاتے تھے اور ان کا طرز بہت مقبول ہو رہا تھا۔ نئے کے لئے انسان کی کشش آفاقی ہے۔ قوالوں کی چوکیوں میں رفتہ رفتہ ہندوستانی الاصل مغنّی اور مطرب بھی شامل ہونے لگے۔ ملتان، لاہور دلّی، آگرہ وغیرہ میں اسی لین دین سے موسیقی کا ایک نیا کلچر جنم لینے لگا۔ پنجاب، سندھ، کھڑی بولی کا علاقہ، برج منڈل اودھ، بھوجپوری کا علاقہ اپنے اپنے اثرات قوالوں پر ڈالنے لگے۔ ہندوستان میں قوالی کا جو رنگ ڈھنگ ہے اس کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں پربندھ، بشن پد (विष्णु पद) اور دُھرپد (ध्रुव पद) گانے والے کلاونتوں کے مدمقابل قوال کھل کر آ گئے۔ اسی زمانے میں راجستھان، جون پور، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ وغیرہ میں خیال رائج تھا۔ یہ ایک طرح کا گیت ناٹیہ (گاکر پیش کیا جانے والا ناٹک) تھا اور غزل گانے کے طرز کا تھا۔ اسی خیال میں گیت، اداکاری اور رقص کا امتزاج ہوتا تھا۔ یہ خیال لوک سنگیت کی ایک صنف تھی۔ ظاہر ہے کہ غزل کی خانقاہی درباری اور محفلی گائکی اور قوالی کی مقبولیت نے ہندوستان کے ان علاقوں کے عوام کو بھی للچایا ہوگا، جن علاقوں میں ترک ایرانی موسیقی کا رواج ہو چکا تھا۔

جس طرح برَج اور اودھ کے بھجن گانے کا دنیاوی ٹھمری بن گیا، سندھ اور پنجاب میں کافی نے ایک کلاسیکی اور نیم کلاسیکی درجہ حاصل کر لیا۔ راجستھان کی مانڈیں اور ہماچل اور گڑھوال کی پہاڑی دُھنیں کلاسیکی موسیقی کا حصہ بن گئیں۔ اسی طرح خیال نے بھی کلاسیکی رُوپ اختیار کر لیا۔ غزل قول ترانہ اور لوک دھنوں کے ملے جلے اثرات سے مرتب ہونے والا خیال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شمالی کلاسیکی موسیقی کی سب سے محبوب صنف بن گیا۔

خیال میں لفظوں کے بجائے سُروں کی اہمیت بڑھ گئی۔ استھائی اور انترا میں صرف دو چار مصرعے رہ گئے جب کہ دھرپد میں استھائی انترا سنچاری اور آبھوگی نام کی چار تکیں ہوتی تھیں خیال میں صرف دو رہ گئیں یعنی استھائی اور انترا۔ سُروں کو خیال آفرینی اور تخیل آمیزی کے ساتھ تخلیقی انداز سے برتنے کا رواج ہو گیا بندش پر اُپج کو ترجیح دی گئی۔ ایک آزاد فضا کی تعمیر فن کار کا کام ٹھہرا۔ لَے سے اٹکھیلیاں کرنا اور گلے جبڑے کی تیاری کو ایک جمالیاتی قدر مان لیا گیا۔

خیال عربی کا لفظ ہے مگر فارسی نے متبنّیٰ کر لیا ہے۔ فارسی میں خیال سے مراد اس خیالی عکس سے لی ہے جو پانی یا آئینے میں دکھائی دے۔ سوتے یا جاگتے میں جس شکل کا تصور کیا جائے وہ بھی خیال ہے۔ بمالے کرکے

سے بنا ہوا بجوکا جسے چڑیوں کو ڈرانے کے لیے کھیت میں کھڑا کیا جائے وہ بھی خیال ہے۔ غائب کو حاضر بتانے کا فریب فن کی ساحرانہ قوت خیال ہے خیال کا تعلق فکر سے کم اور احساس سے زیادہ ہے مگر موسیقی میں خیال ایک صنف کا نام علامت کے طور پر بن گیا ہے اور اس کی لغوی معنویت کے ارتقا کی بحث اس ضمن میں بہت سود مند نہ ہوگی۔ خیال ایک متخیلہ اور جذباتی انداز ہے۔ خیال کے پیچھے رومانی رویے کارفرما ہیں۔

ٹپہ گائک میاں شوری کی روایتِ فن سے متعلق دو گائک لکھنؤ میں تھے تنکر قوال اور مکھن قوال دونوں زبردست خیالیے تھے۔ ٹپے کی بھرت اور بے چینی تو مشہور ہے تنکر قوال نے خیال کو اور زیادہ آزاد کرنے اور مقتدر بنانے کی کوشش کے بطور ایسی تالوں میں خیالوں کو ترتیب دیا، جن میں دھرپد نہیں گائے جاتے میاں سدارنگ (محمد شاہ رنگیلے کے درباری) خیال کو دھرپد رنگ سے گاتے تھے اور دھرپد کی افضلیت کو تسلیم کرتے تھے محمد کرم امام نے معدن الموسیقی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ رسول خاں قوال نے قول اور خیال گا کر دربارِ محمد شاہی میں سدارنگ کو شرمندہ کر دیا تھا۔ اودے ویر شاستری کا ایک اقتباس "راجستھانی ساہتیہ اتہاس" میں ڈاکٹر پرشوتم لال مینا ریا نے دیا ہے،

" ایسا کہا جاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا کے آس پاس ہی آگرے کے ارد گرد ایک نیا اسلوب شعر رواج پا چکا تھا۔ آگے چل کر جس کا نام خیال پڑا خیال یقیناً اردو اور فارسی کے مسالے سے تیار ہیج تھا"

آگرے میں ان خیالیوں کے کئی گروہ تھے، جن میں سبھی طرح کے لوگ تھے اور سبھی طرح کی بندشیں باندھنے والوں کے غول کبھی کبھی مقابلہ بھی کرنے لگتے تھے۔"

ٹھاکر جے دیو سنگھ نے آکاش وانی کے ایک سیمینار میں ایک تحقیقی پرچہ پڑھا تھا۔ شارنگ دیو ۱۲۱۰ء (۱۲۴۷ء) کی بیان کردہ پانچ طرح کی سنگیت کی بندشوں کو جانچ پرکھ کر خیال کی ہندوستانیت کا اُدگم ڈھونڈنے کی عالمانہ کوشش کی گئی تھی۔ یہ بندشیں تھیں شُدھا، بِھنّا، گوڑی بیسرا اور سادھارنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب خیال کی ہندوستانیت پر کسی کو شبہ نہیں ہے۔ اسے ہندوستانی ثابت کرنے کی مشقت کا جواز کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ خیال کے بانیوں میں امیر خسرو یا سلطان حسین شاہ شرقی یا نعمت خاں سدارنگ کا نام لیا جاتا ہے۔ اوپرا اوپر یہ رویّہ خواہ کتنا ہی پاک صاف نظر آئے، اس کی کھال ذرا سی کھرچیے اور تعصب، تنگ نظری اور نہایت محدود وطن پرستی جس کی روح فرقہ پرستی ہے، نظر آنے لگتی ہے۔ اپنی اس غیر ضروری کوشش میں ٹھاکر صاحب سولہویں صدی کے ولبھ آچاریہ کی "چوراسی وشنون کی وارتا" میں سے اقتباس نقل کرتے

"اور ایک سے شری ناتھ جی کے بھنڈار میں کچھ سانگری چھپیت تھی۔ سو کرشن داس گاڑ الیکیں آگرے کو آیئے سو آگرے کے بازار میں انیک ویشیا ترتیہ تھی خیال ٹپہ گاوت تھی اور پھیر تھی سب لوگ تماسو دیکھت تھے"

اس اقتباس سے ٹھاکر صاحب سولہویں صدی میں خیال کا وجود ثابت کرتے ہیں اور باباجونپور میں شرقیوں کا دور بھی تو سولہویں صدی ہی کا ہے!

فنون اور ثقافتوں کی تاریخ میں دیسی بدیسی ہم مذہب، غیر مذہب، قومی، غیر قومی جیسے نقطہ ہائے نگاہ اس طرح تنگ، محدود، محروم اور لمیٹیڈ دائرے میں کاربند نہیں رہتے جس طرح یہ خالص نواز مفکرین انھیں کاربند سمجھتے ہیں۔

خیال کے اسلوب میں آواز کی بلندی، اوپر کے سروں کے استعمال، مینڈ، مرکی، کھٹکا، کن، تحریر، زمزمہ وغیرہ سے مزین اور تیاری اور تیزی کا چلن ہندوستانی زمین پر ترک ایرانی عرفان اور حوصلہ افزائی کے باعث کیسے ہوا، یہ بحث ذرا تفصیل طلب ہے۔

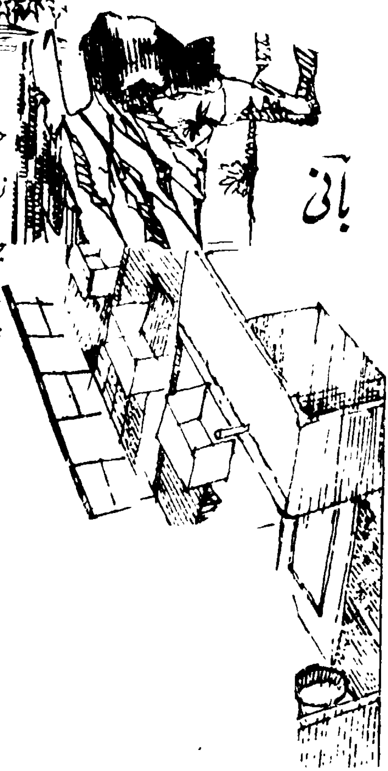
کم از کم مجھے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ خیال ہندوستانی ہے اور ہندوستان کے باہر اس کا اور کہیں رواج بھی نہیں۔



نئی غزل اور حسن نعیم

بانی





شدید ترقی پسندی کے دور میں جس طرح اختر الایمان کی نظم کو نظر انداز کیا گیا عین اسی طرح شدید جدیدیت کے دور میں حسن نعیم کی غزلوں سے چشم پوشی کی گئی، میں سمجھتا ہوں نئی غزل کا پیش آہنگ تلاش کرنا مقصود ہو تو حسن نعیم کی آواز ہر طرف بکھری ملے گی، عصر آشنائی کے تقاضے کو نئے آہنگ میں ڈھالنے کا رجحان نعیم کی غزل سے شروع ہوتا ہے۔

۱۹۵۴ء میں میں نے نعیم کی غزل پہلی بار پڑھی اور اس قدر متاثر ہوا کہ تمام اشعار میرے حافظے میں اپنی جگہ بنا گئے اس غزل کے چند اشعار بعد انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔

شامِ الم کو یاد رکھ، صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے منزلِ شب کے بعد بھی
دل میں نہ جانے کیا رہا مثلِ شرارِ جستجو
جوششِ طلب کے وقت بھی ترکِ طلب کے بعد بھی
تجھ کو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود رخصتِ شب کے بعد بھی

بہت کچھ اس غزل کا اسلوب اور ڈکشن آج کی غزل نے اختیار کیا ہے، اس کا اندازہ غزل گویانِ جدید بھی لگا سکتے ہیں۔ توانا لہجہ، معنی بنیاد اظہار اور تخلیقی ربودگی یہ وہ عناصر ہیں جن سے نئی غزل نے اپنے لب و لہجہ کی شناخت قائم کی ہے اور یہ عناصر آج سے ۲۵ برس پیشتر نعیم کی غزل میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ کسی نقاد نے ان کے شعروں کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا۔ ممکن ہے ایسا اس لیے ہوا ہو کہ ۶۰ء سے پہلے غزل کی صنف ہی کو سست ذہن نقادوں نے ناقابل اعتنا سمجھ کر پس پُشت ڈال دیا تھا۔ نظم اور تجرباتی نظم کو اعلیٰ غزل سے بہتر تخلیق سمجھنے کا رواج تھا، دوسرے درجے کے نظم نگار بھی اچھے اچھے غزل گو شعراء کو خود سے کم تر سمجھ بیٹھے تھے، غزل خوب معتوب ہوئی اور غزل کہنے والوں کے قدم ڈگمگا گئے لیکن جو شعراء اس راستے پر ثابت قدمی سے رواں رہے اور جنہوں نے اس صنف کو متاعِ جاں کی طرح عزیز رکھا اور اس کی احیا میں اپنا تمام لہو صرف کر دیا ان میں حسن نعیم کا نام آج نمایاں ترین ناموں میں ہے۔

حسن نعیم کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے چند باتوں کو ذہن نشین کر لینا از حد ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ جدید تر لہجے کی تیزی کے مقابلہ میں ان کے یہاں فکر کی سبک خرامی، اظہار کی آب دار نرم روی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ دوئم یہ کہ جدید تر نامانوس لفظیات کی بجائے ان کے ڈکشن میں شعری روایات کے گہرے ادراک کا سُراغ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنے شعری تجربے کی اساس نئی تراکیب سے کہیں زیادہ نئے احساس اور نئی فکری جہتوں پر رکھی ہے۔ مثلاً

چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا
دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم

میں ریگِ دشت نہ تھا، سنگِ صد زمانہ تھا
پتہ چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر

کہاں سے آب رواں کو موڑا، کہاں سے بادِ بہار لائے
کسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے

بُوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا
سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا

حسن نعیم کی شاعری میں عصری صداقتوں کا نہایت معنی خیز اظہار ہوا ہے، شکست خوردگی کے مقابلے میں ٹوٹتی بنتی امید کی حزنیہ لے، مسلسل تغیر پذیر تہذیبی اقدار اور بیدار باطن فرد کے مابین تصادم، سوچتے ہوئے ذہن کی متواتر تجربہ کاری اور کردار کی مثبتی ہوئی اہمیت کی بحالی کا عزم، ہر آن بدلتے ہوئے تناظر میں انسانی روابط کے مسائل کی ہزار رنگ پرچھائیاں نعیم کے بیشتر اشعار کے پس منظر میں تلاش

کی جا سکتی ہیں۔

حسن نعیم غزل کی رمز کاری کے فن سے خوب واقف ہیں، زندگی کے ہر تجربے کی تلخی و سرخوشی کو وہ ذہن کے اس گوشے میں جگہ دیتے ہیں جہاں پورے وجود کی دھند بکھری ہوئی ہے۔ جہاں شعری احساس کا نیم روشن کہرا سرسراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ شعر کہتے ہیں تو اظہار و معنیٰ کی تہہ داری اپنا جادو جگا دیتی ہے۔

مرحوم ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مصنف اردو غزل) نے نعیم کی رمز کاریٔ شعر پر تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا تھا کہ یہ خصوصیت حسن نعیم اور مومن میں مشترک ہے، میرے خیال میں قبلہ موصوف نے رمز شناسی کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے مومن کے یہاں دراصل رمز نہیں بلکہ جذبے کی playfulness کا اشاراتی اسلوب ملتا ہے۔ میرے نزدیک رمز کاری کا ہنر تفکر کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے شاعر تفکر کو فلسفہ نہ بنانے کی غرض سے جذب آمیز تجربات کے آئینے روشن کر لیتا ہے جہاں نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں اور ایک لطیف جمالیاتی حس جاگ اٹھتی ہے۔ یہی غالب کا فن تھا اور بنیادی طور سے یہی نعیم کا بھی فن ہے۔ اس اختلاف کے ساتھ کہ غالب سے پہلے اردو غزل اسی طرز اظہار سے آشنا نہ تھی؛ اور نعیم کو غالب سے استفادہ کے مواقع فراہم ہوئے اس زاویہ نگاہ سے وہ غالب سے بے حد متاثر ہیں۔

حسن نعیم نے لیکن غالب سے بچ نکلنے کا ایک خوبصورت راستہ بھی تلاش کر لیا وہ یہ کہ بلا واسطہ اظہار کے ذریعے شعری احساس کا رخ تلمیحات کی طرف موڑ دیا، یہ تلمیحاتی طرز احساس و فکر ان کی اپنی ایجاد ہے۔ اس طرح رمز اور تہہ داری پر نعیم کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ چند مثالیں شاید میری بات کو زیادہ واضح کر سکیں، 'کس کو کیا دیتا' یہاں حصہ مراہی کیا تھا، آسمانوں سے تہہ سنگ گراہی کیا تھا۔ (یہاں اللہ کے وعدۂ رزق کی طرف تلمیحی اشارہ ہے)

کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن
برگ ماضی کے سوا اس میں مراہی کیا تھا

(یہاں حسن نام سے استفادہ کیا ہے' امام حسن کے تعلق سے 'صحرائے تمنا' کی ترکیب خوبصورت ہو گئی اور 'برگ ماضی' کا لطف دوبالا ہو گیا، 'برگ' سے ہرے کا ربط یوں بھی ہے اور یہاں سبز رنگ نے تاریخ کے ایک روشن باب کی طرف

اشارہ کیا، یاد رہے کہ سبز پرچم امام حسن ہی کے اعزاز میں ہے)

قصہ ہر چند حسن کوہ کنی کا لکھا   بات شیریں سی لگی فن کے طرف داروں کو

(شیریں اور 'کوہ کن' کے باہمی ربط کو اہل نظر جانتے ہیں اتنی پرکیف صنعت تلمیح جس کا موضوع سے اتنا casual رشتہ ہو اردو غزل میں خال خال ہی ہے)

جھک کے تعظیم سے شہزادۂ امام ملا   پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی

(مہرشی اشٹاوکر جب اپنے باپ کی شکست کا بدلہ لینے راجہ جنک کے دربار جا رہے تھے، عین اسی وقت راجہ جنک کی سواری آ رہی تھی، یہ عالم وقت اپنے عہد کے سب سے بڑے بادشاہ کی دھوم دھام سے آتی ہوئی سواری کے لیے راستہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوا۔ پاپیادہ اور شہسوار یہاں مجبور اور قادر کا استعارہ بھی ہیں آخر کار راجہ جنک ہی نے راہ بدل لی اور اشٹاوکر جی کو راہ سے ہٹنے پر مجبور نہیں کیا گیا کیوں کہ اس کا خطرہ تھا کہ پنڈتوں اور عالموں میں بدنامی ہوگی۔ مزید احتیاط کے طور پر ان کی عالمانہ فوقیت 'اڈرنڈر پن' کی کہانی کو پھیلنے دیا گیا' بہ حوالہ پنڈت ظہیر)

جو نئی غزلیں شائع ہو رہی ہیں ان میں سے ایک غزل کا مطلع ہے۔

سچ ہے اب عشق کا وہ منصب اعلا بھی نہیں
شاہ شمشاد قداں، افسر بالا بھی نہیں

(فراق کی مشہور عشقیہ غزل' اور ہم بھول گئے ہوں تجھے' ایسا بھی نہیں' کے پس منظر میں اسے دیکھنا ہوگا، شاید یاد دلانے کے لیے 'سچ ہے اب' کا لہجہ بھی فراق ہی کا رکھا ہے لیکن اس مطلع میں نہ صرف فراق کے رویہ کی رد ہے بلکہ مولانا روم کے 'اے طبیب جملہ علت ہائے ما' اور حافظ کے مشہور مصرعہ 'شاہ شمشاد قداں' خسرو شیریں دہناں' کو بھی آج کے عہد میں Irrelevant دکھانے کی کوشش ہے، یہ تلمیحی انداز گفتگو' جہاں واضح اشارے نہوں' خاص نعیم سے منسوب ہے، اس موضوع پر بات ختم کرنے سے پہلے نعیم کا ایک شعر لکھنا ضروری ہے۔

بیدل کی باؤلی پہ لگائیں سبیل کیا   دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم

نعیم کے ذہنی رویہ کی امتیازی پہچان یہ ہے کہ انہوں نے ہر سیاہی میں خط روشن ڈھونڈنے کی سعی کی ہے اور فرد کے ہر جذبہ کو خوش یقینی کے سیاق وسباق میں دیکھنے کا حوصلہ کیا ہے۔ ذات اور عصر کے باہمی اعتماد کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے نئی ہوش مندی کو فروغ دینے کی جرأت کی ہے۔ عصر کی ہولناکی اور پارہ پارہ

کردینے والی وقت کی سفاکیت کے مقابل فرد کو اپنی تخلیقی قوتوں کا احساس دلایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نعیم ایسے وسیع سفر، تاریخ شناس اور تازہ شعور شاعر ہی کا کام تھا کہ اردو غزل کے متاع فکر و اظہار میں اضافہ ہوا۔

جس غزل کا یہ مقطع ہے اس میں علامہ جمیل مظہری سے کچھ "چھیڑ چھاڑ" ہے۔ علامہ خود عالی نسب اور امام حسین کے شیدائی، یہاں نعیم نے 'سید' لکھ کر عجیب لطفِ سخن پیدا کیا ہے اور دانشوروں کے قحط میں جو پہلو نکلتے ہیں ان کی تصدیق بیدل عظیم آبادی کے ذکر سے بھی ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ بیدل کی روایات کے اب نعیم ہی وارث ہیں وہ سبیل لگائیں تو دوسرے تشنہ کام بھی سیراب ہوں مگر کہیں دور دور اس لائق کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، یہ تعلیمی انداز سخن یہ ہمہ دانی اور انا کا یہ آمیزہ عرفی شیرازی کی یاد دلاتا ہے جس کے نعیم بے حد قائل ہیں انہوں نے خود بھی لکھا ہے۔

رشکِ عرفی تھا میں حسن آگے   اس زمانے میں سب سے کم تر ہوں

ناقدری کی شکایت بھی کی تو اتنے حسن اور اتنی تہہ داری کے ساتھ، غرض یہ ہیں حسن نعیم ہمارے دور کے ایک بے مثل غزل نگار اور نئی غزل کو نو کلاسیکی ادب کا مرتبہ دلانے والے شاعر۔

عوض سعید

فائزا

خالد نے جب مجھ سے آکر کہا کہ مجھے مصحف اقبال توصیفی پر خاکہ لکھنا ہوگا تو میں بظاہر خوش ہوتے ہوئے بھی اداس ہو کر رہ گیا تھا، یہ اداسی یوں ہی نہ تھی میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ نہ صرف اداس ہو جاتا بلکہ پریشان بھی۔

ذرا سوچئے تو ایک نرے شریف آدمی پر بھلا کیا خاک اسکیچ لکھا جا سکتا ہے۔ یہی نا کہ اقبال بے حد شریف اور مخلص انسان ہے۔ اس کے آگے لکھنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں۔ میری نظر میں اقبال پر خاکہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے میں جو کچھ بھی لکھوں گا یا کہوں گا وہ سراسر مبالغہ ہی ہو گا۔ مگر جب لکھنا ہی ٹھہرا تو مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوگا۔ آپ نے فانیؔ مرحوم کی وہ تصویر شاید دیکھی ہو جن کی گود میں ایک ننھا منّا بچہ بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ بچہ مصحف اقبال ہی ہے۔ ثبوت کے لیے مغنی صاحب سے پوچھئے جنھوں نے فانیؔ پر ریسرچ کی ہے۔

اقبال توصیفی کچھ اتنا دُبلا پتلا واقع ہوا ہے کہ مزید کم و بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ اقبال کو آتے ہوئے دیکھ کر احمد جلیس نے کہا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آج ہوا کا رُخ اس طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود سے چل نہیں سکتا جب تک کہ ہوا اُسے اڑا نہ لے جائے۔ جلیسؔ کے اس دلچسپ کومنٹ کے بعد اس کا خلوص میری نظر میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔ وہ اب تک مجھ سے بیسوں بار مل چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا کریڈٹ بھی اُن ہواؤں ہی کو دیا جاتا جس کی بدولت وہ مجھ سے آج تک ملتا رہا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال سے ملاقات کا موقع ہمیں اُسی وقت میسر آتا ہے جب ہوائیں تیز چل رہی ہوں۔ وہ ایسے موقعوں پر یہی کہے گا۔ موسم اچھا تھا اس لیے چلا آیا۔ حالانکہ بات کچھ اور ہوگی۔ بہرحال مصحف اقبال کچھ اتنا مخلص ہے کہ اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے یہ الگ بات ہے کہ طویل مدّت تک اُس سے ملاقات نہ ہونے پر ہم نے جو پہلی دعا مانگی اُس کا مخاطب شور مچاتی ہوئی ہوائیں ہی تھیں۔

وہ جس محکمہ سے وابستہ ہے وہاں اکثر و بیشتر اسے کیمپ پر رہنا

پڑتا ہے آج آندھرا تو کل کیرالا۔ کبھی اتر پردیش تو کبھی مدھیہ پردیش۔
پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانوں، نہروں کے سینے پر لگاتے ہوئے بڑے بڑے پُلوں پر سے گزرتے ہوئے اس پر کیا بیتتی ہوگی اس کا اندازہ شائد ہم نہ کرسکیں۔ ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ جب وہ جیپ کار میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھنے جنگل سے گزر رہا تھا عین جیپ کے سامنے ایک خونخوار شیر آکر کھڑا ہوگیا۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے جیپ روک دی۔ شیر نے اقبال کے دُبلے پتلے جسم پر ایک نظر ڈالی اور بڑی مایوسی سے آگے بڑھ گیا۔ شیر کے منھ سے نکل آنا شائد ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ جب آدمی شیر کے منھ سے بچ نکل آتا ہے تو کوئی بھی مُہم سر کرسکتا ہے مثلاً اپنا مجموعہ چھپوا سکتا ہے۔ جلسے منعقد کرواسکتا ہے۔ اپنی تعریفیں سُن کر جھینپ بھی سکتا ہے۔ خوش بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن حقیقت حال کچھ اور ہے دراصل ہندو پاک کے کونے کونے میں مصحف اقبال کے مداح بکھرے ہوئے ہیں جو اس کے شعری مجموعہ کے منتظر ہیں

اگر اقبال نے ان کے خاموش مطالبہ کی پابجائی کتابی صورت میں کی ہے تو وہ اس طرح اپنے دیرینہ قرض سے سبک دوش ہورہا ہے۔

اقبال ایک سیدھا سادہ مخلص مگر بے حد ذہین لڑکا ہے۔ میں لڑکا اسے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ چھبیس برس کا ہونے کے باوجود اب بھی ہائی اسکول کا طالب علم دکھائی دیتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی عمروں سے پندرہ برس کم دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کو اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دعوتوں میں اسے آج بھی بچوں کے دسترخوان پر بٹھادیا جاتا ہے۔

وہ جب نامپلی ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُسے کتابوں کے ساتھ ساتھ اسپورٹس سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ وہ بچے جن کا قد انڈر ۵ فیٹ ہوا کرتا تھا۔ ان کے لیے کسی زمانے میں خاص ٹورنمنٹ ہوا کرتے تھے۔ اقبال کی شرکت ایسے میں ناگزیر تھی۔ وہ بال کے ساتھ ہوا کی طرح اڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بال سے پہلے ہی گول میں داخل ہوجاتا تھا۔ دروغ بہ گردن راوی۔ ایک دفعہ تو وہ بھاگتے بھاگتے فٹ بال گراؤنڈ سے ہاکی گراؤنڈ میں داخل ہوگیا تھا۔

شاذ کی طرح اقبال موسیقی پر جان چھڑکنے والوں میں سے نہیں ہے۔

مہدی حسن کا نغمہ ہو یا بیگم اختر کی غزل۔ اُسے متاثر کرنے میں ناکام رہتی ہے اس کے باوصف مہدی حسن کی خوبصورت آواز کے زیر و بم سے اس کے کان آشنا ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ مہدی حسن کا ذکر کیے بغیر ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ ذکر کیے بغیر شکم سیر رہتا ہے۔

بہت سوں کا خیال ہے کہ اقبال کی شخصیت شاعرانہ مزاج سے عاری ہے، شاعرانہ مزاج پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دن معظم جاہی مارکیٹ کے قریب خالد شاعروں سے زیادہ ان کے مزاج اور ذات کی تہہ داری کا احاطہ کر رہے تھے۔ میرے ساتھ وہ بھی تھا۔ مزاجاً اقبال شاعر معلوم نہیں ہوتے، بلکہ ان سے مل کر ایسا لگتا ہے کہ ہم ایسے آدمی سے مل رہے ہیں جو حساب کتاب کا پکا ہو۔ وقت کا اسیر ہو۔ اتنے بجے گھر پہنچنا ہو گا۔ گھر پہنچ کر ان Drawings کو دیکھنا ہو گا جو ڈرافٹس مین گھر چھوڑ گیا ہے۔ خالد یہ شوشہ چھوڑ کر مزے لیتے رہے لیکن وہ شاعری ہی کو شاعر کا مزاج قرار دینے کی سعی لاحاصل میں لگا رہا۔

"جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے" کے بمصداق دلچسپی اور تفریح تو کسی طرح ہماری ہو ہی جاتی ہے لیکن اقبال ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ پسپا ہو جاتا ہے۔

مان لیجئے کہ اقبال نے خالد سے یہ بات کہی ہو۔ بھئی خالد صاحب ہم نے اپنی وہ دونوں غزلیں وزیر آغا کو بھجوا دیں۔

اچانک خالد کہہ اٹھیں گے۔ یار حد ہو گئی شاذ اور عوض سعید کا تو انتظار کیا ہوتا، وہ بھی اوراق کے لیے اپنی چیزیں بھجوانے والے تھے۔ کیوں عوض صاحب کیا خیال ہے آپ کا۔ میں قدرے ہنستے ہوئے کہوں گا۔ ہاں اقبال آپ نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ شاذ نے غالباً آپ سے کہا بھی تھا کہ اس سلسلہ میں اُسے یاد دلائیں۔ یہ بات آپ نے اتنی دیر میں کہی ہے کہ اوراق کا خاص شمارہ نکل بھی چکا ہو گا۔ وہ جھینپ کر کہے گا۔ واقعی ہم سے بڑی غلطی ہو گئی۔ پتہ نہیں شاذ صاحب میرے متعلق کیا سوچیں گے۔ شاذ کچھ سوچے یا نہ سوچے مگر وہ گہری سوچ میں مبتلا ہو جائے۔ اقبال کو سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبتا دیکھ کر ہم لوگ Webster اور Sexton کے بارے میں گفتگو شروع کر دیں گے اور وہ نڈھال لہجے میں خدا حافظ کہتا ہوا رنجیدہ گھر لوٹ جائے گا۔

شاذ سے اس کی بڑی یاری ہے۔ وہ اسے کچھ اتنا چاہتا ہے کہ اس

کی بچی کچی محبت بھی ہمارے حصے میں ذرا کم ہی آتی ہے۔ چند برس پہلے شاذ اور اقبال توصیفی نے ایک ہی زمین اور بحر میں کئی ہم طرح غزلیں کہی تھیں جو پونم اور دوسرے جرائد میں جوڑواں بچے کی شکل میں چھپتی رہیں۔ جب یہ دلچسپ سلسلہ ختم ہوا تو خلیل الرحمن اعظمی نے خیریت دریافت کرتے ہوئے کسی سے پوچھا۔ آج کل یہ ادب کے شنکر جے کشن کیسے ہیں۔

اقبال شاذ کی طرح مغنی کا بھی بڑا پرستار ہے۔ اکثر بڑے احترام سے مغنی کا ذکر بھی کرتا ہے۔

ایک دن وہ لدا پھندا ہمارے گھر آیا۔ وہ بڑا مسرور دکھائی دے رہا تھا

"کیا بات ہے آج بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو؟"

"مغنی صاحب نے میری کتاب کے لیے بڑے اچھے ٹائٹل بنائے ہیں۔" انتخاب کے لیے آپ کے علاوہ میں فاطمہ بھابی کو بھی زحمت دوں گا۔"

میں نے فاطمہ کو آواز دے کر یہ خوشخبری سُنائی۔

"بھابی ٹائٹل رکھنے کے لیے ایک سفید چادر لائیے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔

میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔ مغنی صاحب نے کہا کہ یہ ٹائیٹل اگر سفید دُھلی دُھلائی چادر پر رکھ کر دیکھیں تو زیادہ بھلے لگیں گے اور انتخاب میں بھی سہولت رہے گی۔ غرض کہ سفید چادر بچھا دی گئی جس پر مغنی کے بنائے ہوئے کوئی پچیس ٹائیٹل سلیقے سے رکھ دیے گئے۔

فاطمہ نے کہا۔ "بھائی نے کتنے اچھے ٹائٹل بنائے ہیں۔" میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے لیکن اقبال بے چارہ کہاں تک سفید چادر لیے لوگوں کے گھروں پر پھرتا رہے۔ اقبال نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل میں آج گھر سے سفید چادر لانا ہی بھول گیا۔ اقبال سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دِ Witty بھی ہے

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فائزہ کا سرورق مغنی نے بڑی خوبصورتی سے بنایا ہے۔

میری پہلی کتاب سائے کا سفر کی اشاعت میں مغنی ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ انھوں نے میری بعض کہانیوں کی کتابت عجیب عجیب انداز میں کروائی تھی۔ ایک کہانی کی کتابت سیدھی اور اُلٹی تھی کہانی کے مطالعہ کے لیے آدمی کو بیک وقت مشرق اور مغرب کی طرف رُخ کر کے کہانی پڑھنی ہوتی تھی۔ اس تکلیف دہ مرحلے سے گزرتے ہوئے پتہ نہیں قاری پر کیا گزری ہوگی لیکن ایک فائدہ مجھے ضرور ہوا کہ وہ کہانی ان

جھٹکوں کی وجہ سے پڑھنے والوں کو یاد رہ گئی۔ لیکن اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ مغنی نے رحم کھاکر اُسے بخش دیا۔ ورنہ مغنی کا بس چلے تو سرورق پر صرف کتاب کا نام لکھ کر سارے صفحات یوں ہی خالی چھوڑ دیں۔

اقبال پر بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اقبال کی شخصیت کا بھرپور جائزہ نہیں لیا ہے۔ مثلاً اس کا حافظہ بے حد کمزور ہے وہ کہیں اور کسی وقت بھی اپنی چیز بھول سکتا ہے مثلاً وہ اپنا قیمتی بیگ بھول کر کسی دوسرے کا معمولی سا بیگ اٹھالے جاتا ہے۔ وہ سگریٹ کم پیتا ہے لیکن اپنا سگریٹ کا پیکٹ بھول کر دوسروں کی ماچس کی ڈبیہ بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لیتا ہے۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ اس نے وقفہ وقفہ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے ماچس کی تین ڈبیاں اپنے جیب میں رکھ لیں اور خود خالی سگریٹ منھ میں دبائے ماچس کے لیے تڑپتا رہا۔ اور اُس کے تمام ساتھی اس کا منھ تکتے رہ گئے۔

ہندی کے مشہور کوی نرمل جی سے اُس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ نرمل جی کا خیال ہے کہ جدید شاعروں میں اقبال سے اچھا کوئی شاعر حیدرآباد میں ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے۔ یہ نرمل جی کی ذاتی رائے ہے، اقبال اگر چاہیں تو اس رائے کو رد بھی کر سکتے ہیں۔

اقبال کے کئی نام ہیں۔ اسے کوئی اس کے اصلی نام مغنی کہہ کر پکارتا ہے کوئی مصحف کہتا ہے، کوئی توصیفی۔ فائزہ کے خیر مقدمی جلسے کے بعد ان ناموں میں ایک اور نام کا بھی اضافہ ہو جائے تو کوئی بعید نہیں لیکن وہ اس نام کو بھی بھول جائے گا۔ کیونکہ ؎ یہ بھی ہم بھول گئے 'نام ہمارا کیا تھا' کی نازک منزل پر وہ کب کا پہنچ چکا ہے

نہ اتنی تیز چلے، سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتّا دکھائی دیتا ہے
آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

ایسے عجیب و غریب شعر کہنے والا شکیب جلالی بھی بدایوں ہی کا ایک سپوت تھا جس کی مٹی سے مصحف اقبال کا خمیر اٹھا ہے۔ میرا خیال ہے فائزا اقبال کو بہت آگے لے جائے گا اتنا آگے کہ وہ خود تھک ہار کر پیچھے رہ جائے گا۔

لیکن کیا عجب کہ ایک دن وہ دامن جھٹک کر ننھے بلو کا ہاتھ تھامے کسی موڑ پر ہمیں اچانک مل جائے۔

یندر لُوتھر

کوڈان

"کوڈان" انگریزی لفظ "کوڈ" کی دکنی سٹائل پر جمع ہے۔ جمع کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس وقت بے شمار کوڈ رائج ہیں۔ ویسے تو ہر زبان بجائے خود ایک کوڈ ہے۔ پھر ہر زبان کے اپنے کوڈ ہوتے ہیں جو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو کوڈ کے گر جانتے ہوں۔ شارٹ ہینڈ بھی کوڈ ہے۔ جس کے ذریعہ سے لمبی چوڑی اور سیدھی سادھی تحریر چند منحنی لکیروں میں سما جاتی ہے۔

خفیہ پولیس والوں کا اپنا کوڈ ہوتا ہے۔ مثلاً انھیں اگر یہ پیغام بھیجنا ہو کہ فلاں شہر میں فساد ہونے کا خطرہ ہے تو وہ کوڈ میں تار بھیج دیں گے کہ جیا بھادری کے لڑکی پیدا ہونے والی ہے۔ خبردار ہو جاؤ۔

محکمہ ڈاک اور تار پبلک کی سہولت کے لیے تاروں کے کوڈ بنائے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کو عید مبارک کا تار بھیجنا مقصود ہو تو آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ تار نمبر دو بھیج دیں۔ شادی کی مبارکباد کے تار کا نمبر سترہ ہے۔ اس طرح مختلف موقعوں کے لیے ان کے پاس ستائس کوڈ ہیں۔

ریڈیو اور فلم والے بھی کوڈ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ریڈیو ڈرامے کے لیے ریلوے پلیٹ فارم کے شور وغل کا سین چاہیے تو ریڈیو والے ہر بار اسٹیشن پر جا کر ریکارڈنگ نہیں کرتے۔ اس طرح ہجوم کے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے بھی وہ بار بار ریکارڈ نہیں کر سکتے۔ ایسے سین جن کی ضرورت انھیں اکثر رہتی ہے وہ ریکارڈ کر کے لائبریری میں رکھ دیتے ہیں اور اگر کسی پروڈیوسر کو ان میں کوئی بھی سین چاہیے تو وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ فلاں نمبر کا سین دو سیکنڈ کے لیے اور فلاں نمبر کا سین آدھے منٹ کے لیے دے دیں۔

اس طرح فلم والے بھی ریل کے ایکسیڈنٹ طوفان اور طغیانی جہاز کی اڑان اور جلسے جلوسوں کے سین فلما کر تیار رکھتے ہیں۔ پروڈیوسر اپنے اسسٹنٹ کو کہہ کر بھیجتا ہے۔ بھئی ذرا دیکھنا وہ تین نمبر کا سین دو منٹ کے لیے اور پندرہ نمبر کا سین ایک منٹ کے لیے لے آؤ۔ اس کا مطلب یہ کہ اسے ایک اندھیری رات میں طوفان کا سین چاہیے جس میں ہیرو پہاڑ کی چوٹی سے سمندر میں چھلانگ مارنا ہے۔ اب وہ سین ہر ہیرو

کو چاہیے وہ راجیش کھنہ ہو یا ناگیشور راؤ فٹ ہو جائے گا کیونکہ اصلی چھلانگ مارنے والا تو وہ بیچارہ سٹنٹ مین ہے جس کو اس سین کے لیے مبلغ پچاس روپیہ نقد دیے گئے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ کوڈ سسٹم کو ابھی اور بھی بڑے پیمانے پر ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زندگی آسان ہو سکتی ہے اور روزمرّہ کے کئی فضول قسم کے جملے اور تکلّفات ترک کیے جا سکتے ہیں۔

مثلاً آپ جب بھی کسی دوست سے ملتے ہیں ہمیشہ یہی سوال پوچھتے ہیں کہ "بھئی کیا حال ہے؟"

اس کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ پھر وہ آپ سے وہی سوال پوچھتا ہے اور پھر آپ وہی جواب دیتے ہیں۔

پھر کیونکہ کوئی بات کہنی نہیں ہوتی اس لیے تھوڑی دیر کے بعد آپ ذرا اُوب کر پوچھتے ہیں۔

"اچھا اور کیا حال ہے؟"

اُس کا جواب ہوتا ہے۔ "اچھا اور بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

اس قسم کے سوال جواب کچھ اتنے بندھے ٹکے ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص سخت بیمار ہو اور آپ اس سے اس کا حال پوچھیں تو بھی وہ جواب دے گا کہ وہ ٹھیک ہے۔ ہمیں آج تک صرف ایک ہی شخص ایسا ملا جس کا جواب ذرا مختلف تھا۔ وہ بے چارہ کینسر کا مریض تھا اور اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایک دن ہم اس سے ملنے گئے اور رسماً پوچھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے جواب دیا "بہتر ہے۔" اور پھر کچھ رک کر وضاحت کی "میرا مطلب ہے پہلے سے تو بدتر ہے لیکن آنے والے کل سے بہتر ہے۔"

آپ گھبرائیے مت اور خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یہ رسمی گفتگو صرف ہندوستان میں ہی نہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی ہوتی ہے۔ ہم نے بیشتر ممالک میں دیکھا ہے کہ دستوری گفتگو ایسے ہی ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ہمیں کچھ عرب ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمیشہ ہر ملاقات پر گفتگو مندرجہ ذیل جملوں سے شروع ہوتی ہے۔

زید۔ "صبح خیر"

بکر - " صبح خیر"

زید - "کیا حال ہے؟ -"

بکر - " ٹھیک ہے - شکر ہے خدا کا - تمھارا کیا حال ہے؟"

زید - " ٹھیک ہے - شکر ہے خدا کا "......

اس سے زیادہ عربی ہمیں آتی نہیں - شکر ہے خدا کا -

انگریزی اور امریکن لوگ تو اور بھی کمال کرتے ہیں - سوال کا جواب سوال سے دیتے ہیں - مثلاً جب وہ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں تو گفتگو یوں شروع ہوتی ہے -

ٹام - " آپ کا کیا حال ہے ؟ "

جم - " آپ کا کیا حال ہے ؟ "

شروع شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ جم اصرار کرتا ہے کہ پہلے تم اپنا حال بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا - میں پہلے کیوں بتاؤں ؟ - اور ہمیں یہ ڈر لگتا ہے کہ ابھی ان کی لڑائی ہوئی - یا لکھنؤ کے نوابوں کی طرح پہلے آپ پہلے آپ میں گاڑی چھوٹ جائے گی - لیکن صدیاں بیت گئی ہیں - آج تک نہ ٹام نے اور نہ جم نے اپنا حال بتایا ہے - اور ان کی نسلیں ابھی تک دوسرے کو کریدرہی ہیں - اب اگر ہم " آپ کا کیا حال ہے" کو کوڈ نمبر ایک اور" میرا حال ٹھیک ہے شکریہ " کو کوڈ نمبر دو دے دیں تو ملاقات کے وقت گفتگو کچھ ایسے ہوگی -

زید - " ایک "

بکر - " دو - ایک "

زید - " دو "

آپ خود ہی سوچیے اس طرح کتنا وقت بچے گا - ہم نے سنا ہے کہ امریکہ میں روز مرہ کے تکلفات کو کوڈ میں بدلنے کا تجربہ شروع ہوگیا ہے - وہاں کی ایک جیل میں جہاں عمر قیدی رہتے ہیں یہ تجربہ کیا گیا ہے - وہ قیدی ہر روز شام کو ملتے اور وہی پرانے لطیفے سناتے اور وہی پرانی ہنسی ہنستے - وہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر لطیفے کو ایک کوڈ نمبر دے دیا جائے اور کسی کو بھی جب لطیفہ سنانا ہو تو وہ صرف لطیفے کا کوڈ نمبر بتا دیتا ہے اور سننے والے اس کو سن کر اور اس کی دل چسپی کو مدنظر رکھ کر مناسب انداز میں ہنس دیتے ہیں - ایک دن وہاں ایک نیا قیدی آیا - شام کو جب معمول کے مطابق محفل جمی تو ہر قیدی نے اپنی پسند کا لطیفہ سنایا -

" لطیفہ نمبر پانچ - "

"ہا ہا - ہا ہا"

"لطیفہ نمبر سترہ"

"ہی ہی ہی ہی"

"لطیفہ نمبر سات"

اس لطیفے کو سن کر کچھ قیدی تھوڑا سا ہنسے۔ لیکن ایک قیدی بہت ہنسا اور جب سب نے ہنسنا بند کر دیا۔ تو بھی وہ ہنستا رہا۔ نئے قیدی نے جیلر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ باقی سب قیدیوں نے یہ لطیفہ بہت بار سن لیا تھا۔ اس قیدی نے پہلی بار سُنا ہے اس لیے وہ زیادہ ہنس رہا ہے۔ اس کے بعد نئے قیدی نے بھی ایک لطیفہ سنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اجازت ملنے پر اس نے کہا۔

"لطیفہ نمبر تیرہ"

اس کو سن کر کوئی بھی نہ ہنسا۔

نئے قیدی نے قدرے خفت سے پوچھا کہ میرے لطیفے پر لوگ کیوں نہیں ہنسے۔ حالانکہ بڑا زوردار لطیفہ تھا۔

جیلر نے اسے سمجھایا کہ لطیفہ تو اچھا تھا لیکن لطیفے کی کامیابی اس کے کہنے کے انداز میں ہوتی ہے۔ تمہارا سنانے کا ڈھنگ ذرا ڈھیلا ڈھالا تھا۔

ہمیں سینکڑوں جلسوں، محفلوں اور مشاعروں وغیرہ میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کئی حیثیتوں سے ایسی محفلوں میں جانے کا موقعہ ملا ہے اس لیے ہم نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہر جلسے کے لیے کچھ کیریکٹر لازمی ہیں۔ سب سے پہلے کنوینر جو سارے فساد کی جڑ ہوتا ہے۔ اس کے کئی اور نام بھی ہوتے ہیں جیسے آرگنائزر یا سکریٹری وغیرہ۔ نام کچھ بھی ہو اس جنس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا چنا ہوا یا خود ساختہ۔ قسم چاہے کوئی بھی ہو خصلت ایک ہی ہوتی ہے۔ ان صاحب میں اپنی آپ نمائش کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی آواز کے ساتھ عشق ہوتا ہے اور مشہور لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوگوں کو بتانے کا زبردست اشتیاق۔ انگریزی میں ایسے شخص کو سکانڈل مانگر کہا جا سکتا ہے۔

جلسے کے لیے جس دوسرے کیریکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پریزیڈنٹ یا چیرمین یا صاحب صدر کہا جا سکتا ہے۔ اگلے زمانے میں صرف صاحب صدر کا ہونا کافی تھا لیکن اب آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے بیروزگاری بڑھ گئی ہے اس لیے جلسوں

کے لیے ایک اور پوسٹ سینکشن کی گئی ہے۔ اس پوسٹ کو چیف گیسٹ یا مہمان خصوصی کا نام دیا گیا ہے یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ فی جلسہ کم از کم دو وی۔ آئی پیون کو بنایا جا سکے۔ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صاحب صدر اور مہمان خصوصی میں کون سا رتبہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہی اس اختراع کی خوبی بھی ہے۔ خود دونوں صاحبان کو بھی مغالطہ رہتا ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ اہم ہے اور اس طرح ایک تلوار سے دو شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو جلسے میں صرف اس لیے آتے ہیں کہ صاحب صدر یا مہمان خصوصی کی نظر ان پر پڑ جائے اور شاید انھیں آداب عرض کرنے کا موقعہ بھی مل جائے۔

چلیے نمونے کے طور پر آپ کو ایک جلسے میں لے جائیں

محفل موسیقی کی ہے۔ جناب صدر صاحب اور مہمان خصوصی کے ناموں کا ڈھنڈورا پٹ چکا ہے۔ اشتہاروں میں لوگوں سے وقت پر آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وقت ہو چکا ہے۔ آرٹسٹ لوگ تیار بیٹھے ہیں۔ ہال کچھا کھچ بھرا ہوا ہے۔ منتظمین بے تابی سے صاحب صدر کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ آئے ہیں آدھا گھنٹہ لیٹ۔ لیکن آتو گئے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ کسی مذہبی تقریب میں مہمان خصوصی تھے وہاں دیر ہو گئی۔ مہمان خصوصی ان کے آنے کے بعد آئے ہیں کیونکہ رواج یہ ہے کہ جو شخص زیادہ اہم ہوتا ہے وہ زیادہ دیر سے آتا ہے۔

اب محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ کنوینر صاحب۔ صاحب صدر کی گلپوشی کرتے ہیں۔ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں۔ کنوینر صاحب مہمان خصوصی کی گلپوشی کرتے ہیں۔ حاضرین پھر تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر ایک اور صاحب کنوینر صاحب کی گلپوشی کرتے ہیں۔ اس بار حاضرین کم تالیں بجاتے ہیں۔ لیکن صاحب صدر اور مہمان خصوصی خوب زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر مہمان خصوصی آرٹسٹوں کی گلپوشی کرتے ہیں۔ اب سب لوگ مل کر تالیاں بجاتے ہیں۔

پھر کنوینر صاحب تھوڑا کھانس کر اپنا گلا صاف کرتے ہیں۔ اور صاحب صدر کی تفصیلی سوانح حیات پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ وہ پیدا کب اور کیوں ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کیوں نہیں پائی۔ ان کی شادی اور اولاد کے بارے میں معلومات کے بعد ان کے سیر اور سیاحت کے شوق کا ذکر ہوتا ہے جو انھیں دہلی سے باہر شاہدرہ اور غازی آباد تک لے گیا۔ پھر ان کی قوم یا ریاست یا محلہ یا اپنی گلی کے تئیں بے لوث اور اپنے کنبہ کے تئیں لوث خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تمام معلومات صاحب صدر نے خود نہایت مبالغہ آمیزی سے لکھ کر کنوینر صاحب کو پہلے سے ارسال کی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت

ان تفصیلات کو سن کر وہ بظاہر کچھ ایسے جھینپتے ہیں گویا کوئی نجومی ان کے ماضی کے بارے میں کچھ بتا رہا ہو۔

بالآخر کنوینر جلدی سے ایک بار پھر صاحب صدر کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنی سونے کی گھڑی سے قیمتی وقت نکال کر یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔

پھر ان الفاظ میں یہی رسم ایک اور چمچہ جسے مہمان خصوصی کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ان کے تعلق سے انجام دیتا ہے۔ صاحب صدر کی تعریف میں باندھے ہوئے پلوں پر سے وہ مہمان خصوصی کی شان میں سجی ہوئی رکشائیں چلاتا ہے۔ ان رکشاؤں کا رش کئی بار اتنا ہو جاتا ہے کہ حاضرین سے کئی منچلے سیٹیاں بجا کر ٹرافک کانسٹبل کا رول ادا کرتے ہیں۔

اس کے بعد صاحب صدر سے انجمن اور آرٹسٹوں کے بارے میں "چند الفاظ" کہنے کی گزارش کی جاتی ہے۔ "چند الفاظ" کے معانی ہندوستان میں لمبی تقریر کے ہوتے ہیں۔ پہلے تو صدر صاحب کچھ الفاظ میں سب لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کے باقی کے "چند الفاظ" دو حصوں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں وہ سچ بولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تو ایک حقیر اور ادنا قسم کا شخص ہوں جو ہرگز اس عزت کا مستحق نہیں جو آپ لوگوں نے مجھے بخشی ہے۔ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے ہیں کہ میرے متعلق جو کچھ بھی آپ کو بتایا گیا ہے وہ مبالغہ آمیزی ہے۔ چونکہ حاضرین کو سچ سننے کی عادت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اس سچ کو بھی جھوٹ مان کر اسے صدر صاحب کی کسر نفسی سمجھتے ہیں۔

اس مغالطہ کا فائدہ اٹھا کر اب صدر صاحب اپنے "چند الفاظ کا دوسرا حصہ شروع کرتے ہیں جس میں وہ سراسر جھوٹ بولتے ہیں" میں یہاں تقریر دینے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو مجھے ابھی ابھی پتہ چلا کہ مجھے تقریر بھی کرنا ہے۔ میرا یہاں آنے کا مدعا تو یہ تھا کہ میں موسیقی اور سنگیت سے لطف اندوز ہو سکوں۔ سنگیت اور آرٹ سے مجھے بچپن سے ہی لگاؤ ہے۔ یہ شوق مجھ میں اس وقت پیدا ہوا جب میں دیواروں پر فلمی پوسٹر چسپاں کر کے اپنا پیٹ پالا کرتا تھا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں یہاں تقریر کرنے نہیں بلکہ محفل کا لطف اٹھانے آیا تھا۔ اب میں درخواست کروں گا کہ زیادہ

وقت تکلفات پر ضائع کرنے کے بجائے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔ اس سے پہلے میں منتظمین کا کلاکاروں کا اور حاضرین کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان کا یہ دوبارہ شکریہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ جو شکریہ انھوں نے پہلی بار" چند الفاظ" کے شروع میں ادا کیا تھا وہ تہہ دل سے نہیں تھا سطحی اور رسمی سا تھا۔ تہہ دل تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ خاص کر اگر صاحب صدر ذرا موٹے اور بھیس قسم کے شخص ہوں (اور عام طور پر صدر صاحب فربہ اندام ہی ہوتے ہیں) اس لیے صدر صاحب کے تہہ دل تک پہنچنے کے لیے حاضرین کو ایک لمبی تقریر سننا پڑتی ہے۔

لیکن ابھی پروگرام کا آغاز کہاں؟ آپ مہمان خصوصی کو تو بھول گئے۔ صاحب صدر سے نپٹ لینے کے بعد مہمان خصوصی کی باری آتی ہے اور پھر ان کے تعلق سے پوری کارروائی لفظ بہ لفظ نہیں تو محاورہ بہ محاورہ اور دور بہ دور دھرائی جاتی ہے۔

اس اثنا میں بے چارہ یا بیچاری آرٹسٹ پہلے تو اونگھنا شروع کرتا یا کرتی ہے اور پھر سٹیج پر سوجاتا یا جاتی ہے۔ اگر آرٹسٹوں میں ایک مرد ہو اور ایک عورت تو پھر ظاہر ہے کہ وہ بھری محفل میں اکٹھے تو سو نہیں سکتے۔ اس لیے باری باری سوتے ہیں۔ جب رسمی کارروائی پوری ہوجاتی ہے تو حاضرین تالیاں بجا بجا کر سوتے ہوئے آرٹسٹوں کو جگاتے ہیں۔ اس کے بعد اصلی محفل کا آغاز ہوتا ہے یعنی آرٹسٹوں کے جاگنے کا اور صدر اور مہمان خصوصی کے سونے کا وقت شروع ہوتا ہے۔

اگر آپ کو چار پانچ جلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ کو اب تک خیر مقدمی تقریر صدر اور مہمان خصوصی کے "چند الفاظ" اور اظہار تشکر کی تقریروں کے سٹینڈرڈ اصطلاحیں اور محاورات زبانی یاد ہوگئے ہوں گے۔ ہمیں تو اس موضوع پر اب اتنی مہارت ہوگئی ہے کہ ہم کسی بھی جلسہ میں بیٹھے ہوئے بھڑکتے اشعار کے مصرعہ ثانی کی طرح صدر اور مہمان خصوصی کی تقریروں کے جملے پورے کرسکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ آداب محفل اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔

ایک بار کسی وی۔ آئی۔ پی کو ایک مشہور اسکول کے سب سے بزرگ استاد کے ریٹائر ہونے پر منعقدہ جلسے میں بلایا گیا۔ سب طالب علموں اور استادوں کی طرف سے انھیں خراج تحسین پیش کیا جاچکا تو وی۔ آئی۔ پی سے "چند الفاظ"

کہنے کی درخواست کی گئی - ڈی - آئی - پی نے کہا کہ مسٹر حسین کی زندگی ایک مثالی استاد کی زندگی ہے - انھوں نے اپنی تمام زندگی آنے والی نسلوں کی خدمت میں گزار دی ہے - انھوں نے پڑھانے کو صرف ذریعہ معاش نہیں بلکہ اپنی زندگی کا واحد مشن سمجھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے طالب علموں سے عقیدت پائی - آج جب اسکولوں میں ٹریڈ یونین کا اثر بڑھ رہا ہے - پڑھنا پڑھانا بھی گویا ایک انڈسٹری بن گیا ہے - ایسے ماحول میں حسین صاحب جیسے استادوں کی موجودگی گویا ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہے -

ہمارے ملک کی ترقی کے لیے ہمارے اسکولوں کے لیے سینکڑوں اور ہزاروں حسینوں کی ضرورت ہے - اس کے بغیر ہماری ترقی ناممکن ہے - اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹہ حسین صاحب کی حقیقی اور خیالی خوبیوں پر بولتے رہے - بیچ میں ہیڈ ماسٹر نے کئی بار ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی - لیکن ڈی - آئی - پی کی تقریر تھی کہ ایک چشمہ جو بند ہونے کا نام نہیں - بالآخر جب تقریر ختم ہونے کو آئی تو ہیڈ ماسٹر نے ہمت کر کے ڈی - آئی - پی - کو سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا -

اس پر ڈی - آئی - پی صاحب چونک پڑے - ایک لمحے کے لیے وہ رُکے اور پھر گویا ہوئے ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ جلسہ حسین صاحب کے لیے نہیں بلکہ پرساد صاحب کے لیے منعقد کیا گیا ہے - میں نے جو کچھ حسین صاحب کے تعلق سے کہا ہے وہ مناسب ردو بدل کے ساتھ پرساد صاحب پر بھی لاگو ہوتا ہے -

ہمارے جلسوں کی رسمی کارروائیوں اور گھسی پٹی اصطلاحوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی موقعہ پر بلا خوف و خطر استعمال کی جا سکتی ہیں - وہ گویا ایک جامہ ہے جو ہر کسی کو زیب دیتا ہے - یہ رسمیں اور کھوکھلے تکلّفات ہماری روزمرہ زندگی کا اتنا اہم جز بن گئے ہیں کہ بیشتر اہم رسموں کے جنگل میں اصلی درخت کو کھو دیتے ہیں - یہ سب تکلفات اور دکھ رکھاؤ تضیع اوقات ہے - سب کو معلوم ہے کہ صاحب صدر مہمان خصوصی اور منتظمین جلسہ حاضرین کے ساتھ ایک قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں - اس لیے ہم نے تقریباً دو ہزار جلسوں کا بغور مطالعہ کر کے پچھلے سال یہ تجویز پیش کی تھی کہ تمام خیر مقدمی تقاریر - اظہار تشکر اور دوسرے تکلفاتی جملوں اور سٹینڈرڈ محاوروں کو کوڈ نمبر دے دیا جائے اور اپنی تقریروں کے ان رسمی حصوں کو مقررین کوڈ میں پڑھیں - صرف اصلی مواد کو پورے طور پر پڑھیں - اُردو میں حروف ابجد کا کوڈ تو بنا دیا جائے - ہر جلسہ میں اس کوڈ اور اس کی

چابی کی کاپیاں تمام حاضرین میں پہلے ہی تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ مجوزہ کوڈ میں صاحب صدر کے لیے نمبر ایک مہمان خصوصی کے لیے نمبر دو اور حاضرین کے لیے صفر استعمال کیا جائے گا۔ حاضرین کے لیے صفر کا ہندسہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ حاضرین بجائے خود صفر ہوتے ہیں ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ جس ہندسے کے ساتھ بھی لگ جائیں اس کی قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرح صاحب صدر کی قیمت حاضرین کی موجودگی سے ہی بڑھتی ہے۔

اگر یہ کوڈ منظور کر لیا جائے تو نمونے کے طور پر خیر مقدمی تقریر کچھ ایسے ہوگی۔

ایک - دو - صفر و -

ساتھ سو دو - چار بٹا پانچ - دو ضرب تین - چار - پچیس سو پچھتر - ستر نوے - بائیس - شکریہ -

اس کا حل یہ ہوگا -

معزز صاحب صدر مہمان خصوصی اور حاضرین -

آج بہت مبارک دن ہے کہ ہم سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ صاحب صدر یہاں کی کلچرل زندگی کے روحِ رواں ہیں اور اس جلسے کی صدارت کے لیے ان سے بہتر شخص کا انتخاب مشکل تھا۔ ان کی خدمات سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود یہاں آنے کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا ہے۔ ...... وغیرہ وغیرہ۔

مہمان خصوصی کے تعلق سے۔

تین سو چار - سات بٹا نو - چالیس

جو کچھ صاحب صدر کے بارے میں کہا ہے وہ ہمارے مہمان خصوصی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

اسی طرح جناب صدر اور مہمان خصوصی بھی ایک آدھ منٹ میں کوڈ کے ذریعہ اپنے تکلفات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ہم نے بڑے فخر سے یہ تجویز چند اہم اداروں لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سامنے رکھی۔ عام طور پر اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ بیشتر اداروں کی طرف سے ہمیں تعریفی خطوط بھی آئے۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اس تجویز پر ایک آل انڈیا کانفرنس میں غور کیا جائے۔ اس کانفرنس میں ہمیں مدعو کیا گیا اور وہاں ہم نے اپنی تجویز کی تفصیلی طور پر وضاحت کی۔ اس پر بہت بحث ہوئی۔ اس کی شدید ترین مخالفت

لیڈروں اور جنتا کی طرف سے ہوئی۔ اور بالآخر تجویز کو بھاری اکثریت سے رد کر دیا گیا۔ اس کی دو اہم وجوہات دی گئیں وہ یہ کہ اگر تقریروں میں سے رسمی اور رواجی لوازمات اور تکلفات کو نکال دیا جائے تو پھر مقررین کو اپنی تقریروں میں ٹھوس مواد ڈالنا پڑے گا۔ اس کے لیے انھیں غور و فکر کرنا پڑے گا۔ جس سے ان کی دماغوں پر بوجھ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ جو ایک خطرناک امر ہوگا۔ اسی طرح حاضرین کو بھی خواہ مخواہ سوچنا پڑے گا۔

ہندوستان میں آج ہر چیز پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ صرف انسانی دماغ پر ہی ٹیکس نہیں لگا۔ یہ تجویز دماغ پر ٹیکس لگانے کے مترادف ہے۔ جنتا ہرگز ایسی تجویز قبول نہیں کرے گی جس سے اس کو اپنا دماغ کریدنا پڑے۔ جس کو اس نے صدیوں سے محفوظ کسی قسم کے کریدنے اور ٹیکس سے بچا کر رکھا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے لوگوں کا بہت سا وقت بچ جائے گا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسے بچائے ہوئے وقت میں لوگ کیا کریں گے ہمیں یہ تنبیہہ دی گئی کہ ہمارا ملک اس وقت ایک نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے بے شمار مسئلے ہیں۔ ایسے بحرانی دور میں ہمارا یہ فرض ہے کہ ایک سچے ہندوستانی ہونے کے ناطے ہم موجودہ مسئلوں کو حل کریں نہ کہ نئے مسئلے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کئی لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ تجویز شرانگیز ہے اور ہم امن میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہم نے اس اپیل پر غور کیا۔ یہ دلیلیں واقعی ٹھوس ہیں اتنی ٹھوس کہ ایسی بے وقت تجویز رکھنے پر ہم نے انتہائی ندامت کا اظہار کیا اور اسے واپس لے لیا۔

صاحبان اب آپ بھی اس تجویز کو بھول جائیں۔

فراق گورکھپوری

مطرب سے کہو آج اِس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے

وہ جوش جو کیا جانے کہاں سے اُبھر آئے
وہ درد فرشتوں کو جو انسان بنائے

آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
زرّیں کمرے کج کُلہے، تنگ قبائے

اک برق ادا، شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں
دلہائے مہ و مہر کو پہلو میں دبائے

کوندا ہو گداز۔ اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک۔ لَو جو ستاروں سے چرائے

وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چنگیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

دوشیزہ جوانی کی اُدھر ٹوٹتی انگڑائی
تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے

وہ شوخیٔ محتاط کے نپتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

اسرار الحق مجاز

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈا کرے کوئی

دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی
اس طرح سازِ عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

رنگینیٔ نقاب میں گم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی

یا تو کسی کو جرأتِ دیدار ہی نہ ہو
یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی

مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

تم نے تو حکم ترکِ تمنّا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنّا کرے کوئی

ہوتی ہے اس میں حسن کی توہین اے مجاز
اتنا نہ اہلِ عشق کو رُسوا کرے کوئی

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

جہانِ زندہ کی قدروں کو استوار کرو
خزاں زدوں کو رضاؔ واقفِ بہار کرو

کہا خداؤں نے دنیا کے ہو گئے تم آزاد
بس آخرِ غمِ ہستی تک انتظار کرو

اکیلے بھٹکو گے کب تک نزار و لب بستہ
کبھی سکونِ طبیعت کو رازدار کرو

تمہارے روپ کو یہ ڈھب سکھا دیا کس نے
کسی سے بیر بڑھاؤ کسی سے پیار کرو

کوئی بھی موت مرے زندگی تو زندہ ہے
گئے پلوں کو نئے وقت میں شمار کرو

اِدھر بھی حُسنِ مجسم اُدھر بھی رنگ ہی رنگ
شمیم بن کے گلستاں کو مشکبار کرو

رضاؔ شگفتگیٔ زیست ہی میں سب کچھ ہے
گناہِ شعر کرو اور بار بار کرو

غزل

کوئی کوشش نہ بارور ہوگی — بے خودی پورے زور پر
ذہن بے باک بھی رکے گا کہیں — راہ ہرچند پُر خطر
شمعِ محفل کے ساتھ بجھ جاؤں — اے شبِ ہجر اب کب سحر
ہم نہ بچھڑیں گے زندگی سے کہیں — دل بھرا ہوگا آنکھ تر
مردہ دل کو لہو پلا دیکھو — یہ دوا بھی نہ کارگر
راہ کے سینکڑوں اندھیروں میں — شمعِ اُمید راہ بر
شام آئی خیالِ یار آیا — اب ملاقات رات بھر
دیکھنا ایک دن ضیائے بشر — رازِ فطرت کی پردہ در
وقت آنے دو روپ نکھرے گا — سائے پلٹیں گے دوپہر
چل پڑی موت اپنے مسکن سے — زندگی کیسی بے خبر

اے رضاؔ جنگِ جہل و دانش میں
ذہنی آسودگی سپر ہوگی

غزل

آگ نے دل کو دھو دیا آنکھ نے اشک پی لیے
اب تو چلو اٹھو بھی شمسؔ حد سے زیادہ جی لیے
سبزہ تمام شب بسر گل کا گلا لہو سے تر
ہم نے بھی صحن باغ کے حال کبھی کبھی لیے
دن کے جگر میں خون شب جوشش زہر سا رواں
شیشے سی آنکھ صبح کی خوف کی بے بسی لیے
تیری سبھی سے گفتگو تجھ سے سبھی کی جستجو
پھر بھی ہے نقش آرزو رنگ شکستگی لیے
اپنے گھر آنے کا نشاں ہے اک ادائے خودسری
ہم نے سروں پہ روک لی بارش جبر اسی لیے

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

مرا بھی زخم طلب کام کر گیا ہوتا
وہ اس طرح سے اکیلا نہ مر گیا ہوتا
وہ اک ستارہ جو میرے لبوں پہ روشن تھا
کبھی تو میری رگوں میں اتر گیا ہوتا
شکستگی کا تو منظر بس ایک ہی رہتا
وہ شہر دل سے کھلے سر گذر گیا ہوتا
ہوا نشاطِ نم اشک کی یہ کہتی ہے
تو اور جیتا تو شعلوں سے بھر گیا ہوتا
زمیں کا فصل زمانے کے قرب سے کم ہے
وہ لمحہ کچھ مرے اندر بکھر گیا ہوتا

غزل

اب مجھ سے یہ رات طے نہ ہوگی
پتھر یہ جبیں نہ ہے نہ ہوگی

دروازہ کھٹک اٹھے گا اک بار
دستک کبھی پے بہ پے نہ ہوگی

خورشید نہ ہو تو شہر دل میں
پرچھائیں سی کوئی شے نہ ہوگی

آنکھوں میں لہو سنبھال رکھنا
اب کے مینا میں مے نہ ہوگی

مضراب کی اڑ گئی ہے خوشبو
تارِ رگِ گل میں لے نہ ہوگی

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

نقشِ پا دھندلی چمک دیکھ لوں آنکھیں رکھ دوں
برگِ یک خندہ نچوڑوں تو جگر تر کر لوں

سرخ اُبلتا ہوا خوں سب کو بھلا لگتا ہے
جب چھری اپنے ہی دل پر ہو تو کیسے دیکھوں

سینہ چور نگ اور اک گوشے میں مہتاب کی لَو
صبحِ کاذب کا ہے خواب اس کا بیاں کس سے کروں

ہاتھ رکھو تو اُبھر آئے خزانے کا نشاں
صد مژہ خون کی دولت سے ہے سینہ گلگوں

جو نہ توڑو تو مجھے شاخ پہ مرجھانے دو
نہ جسے دیکھیں تو گم ہو وہی خوشبو میں ہوں

کرشن موہن

نظمیں

پورتی

زندگی میں پیار اور ایثار سے
پورتی پانے کے بعد
موت آئے اس طرح
جس طرح پھل پیڑ سے گر جائے پک جانے کے بعد

دیوداسی پرتھا



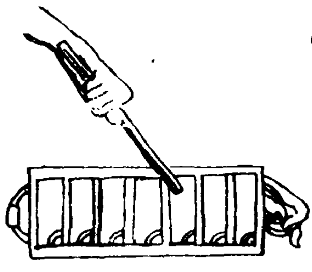
کچھ ایسے بگڑی
وہ ایشور پریت ریت بھارت میں کرشن موہن
کہ دیوتاؤں کی پرتیائیں
بنیں مہنتوں کی داشتائیں

سرد آہوں کا دھواں



اب ہمارے درمیاں
گفتگو سے بھی اہم ہے خامشی
خامشی جو ہے ہماری رازداں، محرومیوں کی داستاں
سرد آہوں کا دھواں
ابتدائے شوق میں تھے کس قدر پُرشور ہم، پُرجوش ہم
اختتامِ شوق میں ہیں کس قدر خاموش ہم

مزارِ بے حس



اَسوچ میں گم ہے ذہن کا ریگزارِ بے حس

- - - - - - - - - -

دلِ فسردہ
کبھی جو تھا جشنِ گاہِ رنگیں
ہے حسرتوں کا مزارِ بے حس

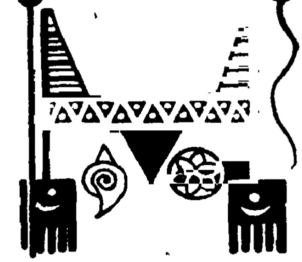
اداسی کا سبب کیا ہے



جوانی جا چکی زنجیرِ پیری ہے جسم اپنا
کہاں سے لائیں رنگیں صورتی اب ہم
علاوہ پورتی کے، اور اب دل کی طلب کیا ہے؟
اُداسی کا سبب کیا ہے؟

کوٹلیہ نے کہا

مچھلی جل میں رہتے رہتے
کب اور کِتنا پانی پی جاتی ہے
ہم کیا جانیں؟
ایسے ہی سرکاری افسر
کارِ منصب کرتے کرتے
کب اور کِتنا مال بچا جاتے ہیں
ہم کیا جانیں؟



ابھی تک

پیڑ بوڑھا ہو چکا ہے
لیکن اِس سے
۰۰ پنچھیوں کی چھیڑ جاری ہے ابھی تک
پیڑ کے دل میں بھی درد دبے قراری ہے ابھی تک

کرشنا مورتی

ہو گیا آلائشوں کا خاتمہ
ہے مہان اب تو ہماری آتما
مل گئی ہے پورتی
کرشن موہن سے بنے ہم آج کرشنا مورتی



کرشن موہن

غزل

لا اُبالی اور مچلی، منچلی آوارگی ـــ ہے کہاں اب وہ مری نازوں پلی آوارگی
خستگی و سرکہ جبینی ہو اگر طرزِ عمل ـــ ایسے شغلِ بے مزہ سے تو بھلی آوارگی
یاد آتی ہے بہت، عہدِ شباب و شوق کی ـــ رس میں ڈوبی، آرزوؤں میں ڈھلی آوارگی
گھومتا ہوں از سحر تا شام، نا واقفِ انام ـــ زندگی میری ہے پیہم ـــ بے کلی، آوارگی
دھوپ کو بھی چاندنی سمجھا ہوں فرطِ شوق میں ـــ ہے عجب یہ میری چنچل، باولی آوارگی
اور کوئی مسکنِ آوارگانِ غم نہ تھا ـــ شہر کے فٹ پاتھ پر پھولی پھلی آوارگی

کرشن موہن کو میسر ہے تمہارے شہر میں
ہر سڑک لطفِ تماشا، ہر گلی آوارگی

قطعہ

بہت بے کیف ہے یہ زیست کی شام ـــ نہ اِس میں آرزو کوئی نہ پیغام
اگر سچ پوچھئے تو کرشن موہن ـــ بزرگی بوریت کا دوسرا نام

راج نرائن راز

غزلیں

خاموش موج موج سمندر صدا کا ہوں
اظہار آپ سوچیے، کس کی ادا کا ہوں
شبنم صفت، میں سایہ کھیزی گھٹا کا ہوں
میں پہلا حرف، صبح کی پہلی دعا کا ہوں
میں جو چلوں تو پھول کھلاؤں طرف طرف
خوشبو تمام راز، میں جھونکا ہوا کا ہوں
مجھ سے نگار و نقش میں عالم عجب عجب
گوری ہتھیلیاں ہیں! میں بتا حنا کا ہوں
چاندی مرے وجود پہ بکھری ہوئی ہے راز
میں ایک عکس آئینہ ارتقا کا ہوں

کوئی پتھر ہی کسی سمت سے آیا ہوتا
پیڑ پھل دار میں اک راہ گزر کا ہوتا
اپنی آواز کے جادو پہ بھروسا کرتے
مور جو نقش تھا، دیوار پہ ناچا ہوتا
ایک ہی پل کو ٹھہرنا تھا، منڈیروں پر مجھے
شام کی دھوپ ہوں میں، کاش یہ جانا ہوتا
ایک ہی نقش سے سو عکس نمایاں ہوتے
کچھ سلیقے ہی سے الفاظ کو برتا ہوتا
لذتیں قرب کی، اے راز ہمیشہ رہتیں
شاخ صندل سے کوئی سانپ ہی لپٹا ہوتا

شفق شجر

ہری، سنہری خاک اڑانے والا میں
شفق شجر تصویر بنانے والا میں

باقی

غزلیں

ہاتھ تھے روشنائی میں ڈوبے ہوئے اور لکھنے کو کوئی عبارت نہ تھی
ذہن میں کچھ لکیریں تھیں، خاکہ نہ تھا، کچھ نشاں تھے نظر میں علامت نہ تھی

زرد پتے کہ آگاہِ تقدیر تھے، ایک زائل تعلق کی تصویر تھے
شاخ سے سب کو ہونا تھا آخر جدا، ایسی آندھی ہوا کی ضرورت نہ تھی

اک رفاقت تھی زہریلی ہوتی ہوئی، راستہ منتظر خود دوراہے کا تھا
پھر وہ اک دوسرے سے جدا ہو گئے، دونوں چپ تھے کہ دونوں کو حیرت نہ تھی

ایک آراستہ گھر میں کب سے تھا میں، ایک صد برگ منظر میں کب سے تھا میں
میری خاطر تھیں کیا کیا ہنر کاریاں! اک نظر دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی

آج رکھا ہے لمحہ ترے ہاتھ پر، لمسِ اوّل کی لذت کو محفوظ کر
کل نہ کہنا فلک خوش تعاون نہ تھا، کل نہ کہنا زمیں خوبصورت نہ تھی

کتنا پانی بہا لے گئی ہے ندی! کتنے منظر اڑا لے گئی ہے ہوا
اک خزانہ کہ اب تک نہ خالی ہوا، اک زیاں تھا کہ جس کی شکایت نہ تھی

ایک اک لفظ کے سینۂ زرد سے فصلِ صد رنگ معنی اگانا پڑی
اپنی تقدیر میں کوئی ورثہ نہ تھا! نام اپنے بھی کوئی وصیت نہ تھی

گھنی گھنیری، رات سے ڈرنے والا مَیں
سنّاٹے کی طرح بکھرنے والا مَیں
جانے کون اُس پار بُلاتا ہے مجھ کو
چڑھی ندی کے بیچ اُترنے والا مَیں
رُسوائی : تو رُسوائی منظور مجھے
ڈرے ڈرے سے پاؤں نہ دھرنے والا مَیں
مرے لیے کیا چیز ہے تجھ سے بڑھ کر یار
ساتھ ہی جینے ساتھ ہی مرنے والا مَیں
سب کچھ کہہ کے توڑ لیا ہے ناتہ کیا
میں کیا بولوں بات نہ کرنے والا مَیں
طرح طرح کے ورق بنانے والا تُو
تری خوشی کے رنگ ہی بھرنے والا مَیں
دائم، ابدی، سمے گزرنے والا تُو
منظر، سایہ دیکھ ٹھہرنے والا مَیں

باقی

موڑ تھا کیسا، تجھے تھا کھونے والا میں
رو ہی پڑا ہوں کبھی نہ رونے والا میں
کیا جھونکا تھا، چمک گیا تن من سارا
پتہ نہ تھا پھر راکھ تھا ہونے والا میں
لہر تھی کیسی، مجھے بھنور میں لے آئی
ندی کنارے، ہاتھ بھگونے والا میں
رنگ کہاں تھا، پھول کی پتّی پتّی میں
کرن کرن سی دھوپ پرونے والا میں
گیا دن بیتا، آنکھ میں پھرتا ہے سب کچھ
جاگ رہا ہوں مزے میں سونے والا میں
شہرِ خزاں ہے، زردی اوڑھے کھڑے ہیں پیڑ
منظر منظر، نظر چبھونے والا میں
جو کچھ ہے اِس پار وہی اُس پار بھی ہے
ناؤ اب اپنی آپ ڈبونے والا میں

باقی

ساجدہ زیدی

غزل

بوندوں کی رم جھم پر ناچی ساون کی متوالی رات
کتنی تنہا، کتنی بھیانک، ڈس لے گی یہ کالی رات
جھل مل، جھل مل، جگ مگ، جگ مگ، ہر آنسو اک جلتا دیپ
فرقت کی سونی نگری میں یادوں کی دیوالی رات
بھاگتے لمحے کہہ نہ سکیں گے، تم ہوتے تو ہم کہتے
کتنے سونے دن ہیں کتنی خالی خالی رات
میرے لہو کے دیپ جلائے میری وفا کے پھول سجائے
تیری انگنائی میں لیے ہے چاند کی پیلی تھالی رات
میخانے کا حال بُرا تھا، آنکھیں نم لب پر مسکان
یاد رہے گی زیدی برسوں ایسی بھولی بھالی رات

مخمورسعیدی

غزل

راتوں کا اندھیرا ہی اب دن کا اُجالا ہے
اَے شہرِ ہوس تیرا سورج بھی تو کالا ہے
اُمید کے سب رشتے ہیں دل سے بس اک پل کے
اس شاخ سے یہ طائر اب اُڑنے ہی والا ہے
قسمت کی لکیریں بھی اِس طرح ہوئیں زخمی
گرتے ہوئے اک گھر کو ہاتھوں پہ سنبھالا ہے
سورج کی بلندی سے کچھ سنگِ صدا پھینکو
یوں رات کا سناٹا کب ٹوٹنے والا ہے
مٹ مٹ کے ابھر آئے کچھ اور نکھر جائے
تصویرِ تمنا کا ہر رنگ نرالا ہے
اشکوں کے دیے سونے طاقوں پہ نہیں رکھ دیں
ویران بہت دن سے یادوں کا شوالا ہے
اُس نے مری لغزش پر ہنس کر مجھے کیا دیکھا
احساس کے تلووں سے کانٹا سا نکالا ہے
خود اپنا لہو پینا، مرنے کے لیے جینا
اے ہمنفسو تم نے کیا روگ یہ پالا ہے
مخمورؔ! یہ مورت کس مندر سے نکل آئی
چاندی کا بدن، سر پر سونے کا دوشالا ہے

مخمور سعیدی

غزلیں

نہ رستہ نہ کوئی ڈگر ہے یہاں
مگر سب کی قسمت سفر ہے یہاں

سنائی نہ دے گی دلوں کی صدا
دماغوں میں وہ شور و شر ہے یہاں

چھڑی ہے بہم سرخ روئی کی جنگ
لہو میں ہر اک چہرہ تر ہے میاں

زباں پر جسے کوئی لاتا نہیں
اُسی لفظ کا سب کو ڈر ہے یہاں

یہ شہرِ ہوس ہے کہ زندانِ روح
فضا میں گھٹن کس قدر ہے یہاں

جیے جائیں گے جھوٹی خبروں پہ لوگ
یہی ایک سچی خبر ہے یہاں

ہواؤں کی اُنگلی پکڑ کر چلو
وسیلہ یہی معتبر ہے یہاں

اُدھر کس لیے کوئی جاتا نہیں
اکیلی سی اک رہگذر ہے یہاں

تو اِس ڈر سے آگے بڑھو گے نہ تم
کہ اک خطرہ ہر موڑ پر ہے یہاں

نہ اِس شہرِ بے حس کو صحرا کہو
سنو! اک ہمارا بھی گھر ہے یہاں

پلک بھی جھپکتے ہو مخمورؔ کیوں؟
تماشا بہت مختصر ہے یہاں

پار کرنا ہے ندی کو، تو اُتر پانی میں
بنتی جائے گی خود اک راہگذر پانی میں

بادباں تیرا بنے، تیز ہوا کی چادر
کشتیِ موجِ رواں پر ہو سفر پانی میں

ذوقِ تعمیر تھا ہم خانہ خرابوں کا عجب
چاہتے تھے کہ بنے ریت کا گھر پانی میں

سیلِ غم آنکھوں سے سب کچھ نہ بہا لے جائے
ڈوب جائیں نہ یہ خوابوں کے نگر پانی میں

کشتیاں، ڈوبنے والوں کے تجسس میں نہ جائیں
رہ گیا کون، خدا جانے کدھر پانی میں

تو شناور ہی سہی، وقت کے طوفانوں کا
تندیِ موجِ بلاخیز سے ڈر پانی میں

اب جہاں پاؤں پڑے گا، یہی دلدل ہوگی
جستجو خشک زمینوں کی نہ کر پانی میں

موج در موج، یہی شور ہے طغیانی کا
ساحلوں کی کسے ملتی ہے خبر پانی میں

خود بھی بکھرا وہ، بکھرتی ہوئی ہر موج کے ساتھ
عکس اپنا اُسے آتا تھا نظر پانی میں

کھیل، میرے لیے موجوں کا تعاقب مخمورؔ
میں اُتر جاؤں گا بے خوف و خطر پانی میں

ایم۔ قمرالدین

غزلیں

کیا فرق ہے یارو بتلاؤ، اک بوند ہیں یا سیلاب ہیں ہم
اوروں کے لیے تو امرت ہیں، اپنوں کے لیے زہراب ہیں ہم
کچھ ایسے ہی اسباب تھے وہ، جن سے ہم باقی ہیں اب تک
اور جن سے آپ ہی مٹ جائیں، کچھ ایسے ہی اسباب ہیں ہم
"ہم خوش پوشوں" کی محفل میں، اکثر یہی ثابت ہوتا ہے
انسان بلا سے ہوں کہ نہ ہوں بس ریشم اور کمخواب ہیں ہم
چند ایک برہنہ لفظوں کا، ہر دم یہ تقاضا ہے مجھ سے
ہم کو بھی سمو لو شعروں میں، اک مدت سے بیتاب ہیں ہم
ہر شب کو روشن کرنے میں، اپنا حصہ بھی کم تو نہ تھا
لیکن جو نظر سے اوجھل تھے، وہ کم قسمت مہتاب ہیں ہم
نکلے کاغذ کے پھول فقط، نزدیک سے جب دیکھا ان کو
ہر لحظہ رہا جن کا دعویٰ، شاداب تھے ہم شاداب رہیں ہم

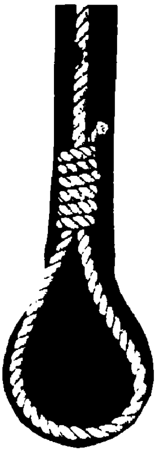
۲

یہی محفل جو کہیں ایک بیاباں ہوتی — بیشک اس میں بھی کوئی چیز غزلخواں ہوتی
ایک بار ایسی بھی ہستی سے ملا ہوں یارو — کہ جو کچھ اور بھی ہوتی تو دبستاں ہوتی
مری آنکھیں نہ کھلیں ورنہ مری راتوں میں — ایک جگنو کی چمک ایک چراغاں ہوتی
زندگی اپنی پریشاں ہے، تمنا ہے مگر — زندگی اپنی ذرا اور پریشاں ہوتی
ایک ہی شکل نظر آتی ہے آئینے میں — کاش ہر شکل مری اس میں نمایاں ہوتی



ہماری ملاقات جسموں سے شروع ہوئی
پھر ہم نے جسموں کے آگے بہت سی باتیں دریافت کیں
دُکھ سُکھ کی بستی میں
ایک چھوٹا سا گھر بنایا
ناریل کے درختوں کے درمیان
مغربی ساحل پر ——

مصطفیٰ اقبال صدیقی



★

تم جو مجھے اتنا چاہتی ہو
یہ کیسی خواہش ہے
کہ میں شیشے کی طرح نرم و نازک ہو جاؤں
ڈرائنگ روم کا ایک کونہ ——
شیشے کی دیواروں میں
پانی کی سطح کاٹتی ہوئی
رنگ برنگی مچھلیاں
اور تم اپنی حنا بستہ انگلی اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکو

تم بھی پتھر بن جاؤ

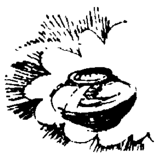
"وہ ..... اُدھر ..... یہ دیکھئے"
(میری نیکیاں، میری خوبیاں)
نہیں .... نہیں ....
میں جو پتھر ہوں
میں تو یہ چاہتا ہوں
کہ اس گھر کو اپنی باہنوں کے گھیرے میں لے کر بلند ہو جاؤں
بہت بلند ...
مگر اس سے بھی کیا ہوگا
میں تو یہ کہتا ہوں
تم بھی پتھر بن جاؤ
تاکہ جب وہ زلزلہ آئے
(جسے آنا ہی ہے)
تو تمہیں چوٹ نہ لگے !!



دس کروڑ برسوں میں



مصحف اقبال توصیفی



دس کروڑ برسوں میں
پہلا واقعہ تھا یہ
بستیوں کے کالے دیو
اک سنہرے جنگل کو
دو مہیب دانتوں میں
داب۔ رقص کرتے تھے
تیرگی کے پاؤں میں
روشنی کے گھنگرو تھے
سبز ہوا، سیہ بادل
آسماں کے کونے میں
بیٹھے۔ دف بجاتے تھے

ساحلِ سمندر پر
ایک پیلِ ماہی نے
شور جب بڑھا۔ دیکھا
تو تھنی کو نیوڑھا کر
پہلے ریپ کا منظر

دس کروڑ برسوں میں
پہلا واقعہ تھا ــ یہ
پہلی بار اک جیوان
اپنی پچھلی ٹانگوں پر
جب کھڑا ہوا سورج
چاند اور ستاروں نے
اس زمیں کی بیٹی کو
اپنی اپنی کرنوں کے

زیورات پہنائے
سرخ سبز لمحوں کے
پھول۔ پات پہنائے

سفید تحریر

آؤ
بچپن کی اُن سنہری وادیوں میں چلیں
شاید وہاں میرے خوبصورت بھتیا مل جائیں
دو ننھے ننھے قدموں کے نشان
گھاس پر موجود ہوں
ایک رومال ۔
جس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں پنسل سے میں نے اپنا نام لکھا تھا
اور باجی نے سرخ اور نیلے ریشم سے کاڑھا تھا

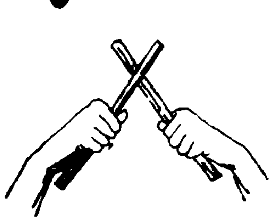
باجی — جو، اب ہزاروں میل دور ہیں
سنا ہے اُن کے بالوں میں ایک سفید تحریر آگئی ہے
تو ان سے کہیں " باجی ، ایسا ہی ڈھیروں سفید ریشم ہمیں لے دیجئے
سرخ اور نیلے رنگ تو کہیں کھو گئے "

سفید رنگ جسے زندگی کے ساتوں رنگ درکار ہیں

شاید کمیاب ہے
میرے ذہن میں ایک تصویر بنتی ہے
ڈبّو مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے ۔
ہر طرف سکون ہے
اور خاموشی

"یہ آپ کیا سوچ رہے ہیں"
وہ اچانک آجاتی ہے
اور میں اُس کے ہات، ہاتوں میں لے کر
ہنسنے لگتا ہوں ۔

مصحف اقبال توصیفی



مصحف اقبال توصیفی

یلدا



عجیب رات تھی
روشنی کی اک دراڑ میرا جسم چیر کر
شکن شکن مرے لباس ، نیند کی رِدا ، پلنگ ، کرسیاں
خواب گہ کے فرش کو دو نیم کر گئی
میں تیری روشنی میں سر بسر نہا گیا
مرے خدا —
میں آ گیا !!

عجیب صبح تھی
ہزار زائرین جمع تھے مرے مزار پر
وہ اپنی اپنی آرزوؤں حسرتوں کی چادریں لیے
عقیدتوں کے پھول مجھ پہ پھینکتے ہوئے
وہ تجھ سے بھیک مانگتے رہے ۔ مرے دیار پر
وہ لوگ جو تری اَنا کا جادہ تھے
وہ لوگ کتنے سادہ تھے
میں چُپ رہا
تو کیا یہی مری تمام عمر کی کمائی تھی
یہی تھا ۔ اے خدا
مرے وجود کا صلہ ؟ !!

غزل

مجھے ڈر ہے تری ۔ آئیں کہیں پہچان لیں مجھ کو
سرہانے خواب کی شمعیں جلانے ، میں نہ آؤں گا
مرا اِک غم ہے ، اُس کی پائنتی بیٹھا رہوں گا میں
میں گھر ہی سے نہ نکلوں گا ۔ میں دفتر بھی نہ جاؤں گا
سہارا دو ، اگر اس پیڑ کی چھاؤں میں بٹھلا دو
اب ایسا لگ رہا ہے میں زیادہ چل نہ پاؤں گا
اگر سورج سے اتنی دور ۔ اتنی دور ہو جاؤں
تو میں شام و سحر کے دائرے میں بھی نہ آؤں گا
بھلا بتلائیے اِن کے تجسس کی کوئی حد ہے
یہ میرا راز ہے ، تم کون ہو ، میں کیوں بتاؤں گا؟

غزل

میں ریزہ ریزہ بکھر جاؤں گا سنبھال مجھے
نگاہ سے نہ گرا، دل سے مت نکال مجھے

میں بے ادب کوئی ٹیڑھا سوال کر بیٹھوں
تو اپنی جود و سخا کے کنویں میں ڈال مجھے

نگاہ تو نے جھکا لی تو چپ رہا ورنہ
ابھی تو کرنے تھے تجھ سے کئی سوال مجھے

وہ آندھی آئی وہ اک نیند کا کوا اڑ گیا
یہ کیسے خواب میں آنے لگے خیال مجھے

یہی زمیں مری دوزخ ہے میری جنت بھی
میں تھک گیا ہوں بہت، حشر پر نہ ٹال مجھے

مصحف اقبال توصیفی

غزل

جانے کیا کہتا تھا، اُس نے رکھ دیا ہونٹوں پہ ہات
میں بھی ہوں کیسا دوانہ، یاد آئی کب کی بات

سب مجھے پاگل کہیں گے، میں ہنسوں گا من ہی من
میں رہوں گا ساتھ تیرے، جب نہ ہوگا تیرا سات

آ، ادھر آ، یوں مری بربادیوں کا غم نہ کر
کھیل ہیں سب زندگی کے، جیت کیسی، کس کی مات

میں نے مکتب ہی میں وہ ساری کتابیں پھاڑ دیں
تیری اس دنیا کے نقشے پہ اُلٹ دی تھی دوات

سچ تو یہ ہے شعر مصحفؔ کے ہمیں اچھے لگے
نام لیجے اور ایسے شاعروں کے پانچ سات

چناب ندی کا قصیدہ

سر شور چناب! اوتار مرے
مرے موہن ساگر، سیارّے
تری گھوکر جیون کا سرگم
تری لہر لہر، برہم برہم

جب اتروں کھول کے پیراہن
ترے پانی گلے ملیں مجھ سے
تری ٹھنڈک سپنے ساون کے
تری مہک محبت کی برکھا
ترے جل تھل جل تھل منظر سے
مری باہوں میں گدگدی سی ہو
مرے تلووں میں دو پھول کھلیں
مرے پاگل وحشی بنجارے
سوگند مجھے ترے زمزم کی
تو آہو سبز زمینوں کا
تو زائر پاک مدینوں کا
تو شوخ مسافر بیلوں کا
تو شاہد موج کے میلوں کا
تری چال میں مستی موروں سی
تری دہشت اتھرے ڈھوروں سی

تو کھلی کتاب عجائب کی
ترا ورق ورق طوفان لگے
تری کتھا میں زہریں شہد بھری
تو نفس نفس انسان لگے
میں زرد کنارے کا پتھر
مرا بدن ببولوں کی ڈالی
مجھے امرت دے مجھے زہر پلا
مرا جسم ہے اندر سے خالی

تو ہری کچور پہاڑی کے
برباد شوالوں کا وارث
بچھڑی ہوئی کونجوں کا مسکن
بھٹکے ہوئے بگلوں کا دریا

سر شور چناب اوتار ہے تو
او یار! عجب شہکار ہے تو

مسعود منوّر

عرشؔ صہبائی

غزلیں

(۱)

جنبش ترے ہونٹوں کی ہوں آنکھوں کی زباں ہوں
میں رنگِ تغزّل ہوں کہیں حسنِ بیاں ہوں

جب سے اسے دیکھا ہے عجب حال ہے اپنا
یہ بھی نہیں معلوم یقیں ہوں کہ گماں ہوں

کتنے ہی مراحل سے گزرتا ہوں شب و روز
میں قطرۂ شبنم ہوں کبھی سنگِ گراں ہوں

کس گھاٹ اترنا ہے مجھے یہ نہیں معلوم
کاغذ کی ہوں اک ناؤ سمندر میں رواں ہوں

بے ساختہ آنکھوں میں امڈ آئیں گے آنسو
دیکھو نہ مری سمت کہ یادوں کا دھواں ہوں

اک ربطِ مسلسل پہ بھی ہم مل نہیں سکتے
تم ساحلِ مقصود ہو میں آبِ رواں ہوں

اس دور میں کوئی بھی نہ سمجھے گا مجھے عرشؔ
میں حق کا پجاری ہوں محبت کی زباں ہوں

(۲)

اس کے ہر منظر پہ مٹ جا، اس کا پس منظر نہ دیکھ
زندگی اک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

غم کے سورج کی تمازت سے پگھل جائیں گے یہ
راحتوں کے عارضی سے خوش نما پیکر نہ دیکھ

تیرے ہر نغمے کی لے میں جذب ہے میرا وجود
میں فقط آواز ہوں آواز کو چھو کر نہ دیکھ
اک جھلک اپنی دکھا کر ڈوب جانا ہے انھیں
آسماں پر جگمگاتے یہ مہ و اختر نہ دیکھ
درہم و برہم نہ ہو جائے کہیں دل کا سکوں
خواہشوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر باہر نہ دیکھ
تیرا فن ہے نغمہ سازی، ساحری تیرا ہنر
دل میں جو پیوست ہیں ٹوٹے ہوئے نشتر نہ دیکھ
اک سکوتِ بے کراں کے کرب کو محسوس کر
پھینک کر خاموش پانی میں کبھی پتھر نہ دیکھ
وہ حسیں یادیں تجھے کچھ اور تڑپائیں گی عرشؔ
آب دیدہ ہو کے ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھ

(۲)

دل میں ہیں جذب غم و درد کے پیکر کتنے
ایک قطرے میں سمائے ہیں سمندر کتنے
سعیِ پروازِ بشر کر گئی پامال انہیں
خود پہ مغرور تھے ورنہ مہہ و اختر کتنے
اپنی آنکھوں سے لگایا انھیں پھولوں کی طرح
حق پرستوں پہ برستے رہے پتھر کتنے
در و دیوار سے پوچھا ہے تعارف اپنا
اپنے گھر میں ہیں مگر پھر بھی ہیں بے گھر کتنے
عرشؔ کیا دل میں سمائی کہ کریں اسکی تلاش
اپنی ہی ذات سے ہم رہ گئے کٹ کر کتنے

سطح پر گمنام میلی چادریں رہ جائیں گی
نیکیاں اک شخص کی دریاؤں میں رہ جائیں گی
جھاڑی جھاڑی اک پلنگِ نیم خفتہ کا ہے خواب
دُور کتنی دہشتوں کی سرحدیں رہ جائیں گی
سب چلے جائیں گے نامعلوم سمتوں کی طرف
بس فضا میں پھڑپھڑاتی دستکیں رہ جائیں گی
عکس کھینچے گا نہاتے جسم کا آبی فلک
اور تہوں میں کالی پیلی عورتیں رہ جائیں گی
روشنیوں میں ٹٹولو گے سوادِ جسم کو
آنکھ میں اندھے سفر کی رونقیں رہ جائیں گی

مصور سبزواری

غزل

تجربہ رنگوں کا مت کر باندھ کر تتلی کے پر
ٹوٹ کر ہاتھوں میں پھولوں کی رگیں رہ جائیں گی
ایک شائستہ رقابت جنم لے گی میرے بعد
میرے دشمن میں بھی میری عادتیں رہ جائیں گی
چھینتی جائیں گی نشیبوں میں حسیں چرواہیاں
اب یہاں ننگے پہاڑوں کی صفیں رہ جائیں گی
آخری منظر پہ میں نے پی لیا تھا اک شراب
ہر سمندر میں مری نیلاہٹیں رہ جائیں گی

دو بدن بے لمس کپڑوں کی طرح رہتے رہے
عمر بھر تائب فرشتوں کی طرح رہتے رہے
منتظر دہلیز کتنی بار آکھڑی کیا خبر
ہم تو بس سوکھے کواڑوں کی طرح رہتے رہے
قربتیں محتاط، بداندیش تھیں نزدیکیاں
دوست کچھ دشمن قبیلوں کی طرح رہتے رہے

مصور سبزواری

غزل

اس گلی کا یہ المیہ تھا کہ ہم تم پاس پاس
کچے پکے دو مکانوں کی طرح رہتے رہے
کس سے کس کا کیا تعلق تھا نہ کھل پایا کبھی
گھر میں سب انجان رشتوں کی طرح رہتے رہے
بند کمرے کی گھٹتی تنہائی مصور راس تھی
میر تے ہم بد دماغوں کی طرح رہتے رہے

علیم صبا نویدی

غزل

جلتا ماضی مرے احساس کے اندر نہ اُتار
ایک قطرہ ہوں میں تُو مجھ میں سمندر نہ اُتار

میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر
میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اُتار

میرے اظہار کے قطرے کو گہر ہونے تک
میرے گھر مجھ سا کوئی اور پیمبر نہ اُتار

میں وہ شعلہ ہوں کہ جس میں نہیں اک بوند لہو
میرے سینے میں سُلگتا ہوا خنجر نہ اُتار

چپ کی بنیاد ہی رکھ دے مری سانسوں پہ مگر
سب کے آگے مرے اعمال کا دفتر نہ اُتار

بجھتی تنہائی کے پیکر کو سجانے کے لیے
چاند تاروں سے کبھی نور کا زیور نہ اُتار

اور بھی گھر ہیں بھرے شہر میں برباد صبا
ہر تجلّی کا صحیفہ مرے گھر پہ نہ اُتار

علیم صبا نویدی

غزل

پیڑ بیوہ ہو گئے ہیں پتّیاں سب اُڑ گئیں
رنگ برنگے موسموں کی دھجّیاں سب اُڑ گئیں

نفرتوں کی آنچ چھونے لگ گئی ہے آسماں
جب سے دل کے ہاتھ سے ہمدردیاں سب اُڑ گئیں

بلبلوں کا چہچہانا ہے نہ کھیتوں کی قطار
کیا لگا کر پنکھ اپنی بستیاں سب اُڑ گئیں

اس قدر اونچی ہوئی ہیں آدمیت کی لویں
آسماں کی سمت ہی پرچھائیاں سب اُڑ گئیں

دفن جب سے ہو گئی ہیں عظمتیں پہچان کی
چاہتیں ہیں خشک، رشتہ داریاں سب اُڑ گئیں

کل تلک تھی حکمرانی تیرگی کی ہر طرف
روشنی آتے ہی گھر کی پستیاں سب اُڑ گئیں

ہر نئے دن دھوپ کی کرنوں سے مل کر کیوں صبا
سانوری آنکھوں سے شب کی مستیاں سب اُڑ گئیں

علیم صبا نویدی

غزل

بدن میں ہوں بدن سے دور ہوں میں
نصیب آور فضا کا نور ہوں میں

تنزل سے مرا کیا واسطہ ہے
ترقی یافتہ، بھرپور ہوں میں

اکیلے پن میں جلتے کوہسار و
مجھے چھولو گھٹا گھنگھور ہوں میں

بڑی ہی قدر زا ہے اجنبیت
وطن سے دور ہی مشہور ہوں میں

چُرا لے جائے گا آئینہ مجھ کو
کہ اپنے آپ میں مستور ہوں میں

ہر اک ہمت مری گردوں شکن ہے
مجھے پڑھ لو نیا دستور ہوں میں

سکوت افروز موسم میں نہ کھینچو
قلم کی مستیوں میں چور ہوں میں

سمٹنا مجھ کو سکھلادے نویدی
کہ اس پھیلاؤ سے رنجور ہوں میں

علیم صبا نویدی

غزل

میں جب نکل گیا اپنے وجود سے باہر
سفر تھا میرا سمجھ کی حدود سے باہر

پنپ سکے گا نہ اظہار آفریں احساس
نکل بھی آ تو نگاہِ حدود سے باہر

فنِ دماغ کی لَو سے افق کو چھولوں گا
اگر نکال لوں خود کو جمود سے باہر

شکستہ نبض، چکیدہ لہو، فسردہ سانس
کوئی نکالے مجھے ان قیود سے باہر

فرازِ عرش کی پلکوں پہ منجمد ہے لہو
صبا جو ہوگئے ذوقِ سجود سے باہر

١

میزان میں ہوس کی وفا تولتا رہا
پانی میں بوند بوند لہو گھولتا رہا

آنکھوں میں اس نے ڈال دیں آنکھیں تو دیر تک
آئینہ آئینے کی قبا کھولتا رہا

طوفاں میں بھی وہی تھی رفاقت کی سادگی
کشتی کے ساتھ دل بھی مرا ڈولتا رہا

انجام سے بھی خوب تھی انجام کی کشش
آغاز کی منڈیر پہ پر تولتا رہا

تنہائیوں میں سہہ نہ سکا خامشی کی چوٹ
اشکوں کی لے میں دل کا لہو بولتا رہا

ملبوسِ شعر میں بھی مرے راز فاش تھے
راہی میں موتیوں کو کہاں رولتا رہا

کنور سین

غزل

غزل

بہت قریب ہے میرے بہت ستائے گا
اکیلا پا کے تو مجھ کو نگل ہی جائے گا

نہ باز آئے گا اب آئینہ دکھائے گا
میں جانتا تھا یہ لمحہ لہو رلائے گا

ندی پکارتی رہتی ہے بازو پھیلائے
ذرا رکوں تو سمندر مجھے بلائے گا

عجب کرشمے دکھائے گی رت کی تبدیلی
مرا وجود بھی مجھ سے نظر چرائے گا

نہ راس آئے گا تجھ کو یہ دائروں کا سفر
مجھے یقین ہے تو کل ہی لوٹ آئے گا

جو شخص پی گیا چپ چاپ زہر دھرتی کا
وہ آسماں پہ کہیں دور جھلملائے گا

تمام شہر تو بے حس ہے پھر بھی ہے یہ یقیں
کوئی تو ہوگا جو قندیلِ غم جلائے گا

غزلیں

اقبال عمر

(۱)

ہر صبح اپنے گھر میں ، ہر رات اپنے گھر
ہونا تھی کیا ہوئی ہے کیا بات اپنے گھر میں

اوہام اپنے گھر میں آفات اپنے گھر میں
ہو کیوں نہ آنسوؤں کی برسات اپنے گھر میں

ہم جانتے ہیں اپنی اوقات اپنے گھر میں
لاتے نہیں ہیں کوئی سوغات اپنے گھر میں

دنیا میں کتنے رستے ہیں کتنی منزلیں بھی
ہے کیا سبب جو آئے ہر رات اپنے گھر میں

باغوں میں اور کچھ تھے رستوں میں اور کچھ تھے
کچھ اور ہو گئے ہیں جذبات اپنے گھر میں

نیرنگیٔ جہاں کو ہم خوب جانتے ہیں
اک ذات گھر سے باہر اک ذات اپنے گھر میں

سر کس جگہ جھکا ہے دل کس جگہ دکھا ہے
سب کچھ کہیں گے تجھ سے اے رات اپنے گھر میں

کچھ کھیل ایسے کھیلے اقبال زندگی نے
صدیوں کی طرح گزرے لمحات اپنے گھر میں

(۲)

وہیں رکے ہیں جہاں موڑ داستان کا تھا
وہ فاصلہ ہی رہا ہے جو درمیان کا تھا

اسی دیار میں ہم نے بھی دن گزارے ہیں
خیال سب کو جہاں اپنی آن بان کا تھا

ہمارے پاؤں کے نیچے زمین ایسی تھی
قدم قدم پہ گماں جس پہ آسمان کا تھا

اسی لیے تو لہو رو کے بھی ہنسی آئی
میں جانتا ہوں کہ وہ تیر کس کمان کا تھا

اڑا کے لے گئیں وحشی ہوائیں اس کو بھی
وہ سائباں نہیں دھوکا تو سائبان کا تھا

ادھر بھی آئے تھے ارجن کے بان کی صورت
سمجھ لیا ہے اشارہ جو مہربان کا تھا

چمن میں غنچہ و گل کی شگفتگی دیکھی
پھر اس کے بعد جو کھلنا تری زبان کا تھا

نگارِ صبح کے ہمراہ بن سنور کے گیا
وہ رہنے والا جو اجڑے ہوئے مکان کا تھا

ہماری ہمتیں اقبال ہم کو لے آئیں
ادھر تو رخ نہ ہوا کا نہ بادبان کا تھا

سلطان اختر

غزل

سمٹ رہنا یہاں دشوار تر ہے
کہ ہر لمحہ بکھر جانے کا ڈر ہے
کھڑا ہے سامنے چپ کا جزیرہ
صداؤں کا سمندر پشت پر ہے
پگھلتا جا رہا ہوں لمحہ لمحہ
کئی شانے ہیں لیکن ایک سر ہے
یقیں کا ذائقہ بدلے نہ بدلے
ہمارا عہد لیکن معتبر ہے
کسی سے اس جنم میں ملے نہ ہوگا
کئی صدیوں سے یہ لمبا سفر ہے
میں اپنے آپ سے خائف ہوں اختر
مرا چہرہ صداقت کا کھنڈر ہے

سلیم شیرازی

غزل

ہواؤں کی عنایت پر نہ رہیو
سُلگ لیجو دِیا بن کر نہ رہیو
سمندر خشک ہو جاتا ہے اک دن
سمندر کے سہارے پر نہ رہیو
ہمیں تو راس آئی ہے فقیری
میاں تم آئینہ بن کر نہ رہیو
نہ جانے آستیں کب پھن اٹھائے
کہیں بھی جاؤ بے خنجر نہ رہیو
کسی صورت بھی کر لیجو گذارہ
پر اپنے پن کے سوداگر نہ رہیو
بھرم کے ساتھ بہہ جائے گا سب کچھ
میاں برسات کی زد پر نہ رہیو
کہیں جنگل بسا لیجو بسیرا
ہوا ہو گرم تو گھر پر نہ رہیو



مُکتی

ایک سوال



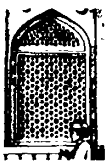
وہی آنگن ہے
اور
وہی دیوار
عشق پیچاں کی بیل بھی ہے وہی
ویسے ہی محراب سے لپٹی ہوئی
مگر وہ پھول
جو دریچے کی جان و ایمان تھا !
کیوں
کہیں بھی
نظر نہیں آتا
کیوں، کہیں بھی نظر نہیں آتا !!

مُکتی

خدا



خُدا !
جو اختراع ہے ذہنِ مشرق
آج مغرب کا آقا ہے
مشرق کا کچھ بھی نہیں !



اُتر اور دکھن
دونوں
محفوظ ہیں مُٹھی میں اُس کی
جیسے ماں کی کوکھ میں
نازائیدہ بچہ



★★

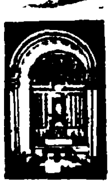


مشرق، جہاں وہ پیدا ہوا تھا
اس کا تو گھر ہے
اس کے محبوب کا گھر نہیں ہے

★★★

وہ جو خود
حُسن کا پیکرِ بے کراں ہے
مشرقی نازنینوں کے
ڈھیلے اور کالے بدن
اُسے بھاتے بھی کیوں !!!





مُکتی

ایکٔ ایکٔ دوٗ گیارہ"



پتھر ہم نے دو ہی پھینکے تھے
لیکن پھل
دس پانچ گرے ہیں
وہ بھی سب ..... سارے کے سارے
پردیسی کے آنگن میں
خوشی تو تھی ہی
دہشت بھی تھی
نیا پڑوسی ، پردیسی تھا
سُن رکھا تھا
ہم سب نے
وہ خونخوار شکاری ہے
اور اس کے برناڈی کتے
شیروں سے بھی بھڑ جاتے ہیں
بچّوں کو تو کھا جاتے ہیں !
چھوڑو
ان کو گولی مارو
کچے پھل ہیں
جو کھائے گا ، پیٹ میں اس کے درد اٹھے گا
کچّے پھل بھی شے ہیں کوئی
جن کی خاطر
کچّے دھاگے سے لٹکی ہوئی اس تلوار کے نیچے جائیں

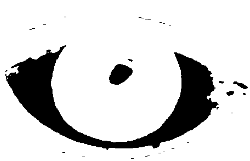
★★★

تب اس گھر کی کھڑکی سے جھانکیں
آنکھیں اُس پردیسی کی
لال رنگ تھا ان کا
لیکن



رحم تھا ان میں، درد تھا ان میں
رو رو کر جیسے" ہلکان ہوئی ہوں
یا
سونے پن میں، ایک ہی سمت گھورتے گھورتے
حیران و پریشان رہی ہوں
پردیسی نے پیار سے ہم دونوں کو بلایا
مجھ سے پھر وہ پیار سے بولا
"تو ہی اٹھالے، پھل یہ سارے، آخر یہ سب شکار ہیں تیرے"
میں نے جتایا

اک پتھر میں نے پھینکا تھا، اک رادھا نے
کس پتھر سے کتنے پھل ٹوٹے ہیں...... نہ میں نے دیکھا نہ رادھا نے
پردیسی نیچے آپہنچا
اک اک کرکے جمع کیے سارے پھل اس نے
"ارے یہ تو گیارہ ہیں....... اور تم دو ہو
ہم حیران تھے
پھر وہ ہنس کر بولا : " الگ الگ کی بات نہیں ہے
دو قالب اک روح کے ناتے ــــ
ایک اور ایک گیارہ بھی ہوتے ہیں

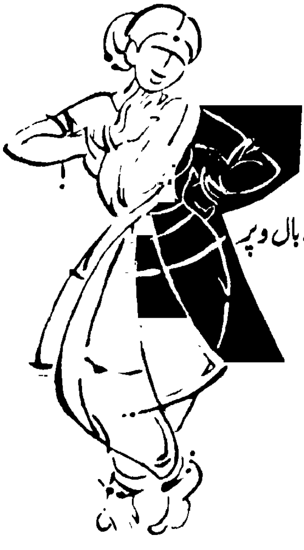


مُکتی

گیت گوبند

وہ منتظر ہے ترا
کدم کا پیڑ...... کہ جس کی نرم چھاؤں میں
تو ہر روز
مری گود میں
آنکھیں موند کر سنا کرتی تھی
کنہیا کی وہ بانسری
جو الاپتی تھی ہر شام ، ہر شب
گیت گوبند — جسے کاہن کے رسیا جے دیو نے خونِ دل سے لکھا تھا
اور جسے سُن کر
کوئی پریمی جوڑا
آج بھی سما جاتا ہے اک دوسرے میں
اور اسے پھر کسی گیت کی آرزو نہیں رہتی۔

★



اب ہم تم نہیں ہیں
تو کدم نے بھی ماتم میں کٹوا لیے ہیں اپنے گھنے ہریالے بال و پر
اور منڈ منڈ کھڑا
گنجا بھکشو
لٹکائے شانوں سے اپنا کشکول
سہم کر ، جھجک کر
ٹھنڈی سانس بھر کر دعا مانگتا ہے
تتھاگت سے اپنے
"چھٹے یہ تیرگی اور چمکے گگن میں کہیں کوئی روشن ستارہ



کوئی دیا ، کوئی جگنو ہی ٹمٹمائے
اور موسم ، جو
پہنے ہوئے ہے
تیرگی کا گھنا لبادہ ،
بدل دے ، قبا یہ پرانی
اور لوٹا دے اس کے بدن پر
مہکتی ، لہکتی وہ چھاؤں
جس کے تلے آ بیٹھے پھر سے کوئی محبت کا مارا
دُمدار تاروں کا جوڑا
جو بیٹھے ، سُنے گیت گو بند اور اُڑ جائے
ہماری تمہاری طرح ، محبت میں کھو کر ، یک جان ہو کر

★★



کدم اور کدم کی یہ چھیاں
پُرانی کتھا ہے
جہاں برج کی رادھا ،
نند گاؤں کی سکھیوں کے سنگ
کرشن کی بانسری کی مدُھر لے میں ڈوبی
رچاتی تھی پہروں
پیار کی راس لیلا
اُسی حسن کے عشق پرور سہاروں کے دم سے
عاشقانہ ہے اب بھی
عاشقانہ رہا ہے
عاشقانہ رہے گا...... کدم کا مزاج

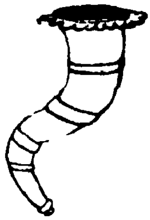
شہر سدوم

سارے منظر منفی تصویروں سی کالی دھند میں لپٹے
رنگ 'کسی یگ میں' کہتے ہیں' سات ہُوا کرتے تھے
اور ہر رنگ کی اپنی ایک کہانی تھی
ہر رنگ سے وابستہ تھا اک احساس
سنا ہے' رنگ کبھی زندہ تھے
پھر اُن رنگوں ہی سے اک جرثومہ جنما
دھیرے دھیرے جس نے سارے رنگ نگل ڈالے
اب ہر منظر سے تاریکی کا کرب نمایاں ہے
ہر منظر منفی تصویروں سی
کالی دھند میں لپٹا ہے
اور رنگوں کے ادراک کا نقطہ
ذہن سے ہے معدوم
کوئی پہچان نہیں
جب آنکھوں کا وردان ملا
تو ہر منظر پر تاریکی ہے



دھرتی سانپوں کا جنگل ہے
زہر آلود ہوا سانسوں میں گھل کر
اک اک رگ کو چاٹ رہی ہے
یوں لگتا ہے
جیسے اک وحشی ہے جسم میں قید
جو اپنے تیز نکیلے ناخنوں سے
شریانیں چیر کے باہر آنا چاہے
جیسے لاوا پتھر کی کمزور رگوں کو ڈھونڈے
تاکہ ان کو توڑ کے باہر کی بے سمتی کا حصہ بن جائے

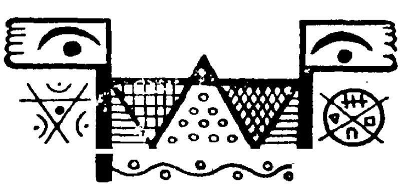
نیلم شہزاد



دھرتی سانپوں کا جنگل ہے
اس کی زہر آلود فضائیں
جب کوئی پنچھی پرواز کرے گا
اپنی آنکھیں کھو بیٹھے گا
سانپوں کے جنگل کی دیوی جس کے سر پر
آگ اگلتے سنپولیوں کا تاج دھرا ہے
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
اور جو اس سے آنکھ ملاتا ہے
پتھر کا ہو جاتا ہے
ڈسنے اسی کے بطن سے
اب پرسیوز کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا
کہ جو سانپوں کی دیوی کا سر کاٹے



ایوا گرئیس کے کالے البم میں
کالے مرمر کے اک حوض میں کالا ساگر
کالے ساگر میں کالی جل پریاں رقصاں
حوض کنارے سیہ پوش راہب
بربط کے تاروں پر
اک سدومی نغمہ چھیڑ رہے ہیں
تاروں کی جھنکار پہ رقصاں لہراں
عریاں جل پریاں
کالے ساگر سے باہر آ کر
راہبوں کے پہلو میں لہراتی ہیں
ان کی سیجوں پر انگارے دہکاتی ہیں
اک اک کر کے سارے راہب
جل پریوں کے تن پر بہتا رس چکھ لیتے ہیں
تو سارے پردے اٹھ جاتے ہیں
سارے رشتے مٹ جاتے ہیں
اک سدومی زہریلا نغمہ ہی فضا میں لہراتا ہے



ایک سیہ جرثومہ (جو آئرس سے جنما تھا) ؎
دھیرے دھیرے ایو اگریئس کے البم کے
سب رنگوں کو کھا جاتا ہے

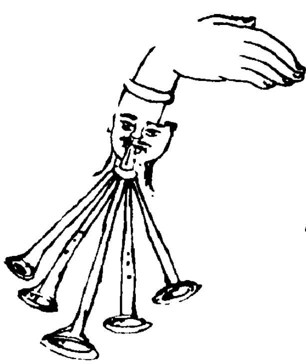


کالے وحشی کالی آگ کو گھیرے ناچ رہے ہیں

نقّاروں کی بے ہنگم دھم دھم پر
کالے جسموں کے کالے ساگر کی لہریں چیخ رہی ہیں
قطرہ قطرہ ٹوٹ رہی ہیں
کالے جادو کی دیوی سنگھاسن پر بیٹھی ہے
کالی آگ ہون میں روشن ہے
چیتے کی کھال بدن پر اوڑھے
سر اور چہرے پر کالے جادو کے کالے نقش بنائے
ایک پجاری کالی آگ میں کالی نذریں ڈال رہا ہے

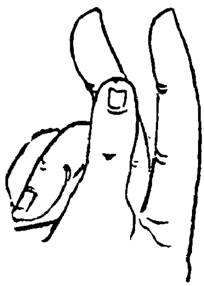


دیوی سنگھاسن پر بیٹھی ہے
اور اس کے قدموں میں
ان گنت داسیاں، داس، پجاری
یوگ کے دھیان آسن میں بیٹھے
اپنے اندر کی تاریکی ـــــ گہرائی میں
کچھ ڈھونڈ رہے ہیں
اور پجاری کالی آگ میں کالی نذریں ڈال رہا ہے

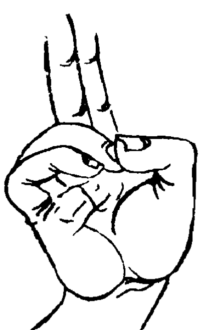


ایک کنواری داسی (ہر پردے سے عاری)
دیوی کے قدموں میں کھڑی ہے
اور پجاری اس کے سر پر
نشے کا رس ڈال رہا ہے
کومل چہرے اور چھاتی کے پھولوں سے ہوکر
رس دھیرے دھیرے داسی کے شفاف شکم تک

(ناف سے نیچے) آتا ہے
اور اک اک کر کے ہر ڈس اپنے ہونٹوں سے
اس کے قطرے چن لیتا ہے
اور سارے پردے اٹھ جاتے ہیں
سارے رشتے مٹ جاتے ہیں
اپنے اندر کی گہرائی میں ڈوبے
سب بھکت نشے کا کالا ساگر پی کر
قطرہ قطرہ ٹوٹ رہے ہیں
سارے منظر
منفی تصویروں سی
کالی دھند میں لپٹے

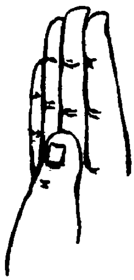


یوں لگتا ہے جیسے کوئی وحشی
اپنے تیز نکیلے ناخن جسم کے اندر گاڑ رہا ہے
جب بھی آگ بھڑکتی ہے
یہ وحشی اٹھ جاتا ہے
جسم کی دیواروں سے یوں سر ٹکراتا ہے
جیسے ان کے بیچ کسی نے
اس کو زندہ چنوایا ہو
جب تک آگ بھڑکتی ہے۔



اس پر دیوانہ پن طاری رہتا ہے
اور جب داسی کے پیکر پر بہتے اس کے قطرے
یہ چکھ لیتا ہے
تو سارے پردے اٹھ جاتے ہیں

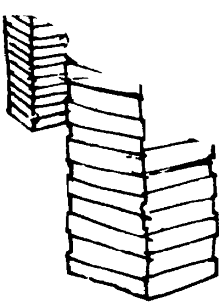
یکش نگر کا راج کنور اک رات اکیلا سویا تھا ؎
(اس یگ میں تنہائی کا احساس نہیں جنما تھا)
رات کے ڈھلتے ڈھلتے تاریکی میں
ایک شرارہ ٹوٹا
اک پرچھائیں راج کنور کے تن سے باہر آ کر
اپنا ریشم جیسا کالا پیکر اوڑھ رہی تھی
بس اک پل میں راج کنور کو
اپنے اور اس ریشم جیسے پیکر میں
کچھ دوسرے پن کا رنگ نظر آیا
اور ٹھیک اسی پل
اس کو اپنی یگ یگ کی تنہائی کا احساس ہوا
اور کالے یگوں سے



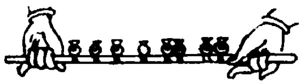
اندھے غار میں رہنے والے راج کنور کی
اک اک رگ میں آگ بھڑک اٹھی
اور تب اس پہلی تنہائی میں
یکش نگر کے راج کنور اور ریشم سے پیکر نے



اور اپنے پاپ کے پھل میں
اس نے اک یکش کو جنا
جو' دھرتی جب آباد ہوئی تو' یم کہلایا
یم نے' کہتے ہیں کہ پیدا ہو کر
اپنے جسم کی رگ رگ میں بہتے لاوے کو
پاپ کی دیوی کی رگ رگ میں ڈال دیا



پہلا پاپ کیا
(کہتے ہیں ، پاپ سدا تنہائی میں ہوتے ہیں)
وہ پیکر جو اک یکش سے جنما تھا
دھرتی جب آباد ہوئی تو پاپ کی دیوی کہلایا

پھر جانے کتنے یگ بیتے

ہر یگ میں پاپ کی دیوی سے
جانے کتنے سانپ جنم لیتے ہیں
جو پیدا ہو کر اپنی ماں کو ڈس لیتے ہیں
سانپوں کے جنگل کی دیوی جس کے سر پر
آگ اگلتے سنپولیوں کا تاج دھرا ہے

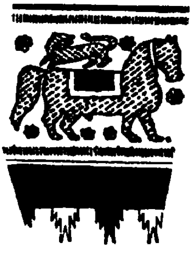
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
ڈینے اسی کے بطن سے
اب پر سیوز کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا
کہ جو سانپوں کی دیوی کا سر کاٹے
پھر جانے کتنے یگ بیتے

فیبس کے مندر کے بوڑھے پجاری کو[۱]
لائیس نے سپنے میں دیکھا[۲]
" جوکسٹا اک سانپ جنے گی ـــــ "
بوڑھے پجاری کے پیکر میں، لائس نے دیکھا، فیبس بول رہا ہے ،
" اور جیسے فرعونوں کی بستی میں
سارے رشتے بے معنی ہیں

تھیبز میں بھی ایسی ہی رسم چلے گی
جوکسٹا اک سانپ جنے گی
جو اک دن اس کی کوکھ کو ڈس جائے گا "
اندھے غار میں رہنے والے راج کنور نے

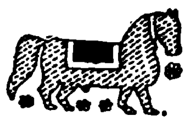
کہتے ہیں، جب لائیس ایک سفر سے لوٹ رہا تھا
اس کے سینے سے سانسوں کو چھین لیا
تب شہر کے دروازے پر جوکسٹا نے
اندھے غار میں رہنے والے راج کنور کو ورمالا پہنائی
اور جب داسی (جوکسٹا) کے پیکر پر بہتے
رس کے قطرے اِڈی پس نے چکھے
تو سارے رشتے ٹوٹ گئے

●

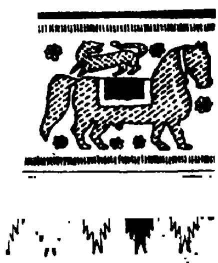


ناگیشر نے ندی کے تٹ پر اک ہرنی دیکھی ــــ
ــــ ترکش سے اک تیر کماں پر آیا

اور اس سے پہلے کہ تیر کماں سے چھوٹے
ناگیشر کے من میں ہرنی کو زندہ پانے کی خواہش جاگی
اور کہتے ہیں، دور افتادہ دھرتی کا شہزادہ



ناگیشر جنگل میں رستا بھول گیا
وہ ہرنی جس کی کھال سنہری تھی
شاید جنگل کی دیوی تھی



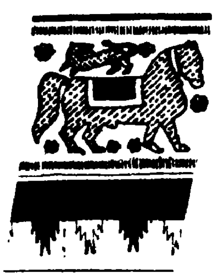
جو رامائن کے جادوگر ماریچ سی
(جس کو ہرن کے روپ میں دیکھ کے
سیتا نے پانے کی خواہش کی تھی)
ناگیشر کو اپنے پیچھے آنے پر اکسا کر
جنگل کی انجان دشاؤں میں گم ہو گئی

اور کہتے ہیں، دور افتادہ دھرتی کے شہزادے نے
اک جھرنے پر اک عریاں شعلہ دیکھا
اکٹیئن نے جیسے جنگل کی دیوی کو شہ



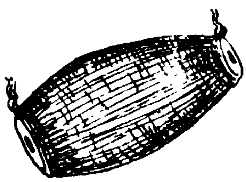
جھرنے پہ نہاتے دیکھا تھا
ناگیشر نے دیکھا

دھیرے دھیرے اس شعلے نے اک ہرنی کا روپ لیا
اور ٹھیک اسی پل گم گشتہ شہزادے کو



اپنی یگ یگ کی تنہائی کا احساس ہوا
اس کے من میں شعلے کو چھونے کی
(ہرنی کو زندہ پانے کی) خواہش جاگی

اب تک اندھے غار میں جو سویا تھا
درندہ جاگ اٹھا

اور جیسے پلوٹو نے سسلی کے ساحل پر[9]
پرازرپن کے جسم سے کھارے پانی کے قطرے چکھے تھے
یوں ہی ناگیشر نے
جھرنے پہ نہاتی دوشیزہ کے کومل تن پر بہتا امرت چکھا
چاند اور سورج کو راہو اور کیتو چاٹ گئے
اس دن سے ہر منظر رنگوں سے عاری ہے
اِکسائیَن کالی صدیوں سے[10]

اب بھی جونو کے جسم سے کھیل رہا ہے
اور کالی صدیوں سے
اب بھی دُشاسن اپنی سبھا میں
دروپدی کے جسم سے اک اک پردہ نوچ رہا ہے
دھرتی سے اولمپس کی اونچائی تک
اک چیخ ــــ جونو کی چیخ

خداؤں کے مسکن کو ڈھونڈ رہی ہے
زیوس کہاں ہے[11]
جو اِکسائیَن کو اس کے کرموں کی سزا دے
دھرتی سے کیلاش کی اونچائی تک
دروپدی کی چیخ خداؤں کے مسکن کو ڈھونڈ رہی ہے
کرشن کہاں ہے

جو اس کو سُوئیکشوں میں عریاں ہونے سے بچائے
چاند اور سورج کو راہو اور کیتو چاٹ گئے ہیں
سارے منظر
منفی تصویروں سی
کالی دھند میں لپٹے

زیوس نہیں ہے
کرشن نہیں ہے

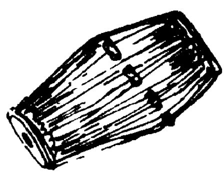
راہو کیتو راہو کیتو
ہر منظر پر تاریکی ہے





●

سانپوں کے جنگل کی دیوی جس کے سر پر
آگ اگلتے سنپولیوں کا تاج دھرا ہے
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
کالے بے انت سمندر پر آوارہ سی گل چیخ رہے ہیں
کالی لہروں پر
کالی دھرتی کا اک ٹکڑا ہے
جس کے کالے ساحل پر
بربط کے تاروں پر
سرسی یونانی ملاح یولی سس کو[12]
اک نغمہ سنا رہی ہے ، اور یولی سس
اس کے جسم کے مدوجزر میں ڈوب رہا ہے
اور اولمپس سے آنے والی اک ست رنگی دیوی
بے انت سمندر کی کالی لہروں میں گم ہے





سانپوں کے جنگل کی دیوی
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
گائین اکریشا کی کالی جنت کا قیدی ہے[13]
اور کالی جھیل کے ساحل پر
کالی جل پریاں آڑی ترچھی لیٹی ہیں
گوشت ـــــ پھڑکتا زندہ گوشت
اندھیرا اکریشا گائین ننگی کالی جل پریاں
رقصاں ' لہراں '



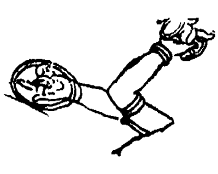
سانپوں کے جنگل کی دیوی
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
وِش کنیائیں بن باسی رشیوں کے جاپ کو توڑ رہی ہیں
اک وِش کنیا : چترلیکھا
گھنگرو کی چھن چھن ڈھول جلترنگ اکتارا شہنائی گیت
بدن کا لوچ (پھڑکتا زندہ گوشت)



مثلث قوس دائرے لہراتی لچکیلی کالی وش کنیا
جوگی کا جوگ : ہوا — بے سمت ہوا
دھیان آسن تپ جاپ سلگتا گیت
بدن کا لوچ اندھیرا بن باسی جوگی وِش کنیا

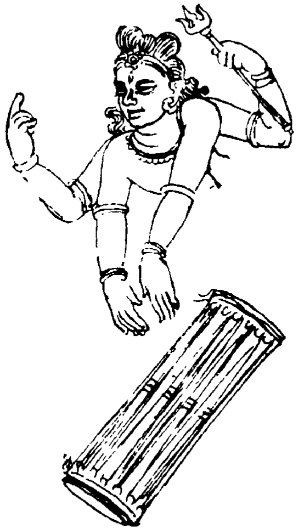


سانپوں کے جنگل کی دیوی
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
یوحنّا پاتال میں قید ہے ؑ
اور سلومی کے کالے پیکر کے غار میں
ایک سنپولا رینگ رہا ہے
آگ ، ہوا — بے سمت ہوا
چاندی کے طشت میں یوحنّا کا سر رکھا ہے
اور دو شاخہ جیبھ سلومی کے ہونٹوں سے نکل کر
یوحنّا کے زرد لبوں پر ناچ رہی ہے



آج بھی موآبی دوشیزائیں تھیموز کی خاطر ؑ
کالی راتوں کو ندیوں پر
عریاں رقصاں لہراں بین کیا کرتی ہیں
ڈینے اسی کی کوکھ ہے. بنجر
اس کے بطن سے اب پرسیوز کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا
کہ جو سانپوں کی دیوی کا سر کاٹے

●



اٹلس اپنے کالے افریقہ میں تنہا تھا ؎
جب نکس کے بال کھلے
اور اس نے تانڈو راس رچا
(تاریکی میں اک وحشی امیزن رقاصہ
لہراتی کالی جوالا
جوالا کی کالی گردن میں کالے سانپ کی مالا)

اندھے غار میں جو سویا تھا
درندہ جاگ اٹھا
اس کی افریقی آگ
اِلکٹرا کے پیکر کی قوس قزح کو چاٹ گئی
اس یگ میں بھی
جب نکس رچا کرتی ہے تانڈو راس
اٹلس سے جنمی الکٹرا
باپ کے کوہستانی شانوں سے گر کر
اپنے ہی انت کا منظر دہراتی ہے
وحشی امیزن رقاصہ لہراتی جوالا
سر سے پاؤں تلک آوارہ نکس
اپنے کالے پیکر کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے



سانپوں کے جنگل کی دیوی
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا بانٹ رہی ہے
— کالی جوالا لہرائی اور جسم کے کالے غار میں
اک وحشی چوپایہ جاگ اٹھا
اور فیڈر ربا تھیسیوز کے پہلو سے اٹھ کر ؎
آوارہ ہوا سی
ہپولائٹس کی سمت اڑی



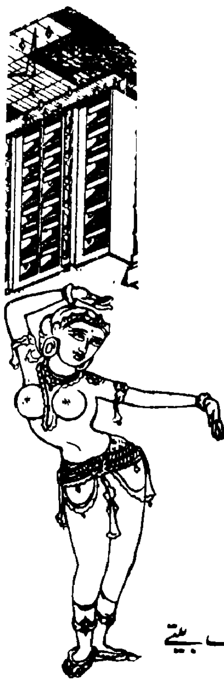
اور جو تھیسیوز سے جنما تھا
زہریلی ہوا کے نرغے میں یوں چکرایا
جیسے چیر بڈز کے تاریک بھنور میں
کوئی گم گشتہ کشتی

اس یگ میں بھی
جب نکس رچا کرتی ہے تانڈو راس
ہیو لائٹس کی گم گشتہ کشتی کو
تاریک بھنور عفریت نگل جاتا ہے
یگ بیتے ــــ ڈینے ای کی کوکھ کے جلتے صحرا میں
اب کوئی ہرسیوز نمو پاتا ہی نہیں
جلتے صحرا کے بھی اپنے رنگ تھے
جن پر اب کالی آوارہ نکس کا سایہ ہے

●

اُر اک سنگ تراشوں کی بستی تھی
دو معتوب شیاطیں اشماس اور بعل [۱۹]
وہاں پوجے جاتے تھے
جو جنسی فرق سے عاری تھے
اور ہر روپ میں بھکتوں کو درشن دیتے تھے
اک شب انھوں نے مرد کا روپ لیا
اور تب معبد میں لوگوں نے دیکھا
اشماس اور بعل اپنے تن کے کالے لاوے کو
اک دوسرے کی رگ رگ میں ڈال رہے ہیں
ان معتوب خداؤں کی رسم
اُر سے باہر
بستی بستی قریہ قریہ پھیل گئی

مردوں کو اپنے ہی جیسے پیکر کے لمس میں
کچھ اور ہی لطف آیا
ان کے پہلو میں
اب بیویوں، باندیوں اور کنیزوں کے بدلے
نوخیز حسیں لڑکے سوتے تھے



پھر جانے کتنے یگ بیتے
فرعونوں کی بستی میں ہورس اور ست[۲۰]
(جن کی تلواریں
برسوں اک دوسرے کے خوں کی پیاسی تھیں)
دوست ہوئے، تب ست نے کہا:
آؤ، شب بھر ہم جشن منائیں
اور کالے حجرے کی کالی تنہائی میں
ہورس اور ست پر
اشماس اور بعل نے اپنا سایہ ڈالا
غار میں جلتی آگ
درندے
دیوانہ پن

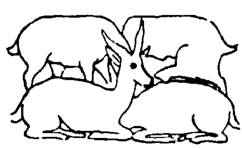
اور پھر جانے کتنے یگ بیتے
اشماس اور بعل کی رسم
سدوم، اُر، گمورہ اور فرعونوں کی بستی سے
ہر سمت وبا سی پھیل گئی
اور اک عامی سے
شہزادوں، فنکاروں، رشیوں اور فلسفیوں تک جا پہنچی
لوط کے وہ مہمان فرشتے
جو اندھا کر دیتے ہیں[۲۱]
کس بستی میں ہیں
شہرِ سدوم کے دروازے پر کوئی نہیں ہے
شہرِ سدوم کے دروازے پر کوئی نہیں ہے



کالا کمرہ افریقہ ہے
تاریکی میں کالی وحشی امیزن دوشیزائیں
کالی آگ کو گھیرے ناچ رہی ہیں
قطرہ قطرہ ٹوٹ رہی ہیں
چیخ رہی ہیں:
آؤ سہیلی سرپٹ بھاگیں[۲۱]
سر کے بال تلک کھل جائیں
(سر سے پاؤں تلک کھل جائیں)
پتھر سے پتھر ٹکرائیں
(گوشت — پھڑکتا زندہ گوشت
مثلث قوس دائرے)
برگد کی ننگی ننگی ڈالی پر جھولا جھولیں
ہنسی ہنسی میں اک دوجے پر
بدلی بن بن کر یوں ٹوٹیں
آٹے جیسا کس کر کس کر گوندھیں
کئی جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں
ٹوٹیں پھوٹیں

●

اولمپس کے ست رنگی جادو سے نکل کر[۲۲]
جب لیتی ہے نکس کا کالا روپ جونو[۲۳]
تو دھرتی سانپوں کا
اک کالا وراٹ جنگل بن جاتی ہے
جوٹرنا کی روپ دھنک کے ساتوں رنگوں پر



اندھیارا چھا جاتا ہے
جونو اور جوٹرنا (لہراتی کالی ناگنیں)
کالی کینچلیوں سے باہر آ کر
اپنے زہر کو قطرہ قطرہ پی کر
اپنے جسم کا ٹکڑا ٹکڑا کھا جاتی ہیں،



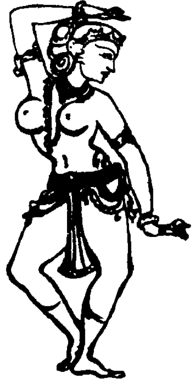
فیبی (جنگل کی دیوی) کے سر پر[۲۵]
آگ اگلتے سپنولیوں کا تاج دھرا ہے
کیملا (آوارہ شہزادی) سر سے پاؤں تلک آوارہ
دیوی کے قدموں میں کھڑی ہے
اور اک لہراتی لچکیلی کالی ناگن
اس کی چھاتی کے پھولوں پر رینگ رہی ہے
جنگل کی دیوی اور آوارہ شہزادی
تیز نکیلے ناخن لمبے دانت
مثلث قوس دائرے
فیبی ؛ کیملا لہراتی لچکیلی کالی ناگنیں
برگد کی ننگی ڈالی پر جھولا جھول رہی ہیں
جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہیں
پھوٹ رہی ہیں



●

جب کالی ناگن لہراتی ہے
تو دھیرے دھیرے کمرے کی دیواریں پاس آنے لگتی ہیں
(تنگ سرنگ گھٹن بے ربط تنفس)

رگ رگ میں چالیسویں درجے عرضِ بلد زیریں کی ہوائیں
شور مچاتی ہیں



اور جب پھیلتے جلتے شیشے پر
ٹھنڈے پانی کی بوند ٹپکتی ہے —
— سناٹا چھا جاتا ہے
خواہش پانی ہے جو چٹانیں توڑ کے
اپنی سطح برابر کر لیتا ہے

جب امنون نے دیکھا [۲۶]
اس کے باپ کی اسرائیلی بیویوں میں سے ایک کی بیٹی
تمر اپنے گھر میں تنہا ہے
کالے حجرے کی کالی تنہائی میں کالی ناگن لہرائی ' دیواریں ٹکرائیں
زنگ آلودہ چاقو اک اک رگ کو کاٹ گیا
کالے بے انت سمندر کی لہروں پر اک آوارہ پنچھی چیخا
اندھے غار میں جو سویا تھا
زندہ جاگ اٹھا
امنون کے ہاتھوں خون کے رشتے کی اسرائیلی زنجیریں ٹوٹ گئیں
فی ارنے (امنون کی ماں جس کی پجارن تھی) [۲۷]
امنون پہ کالا سایہ ڈال دیا
ناگن لہرائی
چاقو لپکا

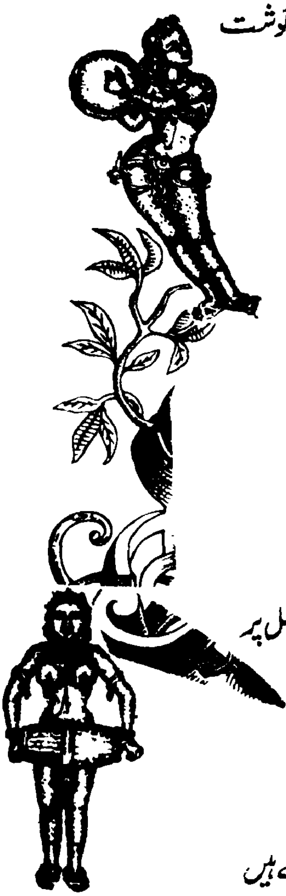


پنچھی چیخا
غار کا وحشی باسی پھڑکتے زندہ گوشت کی بو پاکر باہر آنکلا
(دیول بھی تنہا تھی جب خلجی شہزادہ [۲۸]
خون کے رشتے سے بے پروا
دروپدی کے وستر ہرن کا راس رچانے
آوارہ پنچھی سا
اس کی تنہائی میں در آیا تھا)
بن اُبیّ (کالا جرثومہ) [۲۹]
تمر اور دیول اور سلمیٰ کے پیکر کے
ساتوں رنگوں کو قطرہ قطرہ چاٹ رہا ہے
ابی سلوم ، رگوں میں جس کی [۳۰]
تمر کی ماں کا خون رواں ہے
جانے کس صحرا میں گم ہے
کمرے میں چالیسویں درجے عرض بلد زیریں کی ہوائیں
رقصاں لہراں شوریدہ ہیں



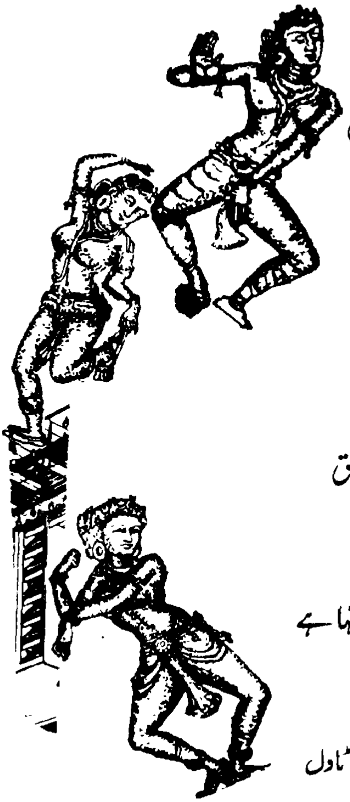
(سونے کمرے میں اک کالی بلی)
کالے کاغذ کی دیواروں پر بکھرا ہو کی ہر مورت
اپنے صدیوں پرانے آسن میں بیٹھی ہے
پیکر لمس اگن بے ربط تنفس

کالے وحشی کالی آگ مثلث قوس دائرے
ہاتھ آنکھیں لب گوشت — پھڑکتا زندہ گوشت
کنواری داسی کے شفاف شکم کے نیچے
رشتے بے معنی ہر پردہ تار تار
اور نچلی شریانوں میں شعلے
کالے پردے پر تاریکی میں
افریقی دوشیزائیں ناچ رہی ہیں
نقاروں کی بے ہنگم دھم دھم پر
لہراتی لچکیلی کالی ناگن
اپنی کالی کینچلی سے باہر آتی ہے
آوارہ مرغولے چاہِ ہاروت و ماروت کی
اندھی گہرائی میں اتر رہے ہیں
ہاتھوں میں بجلی کا ننگا تار
ہوا — بے سمت ہوا اور مٹیالے کہر لیے ساحل پر
جل پریاں آڑی ترچھی لیٹی ہیں
کالے بے انت سمندر پر
آوارہ سی گل چیخ رہے ہیں



کالے وحشی کالی آگ کو گھیرے ناچ رہے ہیں
اک یونانی — سر پر پتوں کا اک تاج
بدن کے ساگر کی ہر مچھلی

کھال سے باہر آنے کو تڑپے
سونے کمرے میں اک کالی بلی ٹہل رہی ہے
ہر انگلی اک سانپ بنی ہے
الٹے قدموں کے نیچے تاریک مثلث
سانپ مثلث انگلی ننگے کالے وحشی
کالی تنگ سرنگ اگن بے ربط تنفس
سونا کمرہ کالی بلی
ساگر انتم ریشا تک ویران پڑا ہے
لہروں پر آوارہ سی گل چیخ رہے ہیں
سرسی تنہا ہے
— کوئی گم گشتہ کشتی
کوئی یولی سس، سندباد، قزّاق
کوئی وحشی ملّاح
نہیں کوئی بھی نہیں
بس کالی لہروں پر سی گل اور سرسی تنہا ہے



(سونے کمرے میں اک کالی بلی
شاور کے نیچے اک جلتا پیکر
چماق کے پھولوں پر ایک کھردری ٹاول
جسم کے ساگر کی ہر مچھلی
کھال سے باہر آنے کو تڑپے
اک وحشی اپنے تیز نکیلے ناخن
جسم کے اندر گاڑ رہا ہے)
شیشے میں شعلہ : ہر انگلی سانپ بنی ہے



سونے کمرے میں
اک ساگر
انتم ریشا تک ویران پڑا ہے

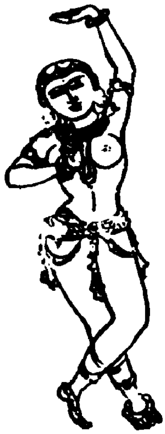
سب بھگت نشے کا کالا ساگر پی کر
یوگ کے دھیان آسن میں بیٹھے
اپنے اندر کی تاریکی ــــ گہرائی میں
کچھ ڈھونڈ رہے ہیں
تن : دھرتی پر
من : گم
دھیان : دھواں دھند آوارہ ہے
نچلی شریانوں کے شعلوں میں
سب بھسم ہوئے جاتے ہیں
بھنگ چرس گانجا گولی ست
مکتی اور نجات کے زینے
رام کرشن ہری ادم
گیروے کپڑے لمبے بال نشہ آوارہ گردی
اندر تاریکی باہر تاریکی



مُکتی کا جزیرہ کالے بے انت سمندر میں گم گشتہ
رام کرشن ہری ادم اندھیرا

میری آنکھیں اس کی کھڑکی میں رکھی ہیں
(وہ اپنے افریقہ میں تنہا ہے)
آنکھوں میں کالا منظر ہے
افریقی دوشیزہ فحش فسانے کا کردار بنی ہے
لہراتی لچکیلی کالی ناگن
اپنی کالی کینچلی سے باہر آتی ہے
میری آنکھیں
افریقی دوشیزہ کی کھڑکی میں رکھی ہیں
اور اس کی آنکھیں بھی تو
میری کھڑکی میں رکھی ہیں
دونوں کی آنکھوں میں اندھیرا





رنگ منچ پر کالا ہالا
کالے ہالے میں اک آفت کی پرکالہ
تاریکی میں آنکھیں
آنکھوں میں لہراتی کالی جوالا
جوالا کی کالی گردن میں کالے سانپ کی مالا
کالا گھیرا — کالے گھیرے کے اندر باہر
ہر اور اندھیرا

تیز نکیلے ناخن، لمبے دانت
زبان اور ہونٹوں پر زہریلا جھاگ
سموری کھال، لچکتی لہراتی اک کالی ناگن
تنگ سرنگ اگن بے ربط تنفس
وحشی پر چوپایہ
چوپائے پر وحشی
گوشت — پھڑکتا زندہ گوشت
مثلث قوس لکیریں کالی کینچلی کانٹے دار سمور
پھسلتا پھیلتا بدبو دار اندھیرا



تاریکی میں کالے پردے پر
ننگی کالی وحشی دوشیزائیں ناچ رہی ہیں
بال کھال بے پردہ
الٹے قوسوں کے نیچے تاریک مثلث : تیر
پھڑکتا زندہ گوشت — اندھیرا
ہر بیوپار میں ہے کالے پیکر کی نمائش
سوئی سے جٹ طیارے تک
کالے کیلنڈر بن سب ناممکن

دیواروں پر کالے پیکر چسپاں
بکسوں پر ننگی رانیں، ننگی باہنیں ، ننگے دھڑ
برتن، ساز ، کھلونے ، تاش کے پتے
ہر گوشے میں ننگے کالے پیکر
ہر گوشے میں اندھیرا



ہر کتاب کا لیکھک کوکا پنڈت
نظم ، کہانی ، کھیل
ہر اک کے لفظوں میں ہے گوشت کی بو
ہر صفحے پر جنسی آسن کے نسخے درج
(ہوا ــــ بے سمت ہوا)
ہر لیکھک کوکا پنڈت

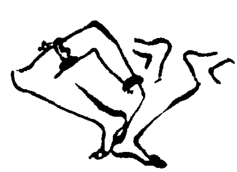
ایک ربر کی شہزادی بستر پہ لیٹی ہے
جس کا ہر عضو ہے اصلی شہزادی سا
جس آسن میں چاہو اس کو بیٹھا دو
اور جیسے چاہو اس سے کھیلو
ظلم سہے گی
کچھ نہ کہے گی

کالی تصویریں ہر فٹ پاتھ پہ بکتی ہیں
آنکھ مارنے والی جاپانی گیشا
دائیں سے دیکھو تو پورے کپڑے پہنے
بائیں سے ننگی
شاور کے نیچے اک امریکی دوشیزہ
ادھر سے دیکھو تو ننگے پستان ، کمر، ناف
اُدھر سے دیکھو تو ننگے کولہے، رانیں اور ساقیں
نیچے سے دیکھو تو الٹے قوسوں کے نیچے اک سیہ مثلث
اوپر سے دیکھو تو دائرے قوس بھنور
ہر بار نیا اک لطف ملے گا

ننگی جھلک دکھلانے والے
ہر بستی میں گھوم رہے ہیں

سارے منظر
منفی تصویروں سی
کالی دھند میں لپٹے

چاند اور سورج گورا ہو اور کیتو چاٹ گئے ہیں
زیوس نہیں ہے
گارگنوں کے بن میں کوئی پرسیوز نہیں ہے [31]
کرشن نہیں ہے







کوئی نہیں ہے
ہر منظر پر تاریکی ہے
پھیلتی بڑھتی تاریکی میں رنگ منچ پر[۳۲]
اتل اسور امیزن بھوتنوں میں گھرا ہے
وتل اسور نے نگن چڑیلوں کو گھیرا ہے
سارے سدومی شہزادوں کے سامنے
بدبودار جذامی گوشت پلیٹوں میں رکھا ہے
اور دوشیزائیں
گرد آلودہ گڑیوں سی طاقوں میں رکھی ہیں
لوط کے وہ مہمان فرشتے
جو اندھا کر دیتے ہیں
کس بستی میں ہیں
دشتِ سدوم پہ پھٹ پڑنے کو
آسمان کے دامن میں کیا کوئی قہر نہیں ہے
شہرِ سدوم کے دروازے پر
کوئی نہیں ہے
شہرِ سدوم کے دروازے پر کوئی نہیں ہے۔

نوٹ :- ہم سب نے ہندو دیومالائی اندر دھنش یعنی قوس قزح کو کبھی نہ کبھی دیکھا ہے اور رنگوں کی اس خوشگوار مالا کو پکڑ کر اپنے اندر سمیٹ لینے کی خواہش بھی کی ہے۔ کہتے ہیں سات رنگوں کے کیمیائی ملن سے سفید رنگ عود آتا ہے جو ہر کسی کو پسند ہے ہرچند کہ سفیدی بڑی ہی نانی قسم کی چیز ہے

اپنی اس طویل نظم میں رنگوں کے احساس و مزاج کے بکھرے ریزوں کو دیومالائی کتھاؤں سے شعور کی آنکھوں اور انگلیوں سے چُن چُن کر یکجا کرنے اور ایک مکمل 'مورال' کی صورت میں پیش کرنے کی شاعرانہ جسارت کہاں تک کامیاب ہے یہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔ مگر اس نظم کا مجموعی تاثر کچھ ایسا ہے



ناموں کی تفہیم



ا؎ MEDUSA : ایک عورت نما عفریت
جس کی طرف دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا تھا
پرسیوز نے اُس کا سر کاٹا تھا

۲؎ ARGOS : DANAE کی دیومالائی
شہزادی، جس سے ZEUS نے سنہری
گرد کی صورت میں وصال کیا تھا۔ پرسیوز
PERSEUS کی ماں : ATHENE
کے آئینے میں دیکھتے ہوئے پرسیوز نے
HERMES کی درانتی سے MEDUSA
کا سر کاٹا تھا۔

۳؎ EVAGRIUS (SAINT) : ایک فلسطینی
راہب، عیسوی رہبانیت کا مورخ

۴؎ IRIS : دیوتاؤں کی پیغامبر دیوی

۵؎ PARADISE LOST-II سے ماخوذ
ALLEGORY OF SIN & DEATH

۶؎ PHAEBUS : سورج دیوتا

۷؎ LIAS : THABESE کا بادشاہ
OEDIPUS کا باپ
JOCUSTA : LIAS کی بیوی

OEDIPUS : ایک پیشین گوئی کے
تحت جسے جنگل میں پالا گیا تھا۔ اس
نے انجانے میں LIAS کو قتل کر کے
اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ دو بچوں
کی پیدائش کے بعد جب اُسے بات
کا پتا چلا تو اس نے اپنی آنکھیں پھوڑ
ڈالیں اور اس کی ماں (بیوی) نے
خودکشی کر لی۔

۸؎ AECTAEAN : ایک دیومالائی
شکاری جس نے جنگل کی دیوی
DIANA کو نہاتے ہوئے دیکھ لیا
تھا۔ سزا میں اس کے شکاری کتوں نے
اُسے ختم کر دیا۔

۹؎ PLUTO : پاتال کا دیوتا
PROSERPIN : دیویوں کی دیوی

۱۰؎ IXIAN : نے کئی روپ میں
JUNO کو ورغلانے کی کوشش کی JUPITER
نے ایک مسلسل گھومتے ہوئے پہیے سے

باندھ کر اسے سزا دی۔

۱۰ ZEUS : یونانی دیومالا میں رب الارباب

۱۱ CIRCE : جادوگرنی جس نے یولی سس کے ملاحوں کو پتھر کا بنا دیا تھا۔

HOMER : ULYSSES کی رزمیہ نظم ODYSSEY کا ہیرو

۱۳ GYAN : سڈنی کے رومانس فیری کوئین کی دوسری کتاب کا ہیرو۔

ACRECIA : CIRCE کی متبادل

۱۴ یوسف اور زلیخا

۱۵ SALOMI : ایک رقاصہ نے یوحنا نبی کے بوسے کی ہوس کی تھی اور رقص کے انعام میں نبی کا سر مانگا تھا۔

۱۶ THEMEUS : ندیوں کا دیوتا

۱۷ ATLAS : زمین اور آسمان کو سہارنے والا دیوتا۔

NYX : رات کی دیوی

ELECTRA : ATLAS کی بیٹی

۱۸ PHAEDRI (PHAEDRA) : تھیسیوز کی بیوی، HIPPOLYTUS کی عاشق

HIPPOLYTUS : تھیسیوز کا بیٹا

CHERIBDES : بھنور

۱۹ اشماس اور بعل : بابلی دیوتا

۲۰ HORUS اور SET : زرخیزی کے مصری دیوتا

۲۱ بحوالہ انجیل و قرآن

۲۲ OLYMPUS : یونانی دیوتاؤں کا مسکن۔ شمال مشرقی یونان میں ایک پہاڑ، بمعنی آسمان

۲۳ JUNO : رومی دیومالا میں دیویوں کی دیوی

۲۴ ندا فاضلی کی نظم "دو سہیلیاں" سے

۲۵ DIANA, PHEBE : جنگل کی دیوی

CAMILLA : جنگجو عورت AMAZON کا اطالوی روپ

۲۶ AMNON : بحوالہ انجیل

TAMAR : امنون اور ابی سلوم کی بہن

۲۷ PEOR : ہوس کا دیوتا

۲۸ علاؤ الدین خلجی

۲۹ بن اُبَیّ : مدینے کے منافقوں کا سردار

۳۰ ابی سلوم : داؤد کا بیٹا

۳۱ GORGON : عفریت نما عورتیں

۳۲ شب معراج کی ایک تلمیح

'سدوم' سلیم شہزاد کی ایک بہت پرانی طویل نظم ہے جسے انھوں نے ۱۹۸۱ء میں چھپے اپنے شعری مجموعے 'دُعا: پرمنتشر' میں شامل کرلیا ہے۔ تناظر میں شامل یہ نظم کتاب میں چھپی نظم سے قدرے مختلف ہے۔ یہ نظم کا پہلا روپ ہے۔ کتاب والی نظم دوسرا۔ ہم نے پہلا روپ چھاپنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ یہ نظم کی اوریجنل شکل ہے جو ہمیں پسند ہے — (بی آر وی)

خالدہ حسین (اصغر)
پاکستان

نامہ بر

وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی تھی۔

ایک تاریک رات میں اس نے مجھے ایک ناگفتہ حالت میں پایا اور وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ میرے بالمقابل کھڑا ہو کر مجھے دیکھنے کے لئے اور اس کا یہ علیحدہ ہونا عجب تھا کہ اس سے پہلی بار مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے مجھے اس طرح دیکھا اور مجھ سے الگ۔ مجھ سے باہر کھڑی رہی۔ تب سے وہ اسی طرح ہے۔ کبھی موجود، کبھی غیر موجود۔ مگر ہر جگہ ہر کہیں ایک خاموش بصیرت۔

کبھی بچپن میں ہم سفید کاغذ پر رنگ برنگی روشنائیاں گراتے تھے اور پھر کاغذ کو عین درمیان میں سے دوہرا کر دیتے تھے۔ اچھی طرح انگلیوں سے چپکاتے تھے۔ اس کے دوہرے پن کو خوب ایک دوسرے میں جذب کرتے تھے اور جب کچھ دیر بعد کھولتے تو وہاں سامنے ایک نامعلوم سے کاٹتے خط کے دونوں طرف ہو بہو ایک سی شکلیں۔ ایک سی تصویریں ہوتی تھیں۔ جیسے ایک ہی وجود میں سے دوسرا نکل کر علیحدہ ہو جائے اس کے ساتھ جا چپکے۔ مگر اس سے علیحدہ رہے۔ اور اس سے پہلے سیال روشنائی میں وہ دونوں ایک تھے۔ مگر جب کاغذ پر گرا کر اس کو دوہرا کیا گیا تو اس کاغذ کے دوہرے پن میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر بالمقابل یا ساتھ ساتھ ہو گئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

چنانچہ وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ میں خود اس کے کسی فعل کی ذمہ دار نہ تھی۔ مگر وہ ہر دم ہر آن ہر لمحے مجھ پر ایک خاموش بصارت کی طرح تنی تھی۔ اور خاموش بصارت کے اس گنبد میں بہت گھٹن تھی۔ اسی لئے میری سانس اتنی مشکل سے آتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی وجہ نہیں۔

مگر وہ کیا حالت کیا فعل تھا کہ وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ میں حیران ہوں۔ بہت سوچنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ حالت ہی گویا قفل ابجد تھی کہ میرے اس حالت میں آتے ہی وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ اور یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔

گرمیوں کی اس خاموش دوپہر جب گھنٹی بجی تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھے باہر بلاتا ہے۔ میں نے کہا میں بہت مصروف ہوں۔ یوں بھی ایک مدت سے کوئی بھی مجھ سے ملنے نہ آیا تھا اور خصوصاً دوپہر کے اس سائیں سائیں کرتے وقت میں کون ہو سکتا تھا؟ یقیناً کوئی غلطی سے میرے دروازے پر آن پہنچا تھا۔ مگر گھنٹی پھر بجی اور پھر مجھی سے کہا گیا کہ وہ خاص مجھی سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ آخر کون ہو سکتا ہے؟ نام پچھوایا۔ اس نے نام بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے باہر بلاتا تھا۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا۔

مگر جو کوئی مجھے باہر بلاتا تھا وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔" مجھے اس سے ملنا ہے۔ جاؤ کہہ دو ایک ضروری پیغام لایا ہوں؟

پیغام؟ کون لا سکتا ہے۔ کس کا پیغام؟ میرے سینے میں گھٹن شدید ہو گئی۔ اب گھنٹی پر گھنٹی بج رہی تھی۔ آخر میں نے باہر جانے کو قدم بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرے پیچھے پیچھے خاموش قدموں سے چلی آتی تھی۔ میں نے ایک دم پیچھے مڑ کے دیکھا مگر وہ میرے پہلو کے ساتھ جا چپکی۔ پھر میں نے اس کو

دیکھنے کی کوشش ترک کر دی۔

دروازہ کھول کر میں نے باہر جھانکا۔ وہ سیڑھیوں پر دھرنا جمائے بیٹھا تھا۔ سفید لمبے کرتے میں۔ بغل میں ایک جھولا۔ بڑھاپے کی حدوں میں قدم رکھتا۔ عجب تازہ دم شخص، اس نے میری جانب دیکھے بغیر پکارا

"چلی آؤ۔ باہر آؤ۔ تمہارے نام ایک پیغام ہے۔"

"میرے نام ---؟" مجھے ہنسی آگئی۔ پیغام اور میرے نام --- میں برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ سوچا اس سے کہوں تمہیں کوئی غلطی ہوئی ہے شاید تمہیں کہیں اور جانا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ بھی میرے برابر ستون کا سہارا لیے کھڑی ہے۔ اور میری جانب دیکھتی ہے۔ تو کیا وہ اس کے نام کا پیغام تھا؟

"بی بی وہاں کیا کھڑی ہے۔ آگے آ۔ باہر نکل۔ اس دہلیز سے باہر نکل۔ تیرے نام پیغام آیا ہے سبز گنبد کے حضور سے، سنا تو نے؟" وہ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر بولا۔ سبز گنبد کے حضور سے۔ سنا تو نے وہ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر بولا۔ سبز گنبد کے حضور سے! میرے تمام جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اور میں نے یوں جانا گویا میں ابھی ایک چٹکی بھر خاک بن کر ہواؤں میں تحلیل ہو جاؤں گی۔ مٹ جاؤں گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! میں نے اپنے ذرہ ذرہ گرتے۔ ڈھیتے وجود کو دیکھ کر بمشکل کہا۔

تب مجھے یوں لگا جیسے میں برسوں برسوں شاید صدیوں پہلے بڑے ابا کی لوئی کی بکل میں بیٹھی ہوں۔ وہ مجھے اپنے کمزور گرم سینے سے لگاتے ہیں اور دھیرے دھیرے گاتے ہیں۔

پیغام صبا لائی ہے دربارِ نبیؐ سے
آیا ہے بلاوا مجھے سرکارِ نبیؐ سے

اور گاتے گاتے ایک دم ان کی آواز رُندھ جاتی ہے۔ اور آنسو ٹپ ٹپ میرے منہ پر گرنے لگتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے کھردرے ہاتھوں سے صاف کرتے جاتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ اور مجھے حیرت ہوتی کہ صبا کون ہے اور کیا پیغام لے کر آئی ہے۔ اسی سوچ میں گم میں سو جاتی۔

مگر اب --- یہ پیغام وہ پیغام نہیں ہو سکتا --- ہرگز نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی چند ہی روز پہلے جب میں ایک محفل میں شریک تھی اور سب نے پڑھا: "نکل جانے محفل سے جو بے ادب ہو" تو وہ جو اب مجھ سے علیحدہ ہو چکی تھی چپکے سے میرے پہلو سے جدا ہو کر باہر کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی تھی۔ اور میں بالکل بے جان کاٹھ کی مورت اس محفل میں کھڑی رہ گئی تھی۔ اور تمام وقت اس کی جانب دیکھتی رہی تھی کہ وہ میری طرف دیکھتی ہے۔

چنانچہ میں نے کہا "تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ شاید تمہیں کہیں اور جانا تھا۔"

"غلطی ---؟ کیا کہتی ہے بی بی --- ہم غلطی نہیں کرتے۔ وہاں تیرا نام لکھا جا چکا ہے۔ تیرے ماتھے پر اس کی تحریر اتر آئی ہے۔ جا جا اگر ایسا ہی ہے تو اپنا ماتھا دھو ڈال۔ پتھروں سے رگڑ رگڑ کے۔ مگر وہ تو لکھا جا چکا ہے۔" وہ بہت غصہ میں بولا۔

اب میں بھی وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ کیونکہ میرے کانوں میں دل کی دھڑکن نقارہ بن کر گونجتی تھی۔ تو کیا واقعی اس کائنات کو میرے وجود کا احساس ہے! اور اس سے آگے سوچنا میرے لیے محال تھا۔

"لیکن بی بی --- دائیں ہاتھ پر جو تیرا کمرہ ہے۔ وہاں شاہ عنایت کا ڈیرا ہے۔ تیری پشت پر غوث پاک کا پنجہ ہے۔ تو ایسا ہی مقدر لے کر آئی تھی۔ اب اسے کون مٹائے گا۔ اس لیکھ کو! بتا --- بول۔"

"میں ایسا مقدر لے کر آئی تھی! میری سانس گھٹنے لگی۔ مجھے وہ لمحہ یاد آیا جب وہ مجھ سے

علیحدہ ہوتی تھی مجھے ایک ناگفتنی حالت میں پا کر۔ پھر شاہ عنایتؒ کا ڈیلا اور میرے اس کمرے میں۔

"سن شاہ عنایت ہر رات ادھر پھیرا ڈالتے ہیں۔ مگر پھر پلٹ جاتے ہیں۔ بی بی تیرے میں ایک بڑی خرابی ہے۔ تیرا دِل ہلاکت میں پڑا ہے۔ ادھر آ ادھر بیٹھ جا۔ اور وہ جو میرے ساتھ کھڑی تھی آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ میرے قدم کاٹھ کی مورت کی طرح زمین میں گڑ گئے۔

"سن بی بی — تیرا دِل ہلاکت میں پڑا ہے۔ شاہ عنایت ہر شام اس کمرے میں آتے ہیں۔ پھر مایوس لوٹ جاتے ہیں۔ تیرا دِل خرابی میں پڑا ہے۔ مگر تیرے ماتھے پر سچے حرف ہیں۔"

بڑے ابا کی لوئی کی بکل برف برساتی سردی میں اتنی گرم اتنی نرم ہوتی تھی۔ ان کے پسلیوں کے پنجرے میں پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا دِل میرے کانوں سے ٹکراتا۔ اور وہ ہچکیوں کے درمیان گاتے چلے جاتے۔ کیا لُطف ملا کرتا ہے جو دیتے ہیں سرور۔ پوچھے یہ کوئی جا کے بیمار بنی سے۔ آیا ہے بلاوا — آیا ہے بلاوا۔

ایک دشمن ہے بی بی تیری۔ تیری جیسی چال ڈھال۔ ناک نقشہ۔ دم دم کی خبر رکھنے والی۔ تیرے ساتھ سایہ کی طرح سایہ لگی ہے۔ اس سے خبردار رہ بچہ۔ وہ تیرے سچے حرف مٹانے کی فکر میں ہے۔ شاہ عنایت اس کی بُو پا کر لوٹ جاتے ہیں۔ مگر اب یہ تیرا مقدر ہے تیرا نام وہاں بڑی سرکار میں لکھا جا چکا ہے۔ جا اگر ہو سکتا ہے تو اپنا ماتھا دھو لے۔ دھو لے — سمندروں کے پانی سے۔

مگر میرے ماتھے پر تو مرجھائی جلد کی لکیروں کے علاوہ کوئی تحریر نہ تھی میں نے سو بار آئینہ دیکھا تھا۔ وہ یقیناً کہیں اور چلا آیا تھا کسی اور گھر میں۔

"یہ نہ سوچ — میں غلط گھر میں آ گیا — نہیں — سچی سرکار سے پیغام لے کر آیا ہوں۔ غلطی نہیں کھاتا۔ غلطی کھانا میرا کام نہیں۔ سُن بندے کے اندر چار جناور ہیں۔ ناگ۔ گیدڑ۔ باگھ کتا۔ ان چاروں سے نمٹ لے بی بی — بس میں تجھے اطلاع دینے آیا تھا۔ پھر تجھ سے بات کروں گا۔"

اس نے اپنا جھولا گلے میں لٹکایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر پلٹ کر غصہ سے بولا۔

"کچھ حکم بھی ہے تیرا — کچھ کہنا بھی چلتا ہے تیرا اپنی بادشاہت پر — جا جا کے سو رہ۔ جا جا میں نے کہہ دیا اپنے ماتھے کے سچے حرفوں پر کالک لگوا لے۔ مگر وہ پھر بھی چمکیں گے۔"

میرے پاس وقت تھوڑی سی لوٹی رقم تھی۔ میں نے آگے بڑھائی۔ اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا اور پھر رقم اپنے جھولے میں انڈیل لی۔ اس وقت میرے تمام جسم میں ارتعاش تھا۔ مجھے معلوم تھا سب مجھ پر ہنسیں گے۔ ابھی شاید وہ نجانے کن کن گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے گا۔ مگر مگر کیا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ میرے دروازے پر بھی آیا؟

اب میں ایک ان دیکھی آنکھ۔ ایک لامحدود بصارت کے حصار میں تھی۔ اور اس وسیع وعریض لامحدود کائنات میں ایک بھنتے نکتے سے بھی کم ہونے پر میں وجود کے حساب کتاب میں تھی۔

میں دبے پاؤں آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میرے ماتھے پر سوکھتی مرجھائی جلد کی جھریاں تھیں۔ ان پر کہیں سنہری حروف نہ تھے۔ مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی اور جب میں ہنسی تو مجھے اپنے دانت ضرورت سے زیادہ بڑے اور عجیب و غریب محسوس ہوتے۔ میں نے خوف زدہ ہو کر دیکھا وہ میرے برابر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا ہی قد — وہی ناک نقشہ۔ میرے سایہ کے ساتھ سایہ۔ ایک دم میرا سانس پھول گیا۔ میرے سینے میں عجب گھٹن اُٹھی۔ ایک اندھی گلا گھونٹ ڈالنے والی گھٹن۔ کاش کاش میرے پاس کوئی ایسا زہریلا ڈنک ہوتا کہ میں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتی۔ وہ جو میرے ماتھے کی خوبصورت تحریر کی دشمن تھی۔ وہ جو ہر مبارک مقام سے مجھ کو

اُٹھ جانے کا اشارہ کرتی تھی۔ وہ جو مجھے اندھی دلدلوں میں کھینچتی تھی۔ وہ جس کی کسی سازش
سے میں ایک ناگفتنی حالت میں پائی گئی۔ اور پھر وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر میرے سامنے آن کھڑی
ہوئی۔ میں نے چاہا کہ میرے ہاتھ زہریلے پنجے ہوں یا میرے پاس بس پھرے نوکیلے دانت ہوں
کہ اس کو ہلاک کر سکوں۔ مگر میرے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ تھا۔

اَب وہ خاموش کھڑی مجھ کو تکتی رہتی۔ ہر دم۔ ہر لمحے۔ اس وقت بھی کہ جب کسی کو بھی
مجھے نہ دیکھنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے سونے کا کمرہ علیحدہ کر لیا۔ اور وہ — جس کو مجھ پر سوال
کرنے کا حق حاصل تھا۔ اِس نے مجھ سے پوچھا تم نے سونے میں علیحدگی کیوں اختیار کی؟ میں بہت
کچھ چاہنے کے باوجود اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں اُسے نہ سمجھا سکی کہ ایک نگران میرے اور
تمہارے اُوپر مقرر ہے۔ حیرت ہے کہ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ مگر تم تو میرے ماتھے کے سنہرے
حروف بھی نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ان حروف کو مٹانے کی فکر میں ہے۔ اور وہ مجھے بتاتی ہے کہ
میری ہر حرکت — میرا ہر فعل۔ میری ہر حالت مضحکہ خیز ہے۔

مگر وہ حسبِ معمول میری بات نہ سمجھا۔ اور ماتھوں کو باہر رہے گا
میں نے اپنی ایک ملنے والی سے پوچھا۔ "باوجود اس کے کہ ہمارے اندر ناگ۔ گیدڑ۔ باگھ
اور کچھ ہوں۔ ہمیں کہیں سے بلوایا جا سکتا ہے —؟ کیا یہ ممکن ہے؟"
اس نے سُنا اور زور سے ہنس دی۔ "تم کسی انسان کی بات کرتی ہو کہ چڑیا گھر کی۔"
میں نے اُسے بتانا چاہا کہ چڑیا گھر تو بڑی مہذب۔ منظم۔ سجی سجائی جگہ ہے۔ میں تو سیاہ دلدلوں
میں اُگے صدیوں پرانے گھنے جنگلوں کی بات کرتی ہوں جس میں ناگوں کے ڈیرے
ہیں۔ مگر اس نے میری بات سنی اَن سنی کر دی۔ کہنے لگی۔
"تمہارا دماغ بہت بگڑ گیا ہے۔ ایک حکیم صاحب ہیں۔ میرے ساتھ ان کے پاس چلنا۔"
مگر میرے پہلو میں وہ کھڑی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ ہنس رہی تھی اور
ہنسنے میں اس کے دانت غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ تیز نوکدار۔ میں نے فوراً اپنی پیشانی
دوپٹے سے ڈھک لی۔ وہاں میرے سنہری حروف کی امانت تھی۔

ایک روز میرے مرد نے کہا۔ "تم لاعلاج ہو — میں تمہاری حماقتوں اور نانسینسز سے
تنگ آچکا ہوں۔ مجھے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ کسی بھٹکتی روح کی نہیں۔"
بھٹکتی روح — شک سے یہ حروف مجھ سے آن لگے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ بھٹکتی روح
ہی ہے۔ وہ مجھے ان دلدل بھرے جنگلوں میں چلنے کا اشارا کرتی ہے۔ میرے جیسے قد۔ ناک نقشہ
کی۔ مجھے اس کو زیر کرنا ہے۔ اور میرے پاس اس کو زیر کرنے۔ شکار کرنے کا کوئی ہتھیار نہیں۔ اور
اس کا زیر ہونا نہایت ضروری ہے۔ نہیں تو میرے ماتھے کی تحریر مٹ جائے گی۔ میرا نام فہرست
سے کٹ جائے گا۔ کیا تم جانتے نہیں! سمجھتے نہیں! شاہ عنایت میرے ڈیرے سے پلٹ پلٹ
جاتے ہیں۔

اور اس کا یہ عالم تھا کہ وہ جب بھی میرے پہلو کے ساتھ پہلو جڑا کے کھڑی ہوتی میری
پسلیاں کٹنے لگتیں۔ کبھی سوتے میں وہ چپکے سے میرے ساتھ آن لیٹتی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوتا
گویا میں چکی کے دو پاٹوں بیچ آئی ہوں۔ وہ مجھ سے ایک عجیب جذب کی طالب تھی۔ وہ جذب جس
کا مفہوم لفظوں کی قید سے باہر تھا۔ ایک ایسی ہی رات جب میں اس کے بوجھ تلے دم لینے کی ناکام
کوشش کر رہی تھی۔ ایک خیال کوندے کی طرح میرے مرتے ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ میں اس کو
اپنے اندر جذب کر لوں۔ کیوں نہ میں اس کو پھر سے اپنے اندر بلا لوں۔ تاکہ اس کا وجود ختم کر
دوں۔ مگر اس کو بلانے کے لیے میرے پاس لفظ نہ تھے۔ اس کو خود میں جذب کرنے کا عمل میرے
علم میں نہ تھا۔ میں تو یہ تک نہ جانتی تھی کہ وہ مجھ سے علیحدہ کیوں کر ہوئی۔

اُس آخری دن پھر دن رہے ایک عجیب مکروہ بین کی دُھن میرے دروازے پر بجی۔ ایسے مہذب علاقوں میں بنجارے سپیرے بھلا کہاں آتے ہیں۔ میں حیران رہ گئی۔ میں نے نوکر کو فوراً دوڑایا کہ اس بین بجانے والے کو فوراً بھگا کر گیٹ بند کر دے۔ مگر نوکر ناکام لوٹ آیا۔

"جی وہ کہتا ہے کہ ایک عجیب چیز دکھلانے کو لایا ہوں۔ نہ دیکھیں گے تو پچھتائیں گے۔ آپ کو بلاتا ہے جی۔"

"مجھے ۔۔ ؟" بین کی آواز کی دہشت سے میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ "نہیں مجھے کچھ نہیں دیکھنا۔ دیکھتے نہیں میں مصروف ہوں۔ جاؤ اس کو کچھ دے دلا آؤ۔" میں نے مٹھی بھر رقم اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

مگر کچھ دیر بعد وہ پھر لوٹ آیا اب بین کی آواز بالکل قریب آگئی تھی۔ جیسے وہ کہیں برآمدے ہی میں بج رہی ہو۔

"نہیں ۔ نہیں ۔" میں نے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ کی چپکے سے دروازہ کھول کر نکل گئی۔ اب دروازہ کھلا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ باہر گیٹ کے قریب وہ گیروے کپڑے پہنے گلے میں ڈھگ برنگے مالے ڈالے پٹارا کھول رہا تھا۔

میرا دل سینے میں اُچھل اُچھل کر باہر آنے لگا۔

ایک عجیب چیز ہے بیگم صاحب۔ کبھی دیکھی نہ سُنی۔ قدرت کے کھیل ہیں جناب۔ اُس نیلی چھتری والے کی نرالی ادا ہے۔ دیکھو ۔ کبھی انسانی نین نقش والا کیڑا دیکھا ہے ؟ دیکھو ذرا اسے غور سے دیکھنا؟"

اس نے بین کو منہ سے لگایا۔ تب اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ آنکھیں گویا پھٹ کر باہر آنے کو تڑپنے لگیں۔ ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے تب پٹارے میں آہستہ سے سرسراہٹ ہوئی پھر ایک سنسناتی شوک کے ساتھ کالا سیاہ پھن دھیرے دھیرے اُٹھ کر سیدھا بین کی تال پر جھومنے لگا۔

میرا سانس بین کے ساتھ ساتھ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس کے سیاہ چمکتے سلیٹی دھاریوں کے پھن پر چمکتی آنکھوں کے آس پاس جانا پہچانا مانوس ناک نقشہ اُبھرا تھا اور وہ آنکھیں مجھ پر جمی تھیں، چمکتی۔ دیکھتی بصارت بھری آنکھیں۔

"بس کرو۔" میں نے چلا کے مٹھی بھر رقم سامنے پھینک دی۔

"بی بی ۔۔ اس کا نر اس سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ بالکل ہی ایسا۔ ایک ناک نقشہ۔ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہ کر سکو گی۔ جیسے ایک ہی کا دوسرا سایہ۔ یہ بے چین۔ دن بھر شوکریں مارتی تھی۔ اس پٹارے میں ڈنگ مار مار کے چھلنی کر دیا اسے۔ اُدھر وہ بے چین۔ باولا ڈگر ڈگر نگر نگر سرسراتا پھرتا تھا۔ میں نے سُنا تو اس کی تلاش میں نکلا۔ جنگلوں جنگلوں گھوما۔ تب کہیں اس کا پتہ پایا۔ یہ ایسی شوکریں مارتا کہ مانو گلے پر چھری کھا یا جناور۔ مگر جب میں نے پٹارے میں ڈالا تو دیکھو۔ اب دیکھو۔ ذرا ۔۔ یہ دو ہیں یا ایک ؟ قدرت کی منشا جیل بند ذرا غور کرو۔" اس نے اب پُرسکون خاموش پٹارا میرے سامنے کر دیا۔ اس میں باہم چپکے۔ ایک دوسرے میں جذب ۔۔ پہچان سے ماورا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں جذب تھے۔

ایک کپکپی میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس سے پہلے میری پسلیاں کٹ کر ایک ثانیے میں پھر باہم جُڑ چکی تھیں۔ کوئی میرے اندر اُتر گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف تیرتے اندھیرے میں بمشکل اپنے گرد دیکھا۔

وہ کہیں نہ تھی۔

میں نے اپنی شکستہ پسلیوں کو تھام لیا۔ میری شفاف پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔

"اسے صاف نہیں کرو۔ اسے خشک نہیں کرو۔ یہ میری پیشانی کی سنہری تحریر ہے۔"

میں نے اسی جانب بڑھتے ہاتھوں کو روک دینا چاہا۔

○

فیض احمد فیض

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں

آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

○

ن۔م راشد

ترے کرم سے خدائی میں یوں تو کیا نہ ملا
مگر جو تو نہ ملا۔ زیست کا مزا نہ ملا

حیاتِ شوق کی یہ گرمیاں کہاں ہوتیں
خدا کا شکر ہمیں نالۂ رسا نہ ملا

ازل سے فطرتِ آزاد ہی تھی آوارہ
یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا

یہ کائنات کسی کا غبارِ راہ سہی
دلیلِ راہ جو بنتا وہ نقشِ پا نہ ملا

یہ دل شہیدِ فریبِ نگاہ ہو نہ سکا
وہ لاکھ ہم سے باندازِ محرمانہ ملا

کنارِ موج میں مرنا تو ہم کو آتا ہے
نشانِ ساحلِ الفت ملا، ملا، نہ ملا

تری تلاش ہی تھی مایۂ بقائے وجود
بلا سے ہم کو سرِ منزلِ بقا نہ ملا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں، کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بیکل بیکل رہتا ہے، ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارا
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سنا اور غش کھایا، اک ذکر پہ آپ اداس ہوئے
وہ عقل کے افلاطون سنے، وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کے پہنچے ہیں، وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

گر عشق کیا ہے تب کیا ہے، کیوں شاد نہیں آباد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے، وہ قیس نہیں فرہاد نہیں
جو جان لیے بن ٹل نہ سکے، یہ ایسی بھی افتاد نہیں
کیا ہجر کا دارو مشکل ہے؟ کیا وصل کے نسخے یاد نہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے، تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں، پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشاؔ بھی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں، کیا انشاؔ کو سمجھانا ہے؟
اس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے، گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑیں یا تکمیل کریں، یہ عشق ہے یا افسانا ہے؟
یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے
یہ باتیں کیسی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

ابنِ انشا

تقابل

معین احسن جذبی

کیا یہی انقلاب ہے، قلب ادھر جگر اُدھر   نالۂ بے قرار ادھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر
لُٹ رہی سیاستِ چمن، رنگ کو بو سے سود ہو   کور ہے نرگسِ وطن، فتنہ ادھر نظر اُدھر
ایک تبسمِ فرنگ، ہر دو افق لہو ترنگ   نعش بدوشِ نالہ رنگ، شام ادھر سحر اُدھر
اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو   آج اُسی عقاب کے بال ادھر ہیں، پر اُدھر
کام و دہن کی تلخیاں کوئی مٹائے اب کہاں   وائے بہ حالِ تشنگاں، زہر ادھر شکر اُدھر
قلتِ صلح کل یہاں، قلتِ صلح کل وہاں   کثرتِ فتنہ گر ادھر، کثرتِ فتنہ گر اُدھر
اہلِ ہنر کے واسطے، خاک بسر کے واسطے   جور و جفا کا گھر ادھر، قہر و بلا کا گھر اُدھر
برگ سے برگ پوچھئے، نخل و شجر سے پوچھئے   کون ہے بارور ادھر، کون ہے باثمر اُدھر
ایک مریضِ نیم جاں، ایک مریضِ خستہ جاں   کون ہے چارہ جو ادھر، کون ہے چارہ گر اُدھر
اہلِ فراق کچھ بتاؤ، اہلِ مذاق کچھ بتاؤ   کون سی شے ہے خوب ادھر، کون سی خوب تر اُدھر

ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح مقدّر ہے
جذب ابھی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

احسان دانش

بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا   کیوں نہ آئے عشق کے لب پر گلہ بھی آئے گا
دار و زنداں کے پرستارو یونہی ہنستے رہو   آئے گا دورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا
تہ نشیں ہو موجہ و طوفاں کا دامن چھوڑ کر   خود بخود کشتی ڈبو کر ناخدا بھی آئے گا
روحِ گلشن خاک کے ذروں میں بسی کر دیں   اک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا
پہلے اپنے دست و بازو پر تو کر لے اعتماد   پھر مرادِ منتہا دن کو خدا بھی آئے گا
آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے   کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا
گھر میں بیٹھے گمرہی کا شکوہ بے جا نہ کر   رہرووں کو جمع کر لے رہنما بھی آئے گا
ہو گئے جرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر   ان کے لب پر نعرۂ زنداں کشا بھی آئے گا
عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی   حسن پر اک وقت احساسِ وفا بھی آئے گا
ہر قدم اب قافلے کو ہے یقینِ گمرہی   جانے کوئی میرِ منزل آشنا بھی آئے گا
جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہوگی مستجاب   جب کوئی بندہ پکارے گا خدا بھی آئے گا

زندگی میں یہ مجازوں کی پرستش تا بکے
ایک دورِ احسان حسبِ مدعا بھی آئے گا

سیف الدین سیف

کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے
اک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پہاڑ سی رات
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

پہلو میں یہ کیسا درد اُٹھا ہے
یہ کونسی راہ کٹ گئی ہے

آپ آئے نہیں تو موت کمبخت
آ آ کے پلٹ پلٹ گئی ہے

اُٹھ اُٹھ کے مریضِ غم نے پوچھا
کیا ہجر کی رات کٹ گئی ہے

پھر سیف ہوائے یادِ رفتہ
ہر غم کی نقاب الٹ گئی ہے

عدم

زباں پر آپ کا نام آ رہا تھا
غمِ ہستی کو آرام آ رہا تھا

خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیا
ہماری سمت پیغام آ رہا تھا

خدا کا شکر تیری زلف بکھری
بڑی گرمی کا ہنگام آ رہا تھا

ستارے سو گئے انگڑائی لے کر
کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا

تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
. تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا

عدم دل کھو کے آسودہ نہیں ہم
بُرا تھا یا بھلا! کام آ رہا تھا!

ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحومِ تمنا پہ دہکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زریں گراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیر
حسن پر سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

محسن زیدی

غزل

ان کی مدد کو ان کے طرفدار آئیں گے
لیکن کہاں سے اپنے مددگار آئیں گے

جنسِ ہنر کا ڈھیر لگا تو دیا مگر
اس جنس کے نہ کوئی خریدار آئیں گے

پھنس کر بھنور میں ڈوب چکی ہوگی اپنی ناؤ
جبتک کہیں سے مانگ کے پتوار آئیں گے

آیا ہے یہ پیام دوکانیں کھلی رہیں
وہ جلد لے کے گرمیٔ بازار آئیں گے

جبتک یہ سر جدا نہیں ہوتا اماں نہیں
اس سر کے ورنہ روز طلب گار آئیں گے

تم میں سے جو بھی چاہے مرا ساتھ چھوڑ دے
دیکھو یہاں سے راستے دشوار آئیں گے

محسن یہ شہر دل ہے بھلایا نہ جائے گا
خوابوں میں بھی یہی درو دیوار آئیں گے

محسن زیدی

غزل

ڈھونڈنے نکلے تو ہوے کے چراغ آندھی میں
خاک دل کا کہیں ملتا ہے سراغ آندھی میں

نہ کہیں سبزہ کوئی ہے نہ کہیں کوئی شجر
پائمال اب کے کچھ ایسا ہوا باغ آندھی میں

بادباں پر نہ بھروسا کرو کشتی والو!
کہیں ملتا ہے ہواؤں کا دماغ آندھی میں

شاخ پر اب کسی طائر کا بسیرا نہ رہا
سبھی گردش میں ہیں بلبل ہو کہ زاغ آندھی میں

قتل کو آتا تھا ہر سال جو آندھی پہ سوار
مل گیا اب کے ہمیں اس کا سراغ آندھی میں

ایک زنجیر تھی پاؤں میں نشیمن کیا تھا
مل گیا روز کی بندش سے فراغ آندھی میں

سرِ میخانہ بہت دیکھے ہیں طوفاں ہم نے
لے کے بیٹھے ہیں کوئی آج ایاغ آندھی میں

کس کو آئے گا یہاں کشتہ چراغوں کا خیال
کون دیکھے گا بھلا دل کے یہ داغ آندھی میں

جس کو بھی چاہے ہوا ساتھ اڑا لے جائے
ٹھہر پایا نہ کوئی کوہ نہ راغ آندھی میں

بادِ صرصر سے ہوا کب نہ تصادم محسن
ہم نے ہر بار جلایا ہے چراغ آندھی میں

فاروق شفق

غزل

یوں تو ہر قیمتی سامان یہاں ملتا ہے
نیند کا قحط ہے اور خواب گراں ملتا ہے
پھول بن جاتا ہے ہر زخم دیا جلتے ہی
دن کا سویا ہوا احساس جواں ملتا ہے
چند قدموں کی رفاقت بھی غنیمت جانو
بھیڑ میں کھو گیا جو شخص کہاں ملتا ہے
ایک دن ہم کو بھی اس بھیڑ میں کھو جانا ہے
اس مسافت میں کہاں کس کا نشاں ملتا ہے
ایک مدت سے مرے شہر نے بدلا نہ لباس
سب کی آنکھوں میں اک اکتایا سماں ملتا ہے
میرے ہی نام کی تختی ہے ہر اک در پہ شفق
ایک جیسا مجھے ہر ایک مکاں ملتا ہے

فاروق شفق

غزل

ہم پہ بھی اپنی بخشش کبھی عام کر
ایک دن اس علاقے میں بھی شام کر
رونق شام میں تیرا حصہ بھی ہے
دن گذارا یہاں تو یہیں شام کر
اجلی پوشاک میں بدلیوں کو چھپا
لشکر غم کی کوشش کو ناکام کر
پھول پر آنسوؤں کی نہ شبنم چھڑک
نیک لوگوں کو ایسے نہ بدنام کر
شام پوشاک بدلے ہے در پہ کھڑی
روشنی سے منور در و بام کر



شارعِ جاوید

(تناظر پبلی کیشنز)

کالی داس گپتا رضا کی دیگر مطبوعات

۱:- شعلۂ خاموش
۲:- شاخِ گل
۳:- متعلقاتِ غالب
۴:- دعائے صباح
۵:- دی سائیلنٹ فلیم
۶:- منشوراتِ جوش ملسیانی
۷:- شورشِ پنہاں
۸:- اُجالے
۹:- ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
۱۰:- مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا
۱۱:- چکبست اور باقیاتِ چکبست
۱۲:- شعورِ غم
۱۳:- سہو و سُراغ
۱۴:- انتخابِ آتش و غالب از برج نرائن چکبست
۱۵:- کُلیاتِ چکبست (نظم)
۱۶:- غالبیات - چند عنوانات
۱۷:- مقالاتِ چکبست

ملنے کے پتے

۱:- تناظر پبلی کیشنز
۲:- مکتبہ جامعہ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی
۳:- اُردو گھر راؤز ایونیو - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۴:- ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ - ۱۰۷، جولی بھون نمبر ۱،
مرین لائن چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰
۵:- موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Dear friend,

Just as it is good to produce and sell quality products, it is equally good to advertise in 'Tanazur' which is read by the whole world of Urdu knowing public in India and abroad. We seek your patronage and invite you to send us your advertisements.

Rates ·

Full Back Cover	Rs. 1200/-
Inside Cover	Rs. 1000/-
Full Page	Rs. 800/-
Half Page	Rs. 500/-

Mechanical Data

Size (Trimmed)	22 × 14.5 cms.
No. of cols,	1 (One)
Width of col.	10.5 cms.
Length of col.	19 cms.
Printed area (Full page)	19 × 10.5 cms.

While each of our collaborators gets his/her complimentary copy, we shall be glad to reserve his/her additional requirement of copies should he/ she lets us know in advance. He/She will be entitled to 25 percent special discount on each copy, which will be sent by Registered post at the cost of Management.

To Agents/Book Seller

The Quarterly 'Tanazur' is printed on good quality white paper by photo off set process.

Orders for less than 5 copies are not accepted unless money is sent in advance. On orders of 5 copies 20% 6-10 copies 25% 11-20 copies 30% and above 20 copies 40% discount is allowed. Copies are sent by V.P.P. A further discount of 5% is allowed if money is received in advance by Demand Draft/Money Order (in favour of Tanazur Publications. Delhi) and copies will be sent by Registered post at the expense of the Management.

24-D,
Mayur Vihar Pocket III.
Delhi-110091

(Mukti Verma)
Manager
TANAZUR PUBLICATIONS

تقسیم کار

۱:- تناظر پبلی کیشنز
۲:- مکتبہ جامعہ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی
۳:- اُردو گھر راؤز ایونیو- نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۴:- ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ- ۱۰۷، جولی بھون نمبر ۱،
مرین لائن چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰
۵:- موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج- نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا

کتابیں ہی کتابیں

جی ہاں نیشنل بک ٹرسٹ نے انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں اہم اور معلوماتی موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ ادب کی اشاعت بھی کی ہے۔ ٹرسٹ کی مطبوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ٹرسٹ کے اشاعتی پروگرام میں بچوں کے ادب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یقیناً ہر قاری کے لیے ٹرسٹ کی مطبوعات میں اس کی پسند کی کتاب مل سکتی ہے۔ اردو میں اب تک جو کتابیں شائع کی گئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

			قیمت
عصری ملیالم کہانیاں	مرتبہ: ایم مکندن	مترجم: عبدالحق	۱۸/۵۰
درد کے رشتے	از: میرجی انارائے	،، بلراج ورما	۲۰/۰۰
جے کانتن کی کہانیاں	از: جے کانتن	،، زکی انور	۱۱/۵۰
سزا	از: کاہوچرن مہانتی	،، پریم متّل	۱۲/۷۵
اُردو افسانے	مرتبہ: رضیہ سجاد ظہیر	(نیا ایڈیشن)	۱۱/۰۰
جگدیش چندر بوس	از: ایس این بسو	مترجم مجتبیٰ حسین	۶/۵۰

بچوں کے لیے

			قیمت
دس کہانیاں	مرتبہ: سراج انور	———	۴/۰۰
یہ دنیا پیاری پیاری	از: جینتی منوکرن	اردو تحریر سعدیہ رحمٰن	۲/۵۰
ایشیا کی لوک کہانیاں	———	مترجم: سیّد احسان	۱۲/۰۰
گوتم بدھ	از: لیلا جارج	" : سیّد ضمیر حسن	۲/۵۰
ٹوٹا ہوا پَر اور دوسری ایشیائی کہانیاں	از: بیلندر دھنوا	" : سراج انور	۲/۵۰
عید گاہ	از: پریم چند	———	۲/۵۰
تلی تتلی	از: رمیش بخشی	" : تعظیم احمد	۲/۵۰
قوسِ قزح	از: ادشا جوشی	" : رفعت سروش	۲/۵۰
جب ندی بولی تھی	از: کملا تائر	" : سیّدی اعجاز	۲/۵۰
سب سے پیارا کون	از: رادھا ایم کمبھاد کونے	" : عابدہ بیگم	۲/۵۰
بس کی سیر	از: ولی کن نن	" : ایس اے رحمٰن	۲/۵۰

دیگر مطبوعات

آزادی کی چھاؤں میں	از: بیگم انیس قدوائی	———	۱۳/۵۰
اردو طباعت و اشاعت کے مسائل	مرتبہ: انور کمال حسینی	———	۷/۵۰
ڈاکٹر ذاکر حسین (ایک سوانح)	از: محمد مجیب	مترجم: محمد طیب	۱۰/۰۰
گرو نانک بانی	مرتبہ: بھائی جودھ سنگھ	" : مخمور جالندھری	۹/۵۰

نیشنل بُک ٹرسٹ کی مطبوعات ملک بھر میں اردو کے تمام اہم کتب فروشوں، پبلی کیشنز ڈویژن کے اسٹالوں اور این بی ٹی بُک شاپس سے مل سکتی ہیں۔

فہرست کتب اور مزید معلومات کے لیے رابطہ قائم کریں۔

ڈپٹی ڈائریکٹر (سیلز) **نیشنل بُک ٹرسٹ،** انڈیا۔ ۵۔اے گرین پارک نئی دہلی
پن کوڈ۔ ۱۱۰۰۱۶

تناظر تخلیقی ادب کی دستاویز

Statement about ownership and other particulars about

TANAZUR

FORM IV

(As required by Rule 8 of Press Registrar's Act)

Place of Publication		New Delhi
Periodicity of Publication	Quarterly	
Printer's Name	Balraj Verma	
Nationality	Indian	
Address		D-24, Mayur Vihar, New Delhi-110 091
Publisher's Name	Balraj Verma	
Nationality	Indian	
Address		
Editor's Name	Balraj Verma	
Nationality	Indian	
Address		D-24, Mayur Vihar, New Delhi-110 091
Owner's Name	Balraj Verma:	
Address		

I, Balraj Verma hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Balraj Verma
Publisher.